ڈائرکٹوریٹ آف ڈِسٹینس ایجوکیشن، یونیورسٹی آف جموّں، جموّں

کلاس: ایم۔اے

مضمون : اُردو

کورس نمبر: 101 (اردو غزل)

سمسٹر: اول

اکائی: 1-15

پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک

کورس کوآرڈی نیٹر، ایم۔اے۔اردو، ڈی۔ڈی۔ای

صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

ڈاکٹر لیاقت علی

انچارج ٹیچر، اردو

ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

(c) جُملہ حقوق محفوظ ہیں۔اِس کتاب کا کوئی حِصّہ کسی شکل میں جموّں یونیورسٹی کی تحریری اِجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

زیر اہتمام: نظامت فاصلاتی تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

مضمون نگار: پروفیسر سکھ چین سنگھ

(شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں)

اڈیٹنگ: ڈاکٹر لیاقت علی

انچارج ٹیچر، اردو، ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

SYLLABUS FOR NON-CBCS

Examination to be held in December 2019,2020 and 2021

TITLE OF THE COURSE: STUDY OF URDU GHAZAL

CREDITS: 4 MAXIMUM MARKS: 100

A. SEMESTER EXAM: 80

B. INTERNAL ASSESSMENT: 20

Objectives:

The course envisages to enable the students to have a full programme of the rise and development of Urdu Ghazal. Since it is a gigantic genre and has in its fold a rich heirachy of literacy giants, therefore, efforts shall be made to acquaint the students with whole process of its emanation and development. The unit-wise details of the syllabus as under:

Unit-I غزلیات (ولؔی، دردؔ، میرؔ، آتشؔ، غالبؔ)

شاہ محمد اللہ ولؔی دکنی:

۱۔ کوچۂ یار عین کاسی ہے

۲۔ کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ

۳۔ جسے عشق کا تیر کاری لگے

۴۔ شغل بہتر ہے عشق بازی کا

۵۔ طالب نہیں مہر و مشتری کا

۶۔ مُفلسی سب بہار کھوتی ہے

۷۔ دِل کو گر مرتبہ ہو درپن کا

۸۔ دیکھنا ہر صُبح تجھ رُخسار کا

۹۔ پی کے ہوتے نہ کر تو مہ کی ثنا

۱۰۔ عیاں ہے ہر طرف عالم میں حُسنِ بے حجاب اُس کا

سید خواجہ میر دردؔ

۱۔ ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے

۲۔ ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جُستجُو کریں

۳۔ جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا

۴۔ تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے

۵۔ اُس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں

۶۔ آنکھوں کی راہ ہر دم اب خوں ہی رواں ہے

۷۔ گلیم بخت سیاہ سایہ دار رکھتے ہیں

۸۔ ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا

۹۔ مجھے در سے تو اپنے ٹالے ہے، یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں؟

میر محمد تقی میرؔ

۱۔ ہستی اپنی حباب کی سی ہے

۲۔ اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا

۳۔ جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا

۴۔ غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا

۵۔ قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دِل

۶۔ عشق میں، نے خوف وخطر چاہیے

۷۔ جب نام تیرا لیجئے، تب چشم بھر آوے

۸۔ اُس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا

۹۔ پتّا پتّا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

خواجہ حیدر علی آتشؔ

۱۔ سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا؟

۲۔ تصور سے کسی کے میں نے کی ہے گُفتگُو برسوں

۳۔ مگر اُس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے

۴۔ یہ آرزو تھی، تجھے گُل کے رُوبرو کرتے

۵۔ گدا نواز، کوئی شہہ سوار راہ میں ہے

۶۔ وحشی تھے بوئے گُل کی طرح سے جہاں میں ہم

۷۔ حباب آسا ئیں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا

۸۔ فریبِ حُسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا

۹۔ سرِ شمع ساں کٹایئے پر دم نہ ماریئے

اسد اللہ خان غالبؔ

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

۲۔ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تُم کہ ''تُو کیا ہے؟''

۳۔ آہ کو چاہیے اِک عُمر اثر ہونے تک

۴۔ ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

۵۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

۶۔ دِل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں

۷۔ منظور تھی یہ شکل تجلی کو نُور کی

۸۔ بس کہ دُشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا

۹۔ ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا

۱۰۔ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

UNIT-II غزلیات (مولانا فضل الحسن حسرتؔ، رگھوپتی سہائے فراقؔ: شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، محمد مومن خان مومن)

مولانا فضل الحسن حسرتؔ

۱۔ دِل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا

۲۔ بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں

۳۔ حسنِ بے پروا کو خود بین وخود آرا کر دیا

۴۔ نِگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے

۵۔ دِل آرزوئے شوق کا اِظہار نہ کر دے

۶۔ سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں

۷۔ یاد کر وہ دِن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا

۸۔ اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم؟

۹۔ روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام

۱۰۔ شبِ فرقت میں یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی

رگھوپتی سہائے فراقؔ:

۱۔ نِگاہ ناز نے پردے اُٹھائے ہیں کیا کیا

۲۔ آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا

۳۔ کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی

۴۔ سر میں سودا بھی نہیں دِل میں تمنا بھی نہیں

۵۔ دِل کشتہ فریبِ تمنا ہے آج بھی

۶۔ ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے

۷۔ جن کو اِتنا یاد کرو ہو چلتے پھرتے سائے تھے

۸۔ آنکھوں میں جو بات ہوگئی ہے

۹۔ ہیں نغمہ ونشاط بھی، فریاد وآہ بھی

۱۰۔ یہ کہہ کے کل کوئی بے اِختیار روتا تھا

شیخ محمد ابراہیم ذوق

۱۔ لکھیے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا

۲۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا

۳۔ اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا

۴۔ نام یوں پستی میں بالاتر ہمارا ہو گیا

۵۔ نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا

۶۔ کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا

۷۔ ہنگامہ گرم ہستی ناپائیدار کا

۸۔ شکر پردے میں ہی اُس بُت کو حیا نے رکھا

۹۔ مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا

۱۰۔ ہفتاد و دو فریق حسد کے عدو سے ہیں

محمد مومن خان مومنؔ

۱۔ اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا

۲۔ وعدۂ وصلت سے دِل ہو شاد کیا

۳۔ غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا

۴۔ ڈر تو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

۵۔ اظہار شوق شکوہ اثر اُس سے تھا عبث

۶۔ ٹھانی تھی دِل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم

۷۔ خورنج رشک غیر کی بھی ہم کو ہو گئی

۸۔ وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۹۔ اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ

Unit-Iii

For critical questions on Ghazal the following aspects shall be kept in view:

1. Defination of Ghazal: Its thematic and formative characteristics.

2. Impact of persian tradition of Ghazal on Urdu Ghazal.

3. Development of Urdu Ghazal.

Unit-IV

1.	Daccani Poets	2.	Poets of North India
3.	Medieval Poets	4.	Modern Poets
5.	Modern Ghazal	6.	Critical questions on the poets prescribed.

☆☆☆☆☆☆☆

فہرست

اکائی نمبر1۔ وؔلی دکنی کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی تشریح ---------------------- 01

اکائی نمبر2۔ دردؔ کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی تشریح ---------------------- 32

اکائی نمبر3۔ میرؔ کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی تشریح ---------------------- 53

اکائی نمبر4۔ آتشؔ کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی تشریح ---------------------- 78

اکائی نمبر5۔ غالبؔ کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی تشریح ---------------------- 102

اکائی نمبر6۔ حسرتؔ کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی تشریح ---------------------- 132

اکائی نمبر7۔ فراقؔ کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی تشریح ---------------------- 164

اکائی نمبر8۔ مومنؔ کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی تشریح ---------------------- 194

اکائی نمبر9۔ ذوقؔ کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی تشریح ---------------------- 221

اکائی نمبر10۔ غزل کی تعریف اور اس کی ہیئتی و موضوعاتی خصوصیات ---------------------- 253

اکائی نمبر11۔ اُردو غزل پر فارسی غزلیہ روایت کے اثرات ---------------------- 266

اکائی نمبر12۔ غزل کا آغاز وارتقا ---------------------- 281

اکائی نمبر13۔ شمالی ہندوستان میں اُردو غزل کا آغاز وارتقاء ---------------------- 292

اکائی نمبر14۔ دورِ متوسطین میں اُردو شاعر ---------------------- 306

اکائی نمبر15۔ جدید شاعر اور اُردو غزل ---------------------- 313

اسائنمنٹ سوالات ---------------------- 320

اکائی نمبر1

ولی کی غزلیات اور شرح

ساخت:

1.1 سبق کا تعارف

1.2 سبق کا ہدف

1.3 ولی دکنی کی حیات اور غزل گوئی

1.4 غزل نمبر1

1.4.1 فرہنگ

1.4.2 غزل کی تشریح

1.5 غزل نمبر2

1.5.1 فرہنگ

1.5.2 غزل کی تشریح

1.6 غزل نمبر3

1.6.1 فرہنگ

1.6.2 غزل کی تشریح

1.7 غزل نمبر4

1.7.1 فرہنگ

1.7.2 غزل کی تشریح

1.8 غزل نمبر5
1.8.1 فرہنگ
1.8.2 غزل کی تشریح
1.9 غزل نمبر6
1.9.1 فرہنگ
1.9.2 غزل کی تشریح
1.10 غزل نمبر7
1.10.1 فرہنگ
1.10.2 غزل کی تشریح
1.11 غزل نمبر8
1.11.1 فرہنگ
1.11.2 غزل کی تشریح
1.12 غزل نمبر9
1.12.1 فرہنگ
1.12.2 غزل کی تشریح
1.13 غزل نمبر10
1.13.1 فرہنگ
1.13.2 غزل کی تشریح
1.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات
1.15 کتابیات

1.1 سبق کا تعارف

اردو شاعری میں اولیت کا تاج تو امیر خسرو کے سر پر موجود ہے لیکن اس کے باوجود اردو شاعری کا باوا آدم وؔلی کو کہا گیا۔محمد حسین آزؔاد کے مطابق ''نظم اردو کی نسل کا باوا آدم جب ملکِ عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا''۔ وؔلی سے پہلے اردو شاعری قریب تین سو سال کا سفر طے کر چکی تھی لیکن اس کو وہ عروج میسر نہ آسکا جو وؔلی کے بعد ملا۔ بقول وحید قریشی ''ولی سے پہلے کم از کم غزل کے دو ادوار گزر چکے تھے۔ان ادوار کے شعرا کے کچھ نمونے بھی ملتے ہیں ۔ پہلا دور حضرت امیر خسؔرو سے شروع ہوتا ہے جس میں دس شعرا ہیں۔ دوسرا دور قلی قطب شاہ سے شروع ہو کر میراں ہاشمی تک چودہ شاعروں پر مشتمل ہے۔اس کے بعد وؔلی کے معاصرین کا زمانہ ہے۔'' چنانچہ ولی دکنی کو اردو شاعری میں وہی مقام حاصل ہے جو انگریزی شاعری میں چاؔسر اور فارسی شاعری میں رودکؔی کو حاصل ہے۔

وؔلی نے نہ صرف دکنی روایت کی پاسداری کی بلکہ امیر خسؔرو کی قائم کردہ ریختہ کی بنیاد پر شعر و سخن کی وہ عالیشان عمارت تیار کی کہ جس نے کلاسیکی اردو شاعری کی بنیاد کو مستحکم کیا اور اس میں آنے والے عہد کے سارے امکانات سمٹ گئے۔ دوسرے الفاظ میں وؔلی کا کمال یہ ہے انہوں نے اردو غزل کے ساز پر جو نغمے چھیڑے، دنیائے غزل میں ان کی صدا باز گشت آج تک سنائی دی جا رہی ہے۔

1.2 سبق کا ہدف

اس سبق کا مقصد طلبا کو وؔلی دکنی کی غزلیات اور وؔلی دکنی کی سوانح حیات سے روشناس کروانا ہے۔ چونکہ یہ حقیقت ہے کہ وؔلی دکنی کی اردو شاعری کے شمال میں پہنچ جانے کے بعد ہی اردو شاعری کے چرچے عام ہوئے۔ وؔلی دکنی کی شاعری میں بیشتر الفاظ دکنی زبان کے ہیں۔اس سبق میں ایسے مشکل الفاظ کی فرہنگ پیش کی گئی ہے تا کہ طلبا کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

1.3 وَلیؔ دکنی کی حیات اور غزل گوئی

شاہ محمد اللہ وَلیؔ، جو وَلیؔ دکنی اور وَلیؔ گجراتی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، اورنگ آباد (دکن) کے رہنے والے تھے۔ وَلیؔ ۱۰۷۹ھ بمطابق ۱۶۶۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۰۷ء میں وفات پا گئے۔ وَلیؔ کے نام سے متعلق خاصے اِختلافات پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک وَلیؔ کا اصل نام شمس الدین تھا اور وہ وَلیؔ تخلص کرتے تھے۔ بعض ولی محمّد نام بتاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں شمس الدین لقب اور وَلیؔ تخلص تھا۔ میر حسن دہلوی اور مرزا لطف کے مطابق شاہ ولی اللہ نام تھا اور وَلیؔ تخلص تھا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ اُن کا نام شاہ وَلیؔ اللہ ہی تھا۔ جمیل جالبی نے بھی ''تاریخِ ادب اُردو'' میں کافی دلائل سے یہی ثابت کیا ہے کہ اُن کا نام شاہ وَلیؔ اللہ ہی تھا۔ نام سے متعلق اگرچہ اختلافات پائے جاتے ہیں تاہم اُن کے تخلص کے بارے میں سب مُتفق ہیں کہ اُن کا تخلص وَلیؔ ہی تھا۔

وَلیؔ کے خاندان کا سِلسِلہ شیوخ قادریہ سے ملتا ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ دکنی نہیں بلکہ گجراتی تھے اور اِس کی بُنیاد اہلِ گجرات کے پاس وہ تمسک ہے جس پر وَلیؔ گجراتی لکھا ہے۔ اِس طرح اہلِ گجرات اُنھیں وَلیؔ گجراتی اور اہلِ دکن اُنھیں وَلیؔ دکنی ثابت کرنے کے لیے مختلف دلائل دیتے ہیں۔ دراصل وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ دُرست ہیں۔ کیوں کہ وَلیؔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے اور لگ بھگ وہیں تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ لہٰذا اِس ناطے وہ وَلیؔ دکنی ہوئے۔ مگر بعد ازاں وہ احمد آباد چلے گئے جو اُس زمانے میں علم و فن کا مرکز تھا اور وہیں شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسے میں داخل ہوئے اور اُنہیں کے مُرید بھی ہو گئے۔ سو اِس ناطے وہ وَلیؔ گجراتی ہوئے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ کچھ عرصے بعد وہ اپنے وطن واپس لوٹ آئے اور یہیں آ کر شعر و شاعری بھی شروع کی۔ اپنے زمانے کے مشہور اُستاد وَلیؔ کو محمّد حسین آزادؔ نے ''آبِ حیات'' میں اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان اور شمالی ہندوستان کا پہلا اُردو شاعر کہا ہے۔ ایک زمانے تک اِس بات کو سچ بھی مانا جاتا رہا۔ مگر جدید تحقیق نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ محمّد قلی قطب شاہ کی کلیات مل جانے کے بعد، جو وَلیؔ سے تقریباً سو سال پہلے وفات پا چکے تھے، یہ بات غلط ثابت ہو گئی ہے۔

وَلی دکنی کو سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ اُن کے اِس شوق نے اُردؤ شاعری کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ کیوں کہ اِس شوق کی وجہ سے اُن کی شاعری صرف دکن تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ شمالی ہند بھی اِس سے فیض یاب ہوا۔ محمد حسین آزاؔد نے جو وَلی کو شمالی ہند میں اُردؤ شاعری کا بابائے آدم کہا ہے وہ بھی اسی سبب سے کہا ہے۔ اُن کے خیال میں وَلی پہلی بار محمّد شاہ کے زمانے میں دلّی آئے تھے اور اِس کے ثبوت میں وہ وَلی کا ہی ایک شعر پیش کرتے ہیں:

دِل وَلی کا لے لیا دلّی نے چھین

جا کہو کوئی محمّد شاہ سوں

یہاں آزاؔد سے یقیناً چوک ہوئی ہے۔ نہ ہی وَلی محمّد شاہ کے زمانے میں دلّی آئے اور نہ ہی یہ شعر اُن کا ہے۔ یہ شعر دراصل گدؔا کا ہے اور یوں ہے:

دِل گدؔا کا لے لیا دلّی نے چھین

جا کہو کوئی محمّد شاہ سؤں

اب رہی بات یہ کہ وَلی شمالی ہند میں اُردؤ شاعری کے بابائے آدم ہیں سو وہ بھی درُست نہیں ہے کیوں کہ اُردؤ زبان میں وَلی کی آمدِ دہلی سے پہلے بھی شاعری کی جاتی تھی۔ مگر آزاؔد کا کہنا ایک طرح سے درُست بھی ہے۔ اور وہ یوں کہ وَلی کی آمد سے پہلے شمالی ہند میں با قاعدہ اُردؤ شاعری کی کوئی روایت نہیں تھی۔ شعراء محض مُنہ کا مزہ بدلنے کے لیے اُردو میں ایک آدھ شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ ورنہ وہ اِس زبان کو اِس لائق نہیں سمجھتے تھے کہ اِس میں شاعری کی جائے۔ وَلی کے دیوان کو دیکھنے کے بعد ہی اُنھیں اِس حقیقت کا احساس ہوا کہ ریختہ میں بھی سنجیدگی سے شاعری کی جا سکتی ہے۔ اور اِس طرح سے یہاں اُردؤ شاعری کا با قاعدہ آغاز وَلی کی آمد کے بعد ہی سے ہوتا ہے۔ وَلی نے بھی دلّی سے بہت کچھ پایا۔ کہتے ہیں کہ وہ جب پہلی بار دلّی آئے تو شاہ گلشن اللہ سے ملے۔ اُنھیں اپنا کلام دِکھایا تو اُنھوں نے صلاح دی کہ فارسی میں جو بے شمار مضامین پڑے ہیں اُنھیں کام میں لاؤ۔ اُن کی بات وَلی کے دل میں اُتر گئی۔ زبانِ دلّی سے بہت زیادہ متاثر بھی ہوئے تھے۔ لہٰذا دکنی زبان و محاورات کو کم کر کے فارسی مضامین اور دلّی کی زبان و محاورات کو اپنے کلام

میں جگہ دینی شروع کر دی۔ اِدھر دہلی کے شعراء بھی وؔلی کے کلام سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اُنھوں نے بھی اپنا طرزِ تخیل اور طرزِ کلام اِسی سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ وؔلی کی آمدِ دہلی سے جہاں وؔلی کے کلام میں نکھار پیدا ہوا وہاں دہلی کی بزمِ سخن میں تازگی پیدا ہوگئی۔

کلام کی خصوصیات:۔

وؔلی محض تاریخی اہمیت ہی کے حامل نہیں ہیں بلکہ اُن کی شاعرانہ عظمت بھی جواب نہیں رکھتی۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ ہر صنفِ سُخن میں قادر تھے جیسے شاعری اُن کے خاندان میں بہت پُرانے زمانے سے چلی آ رہی ہو۔ اُنھوں نے غزل، قصیدہ، رُباعی، مُستزاد، قطعہ، ترجیع بند اور مثنوی کے علاوہ کچھ ایسی اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے جو آج کل رائج نہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وؔلی کو غزل نے اور غزل کو وؔلی نے جو شہرت عطا کی وہ دُوسری اصناف کے حصّے میں نہیں آ سکی۔ اُنھوں نے اُردو غزل کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا اور اُسے ایک نیا بانکپن، نیا حُسن اور وقار عطا کیا۔ اِس کے علاوہ وؔلی کا ایک اور ادبی کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے شمال اور جنوب کو شعری روایات کے رشتے میں منسلک کر دیا۔ اُنھوں نے پہلی بار اُردو کو جغرافیائی حدود سے آزاد کر کے اسے سارے ہندوستان میں ادبی ابلاغ و ترسیل کے ایک موثر وسیلے کی حیثیت سے روشناس کروایا۔ اُسے ملک گیر اہمیت کا حامل بنا دیا۔ شمالی ہند میں ریختہ کی ساکھ کو بنایا۔ وؔلی نے اپنے ہمعصر تمام شعراء کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا۔ غزل پر اُنھوں نے اتنے گہرے نقش مرتب کیے ہیں کہ اُن کی حیثیت تاریخی ہوگئی ہے۔ وؔلی کا کلام بہت مقبُول ہوا۔ اُن کے کلام کی اثر پذیری اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے کلام میں ہندی الفاظ کی گھلاوٹ اور رس بھی موجود تھا اور فارسی کی رنگینی و شیرینی بھی۔ یہی نہیں بلکہ وؔلی ہندی شاعری کی روایات سے بھی کافی متاثر تھے۔ ہندی شاعری کی روایت ہے کہ اظہارِ محبت عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ وؔلی نے اپنی ایک غزل میں عورت ہی سے اظہارِ محبت کروایا۔ غزل کا مطلع ہے :

پرت کنٹھا کی جن نے لی اُسے گھر بار کرنا کیا
ہوئی جوگن جو کئی پی کی اُسے سنسار کرنا کیا

وؔلی نے اپنے دور کے تمام ادبی وفکری معیاروں اور روایات کو اپنی شاعری میں سمو کر بیان کی لذت اور زبان کی تعمیر کا اعجاز دِکھایا۔ وؔلی کے طرزِ جدید نے شمالی ہند کے سُخن وروں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اُس عہد کے بیشتر شعراء نے وؔلی کا اتباع کیا اور غزل گوئی کا سلیقہ سیکھا۔

وؔلی نے اسالیب اور اظہار کے بہت سے پیکروں کو فارسی سے مستعار لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وؔلی نے اظہار کے ایسے وسیلوں اور الفاظ ومحاورات کا انتخاب کیا جو مروّجہ زبان سے بخوبی ہم آمیز ہو سکتے تھے۔ وؔلی نے کئی جگہ ہندی، فارسی یا عربی کے الفاظ کے امتزاج سے ترکیبیں وضع کیں جس سے کلام کی دِل کشی میں بے حد اضافہ ہوا۔ وؔلی کی زبان صاف اور شیریں ہے۔ گو غزلوں میں خارجی پہلو نُمایاں ہے مگر برجستگی اور کیف کی وجہ سے بیان میں مزہ موجود ہے۔ اُن کے کلام میں دِل کے سوز وگداز کا اثر ملتا ہے۔ اور زبان سادہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مُفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

....

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر
مشتاق نہیں سکندری کا

وؔلی کی تشبیہات اور استعارات میں جدّت موجود ہے۔ وؔلی کے قصیدے بھی خوب ہیں۔ قصیدے میں جتنی بھی خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب وؔلی کے قصائد میں موجود ہیں۔ شوکتِ الفاظ، زور، روانی اور تخیل کی بُلندی وغیرہ سب موجود ہیں۔ اور طرّہ یہ ہے کہ مُشکل زمین کے ہوتے ہوئے بھی روانی میں فرق نہیں آنے دیا۔

وؔلی نے اپنی غزلوں میں سیدھی سادھی باتیں پیش کیں ہیں جن میں تغزل کے ساتھ ساتھ بعض جگہ اخلاقی مضامین بھی موجود ہیں۔مضمون آفرینی میں تخئیل کی گہرائی قابلِ داد ہے۔

پھیکی لگے اُس کوں شانِ دولت
چاکھا جو مزہ قلندری کا
تو سر سوں قدم تلک جھلک میں
گویاہے قصیدہ انورؔی کا

....

ہر زباں پر ہے مثلِ شانہ مُدام
ذکر تجھ زُلف کی دراز ی کا

....

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

وؔلی کی عظمت کا اصل راز یہ ہے کہ اُنھوں نے ایک ایسا رنگِ شاعری ایجاد کیا جس پر ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فضا کی خوشبو بھی موجود ہے۔جس میں حقائق ومعرفت کے مضامین، روحانیت،تصّوف اور خیالات و جذبات کا علو ہے تو دُوسری طرف اس کا رشتہ اس سرِ زمین سے جُڑا ہوا ہے اور اس میں زندگی کے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔اُن کی شاعری میں ہمیں ہندایرانی کلچر اور روایات کا وہی دِل کش امتزاج ملتا ہے جس نے ہندوستان میں اُردو،اور تاج محل کو جنم دیا۔وؔلی نے اپنے تصّوفانہ ذہن کی مدد سے اپنے مشاہدات اور تجربات کو اپنے شعری عمل کا حصّہ بنایا۔اُن میں جو فضا اور پیکر ملتے ہیں وہ بڑے جانے پہچانے اور حقیقت سے قریب ہیں۔اُن میں موسیقت ہے،تازگی ہے۔اُن

کے اشعار میں نکھار ہے، خارجیت اور داخلیت کا حسین و دِل کش میل ہے اوران دونوں کے امتزاج سے ان کے یہاں وہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے جسے حسیاتی شاعری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ حسیاتی شاعری (Sensous Poetry) میں ایسے الفاظ، علامتیں استعمال ہوتی ہیں جو براہِ راست ہمارے محسوسات یا احساس کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کی غزل میں استعمال شدہ الفاظ خالصتاً شعری الفاظ ہیں۔ شعری زبان اور غیر شعری زبان میں جو فرق ہے ولؔی اس سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ ان کے سامنے جو شاعری کے نمونے تھے ان کی زبان اتنی شعریت کی حامل نہیں تھی جو شعریت ولی دکنی کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ولؔی نے زبان کے سانچوں کو خود مرتب کرتے ہوئے اس میں مقامی اور فارسی الفاظ کی چاشنی لائی۔ یوں ان کی زبان میں سلاست و شگفتگی اور دل کشی کو عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ ولؔی دکنی کی ان تمام خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ولؔی حقیقی معنوں میں اردو غزل کا باوا آدم بھی کہلانے کے حق دار ہیں اور صحیح معنوں میں کلاسیکل روایت کا بھی اولین شاعر ہونے کا تاج انھی کے سر سجتا ہے۔

غزلیات کی تشریح

1.4 غزل نمبر 1

کوچۂ یار عین کاسی ہے — جوگیِ دِل وہاں کا باسی ہے
پی کے بیراگ کی اُداسی سوں — دِل پہ میرے سدا اُداسی ہے
اے صنم! تجھ جبیں اُپر یہ خال — ہندوے ہر دوار باسی ہے
زُلف تیری ہے موج جمنا کی — تِل نزک اُس کے جیوں سناسی ہے
یہ سیہ زُلف تجھ زنخداں پر — ناگنی جیوں کنوے پہ پیاسی ہے
جِس کی گفتار میں نہیں ہے مزا — سُخن اُس کا طعام باسی ہے
اے ولی! جو لباس تن پہ رکھا — عاشقاں کے نزک لباسی ہے

1.4.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
کوچہ	گلی، بستی، محلّہ	باسی	باشندہ، رہنے والا
بیراگ	فقیر، جوگی، تارک الدنیا	جبیں	ماتھا، پیشانی
نزک	قریب، پاس	زنخداں	ٹھوڑی

1.4.2 غزل نمبر(۱) کی تشریح

پہلاشعر:۔

تشریح طلب شعر نصاب میں شامل وؔلی دکنی کی غزل سے لیا گیا ہے۔محبوب کا کُوچہ عاشق کے لیے کسی تیرتھ استھان سے کم نہیں ہوتا ہے۔ لہذا شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کا کوچہ کاشی کی مانند ہے اور میرا دِل وہاں کا رہنے والا ہے۔کاشی ہندؤں کا ایک تیرتھ استھان ہے۔شاعر نے محبوب کے کُوچے کو کاشی سے تشبیہہ دی ہے۔

دُوسرا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی جُدائی کی مایوسی کے سبب سے میرے دِل پر ہمیشہ اُداسی چھائی رہتی ہے۔محبوب کی جدائی میں پل پل بیتابی اور اداسی میں گزرتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے محبوب تمھارے ماتھے پر جو یہ سیاہ تِل ہے یہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی ہندو ہر دوار پر باس کر رہا ہو۔محبوب کی پیشانی کو شاعر نے ہر دوار اور تِل کو ہندو سے تشبیہہ دی ہے اور وہ اِس لیے کہ ہندو کے معنی سیاہ کے بھی ہوتے ہیں۔

چوتھا شعر:۔

زُلفوں میں چونکہ بل ہوتے ہیں اِس لیے اُنھیں اکثر دریا کی لہروں سے بھی تشبیہہ دیتے ہیں۔اِس شعر میں شاعر محبوب سے مُخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تُمھاری زُلف دریاے جمنا کی موج کی طرح ہے اور اِس کے نزدیک جو تِل ہے وہ جیسے کوئی جمنا کے کِنارے بیٹھا سنیاسی ہو۔(جمنا بھی ہندؤں میں مُتبرک دریا مانا جاتا ہے)

پانچواں شعر:۔

اِس شعر میں شاعر محبوب سے مُخاطب ہے اور کہتا ہے کہ تُمھاری ٹھوڑی تک آئی یہ زُلف ایسی بے قرار ہے جیسے

کوئی ناگنی کنویں پر پیاسی ہو۔ سانپ میں ویسے ہی قرار نہیں ہوتا اُس پر پیاسا ہو اور پانی سامنے ہو مگر اُس تک پہنچ نہ پائے تو کیا حالت ہوتی ہوگی، اِس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سانپ سے زُلف کو تشبیہہ دیتے ہیں۔ مگر جس طرح وؔلی نے پیاسے سانپ سے محبوب کی بے قرار زُلف کو تشبیہہ دی ہے یہ بے مثال ہے۔

چھٹا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ جس کے کلام میں تاثیر نہیں ہے، مزہ نہیں ہے۔ جس کی بات چیت میں مٹھاس نہیں ہے۔ اُس کا کلام باسی کھانے کی طرح ہے کہ جس طرح باسی کھانا بے مزہ ہوتا ہے اُسی طرح اُس کا کلام بھی مزہ نہیں دیتا۔ یہاں شاعر کی مراد زبان کی لچک اور مٹھاس سب سے لازمی ہے۔

ساتواں شعر:۔

غزل کے مقطع میں شاعر خود سے مُخاطب ہو کر کہتا ہے کہ عاشق کو آرائش سے مطلب نہیں ہوتا۔ اُس کی پہچان تو اُس کا چاک گریبان ہوتا ہے۔ لہذا جو شخص بہتر لباس کا خیال رکھتا ہے وہ عاشقوں کے نزدیک عاشق نہیں ہے بلکہ وہ تو دُنیاوی، دُنیا کا باشندہ ہے جس کو عشق سے سروکار نہیں۔

1.5 غزل نمبر2

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ | کہ آتش گُل کوں کرتی ہے گُلاب آہستہ آہستہ
عجب کچھ لُطف رکھتا ہے شب خلوت میں گلروسوں | خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ
مرے دِل کوں کیا بے خود، تری انکھیاں نے آخر کوں | کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ
ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں | کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ
ولی مجھ دِل میں آتا ہے خیالِ یار بے پروا | کہ جیوں انکھیاں منیں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

1.5.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
کوں	کو	گل	پھول
گلاب	نرم، نازک، پگھلنا	شب خلوت	رات کی تنہائی
گلروسوں	پھول جیسا چہرہ	انکھیاں	آنکھیں
جیوں	جیسے	سوں	سے

1.5.2 غزل نمبر(2) کی تشریح

پہلاشعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ میرے عشق نے اُس ظالم محبوب کو بلآ خر آب کر دیا۔یعنی اُس کی تلخی اور سختی کو نرمی میں تبدیل کر دیا۔ٹھیک اُسی طرح جِس طرح آگ کی آنچ سے پھول عرق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے عشق کی تپش نے بھی

اُس ظُلم کرنے والے محبوب کو کرم کرنے پر مجبور کر دیا۔

دُوسرا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ تنہائی کی رات میں اُس پھول ایسا چہرہ رکھنے والے یعنی خُوب صُورت محبوب کے ساتھ دھیرے، آہستہ کلام کرنا اور اُسی دھیمے اور نرم لہجے میں اُس کا جواب دینا کچھ ایسا لُطف رکھتا ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا شعر:۔

شاعر محبوب سے مُخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میرے دِل کو تمھاری آنکھوں نے بلآ خر ایسا بے ہوش کر دیا ہے کہ جیسے دھیرے دھیرے شراب اپنا اثر دِکھاتی ہے اور پینے والے کو بے خود کر دیتی ہے۔

چوتھا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ میرا محبوب جس کی پیشانی مثِلِ آفتاب روشن ہے، اِس طرح ناز و انداز سے اپنے گھر سے نکلتا ہے جیسے دھیرے دھیرے مشرق سے سُورج طلوع ہوتا ہے۔

پانچواں شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ میرے دِل میں میرے محبوب کا خیال اِس طرح بے روک ٹوک آتا ہے جیسے دھیرے دھیرے آنکھوں میں خواب آتا ہے۔ دِل میں محبوب کے خیال کو آنکھوں میں خواب آنے سے تشبیہہ دی ہے جو واقعی نادِر تشبیہہ ہے۔

1.6 غزل نمبر 3

جسے عشق کا تیر کا ری لگے	اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دمِ مرگ لگ	جسے یار جانی سوں یاری لگے
نہ ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار	جسے عشق کی بے قراری لگے
ہر اک وقت مجھ عاشقِ زار کوں	پیارے! تیری بات پیاری لگے
وؔلی سوں کہے تو اگر اِک بچن	رقیباں کے دِل میں کٹاری لگے

1.6.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
کاری	سخت، گہرا، شدید	مرگ	موت
عاشق زار	تباہ حال عاشق، عشق میں خستہ حال	بچن	بول، بات
رقیباں	مخالف، دشمن، ہم چشمک	کٹاری	چُھری

1.6.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ جسے عشق کا کارگر تیر لگ جائے اُس کے لیے زندگی دُشوار ہو جاتی ہے۔ اُس کے لیے زندگی گویا آسان نہیں رہتی۔ یعنی جسے ایک بار عشق ہو جاتا ہے وہ پھر مُشکلوں اور مُصیبتوں سے بچ نہیں سکتا۔

دُوسرا شعر:۔

کہ ایک بار جو معشوق کو اپنا بنالیتا ہے، اُس سے محبت کر بیٹھتا ہے وہ پھر مرتے دم تک اُس محبت کو چھوڑ نہیں پاتا۔

تیسرا شعر:۔

شاعر کہا ہے کہ جس کو ایک بار عشق کی بے قراری لگ جاتی ہے، جو ایک بار عشق کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اُسے پھر دُنیا میں کہیں بھی اور کبھی بھی قرار میسّر نہیں آسکتا۔

چوتھا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے پیارے، میرے محبوب میں تمہارا زبردست چاہنے والا ہوں اور مجھے تمہاری ہر بات بہت پیاری، بھلی لگتی ہے۔

پانچواں شعر:۔

شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ اگر تو ایک لفظ وؔلی کو مُخاطب ہو کر کہہ دے تو سارے رقیبوں کے دِلوں پر چھُریاں چل جاتی ہیں۔ یعنی محبوب کے چاہنے والوں کو یہ گوارا نہیں کہ وؔلی دکنی اور محبوب ایک دوسرے سے پیار و محبت کی باتیں کریں۔

1.7 غزل نمبر 4

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی و کیا مجازی کا
ہر زباں پر ہے مثلِ شانہ مُدام — ذکر تجھ زُلف کی درازی کا
آج تیری بھواں نے مسجد میں — ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
گر نہیں رازِ عشق سوں آگاہ — فخر بے جا ہے فخر رازی کا
اے ولی! سروقد کو دیکھوں گا — وقت آیا ہے سرفرازی کا

1.7.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
شغل	کام، فعل	مثل	کہانی، قصہ
شانہ	کندھا، مونڈھا	مدام	ہمیشہ، دائم، متواتر، مسلسل، لگاتار

1.7.2 غزل نمبر (4) کی تشریح

پہلا شعر:۔

اِس شعر میں صوفیانہ خیالات کا اِظہار ہوا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق کا شغل، محبت کا کام دراصل سب سے بہتر کام ہے۔ وہ عشق چاہے، عشقِ حقیقی ہو یا عشقِ مجازی۔ کہ عشقِ مجازی بھی یعنی اُس کے بندوں سے عشق بھی دراصل اُس تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے۔

دُوسرا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تمہاری زُلفیں بہت دراز ہیں اور کنگھی کی زبان کی طرح کہ جو ہر وقت تمہاری زُلفوں

میں رہتی ہے، ہر کسی کی زبان پر ہمیشہ تمہاری زُلفوں کی درازی کا تذکرہ رہتا ہے۔

تیسرا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبوب تیری بھویں چونکہ مسجد کی محراب کی طرح ہیں۔لہذا نماز ادا کرنے گئے لوگوں کی نظر جب محراب پر پڑی تو اُنھیں تمہاری محراب نما بھویں یاد آ گئیں اور وہ اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھے۔اور اِس طرح اُن کی نماز خطا ہوگئی۔

چوتھا شعر:۔

کہ اگر کوئی عشق کے رازوں سے آگاہ نہیں ہے، آشنا نہیں ہے تو اُس کو اہلِ ایران ہونے کا فخر زیب نہیں دیتا۔ اُس کا شہرایران سے ہونے کا فخر بے جا ہے۔

پانچواں شعر:۔

مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے ولؔی آج اُس دراز قد محبوب کے دیدار ہوں گے اور چونکہ عاشق کے لیے اِس سے بڑا کوئی اعزاز نہیں ہوسکتا ہے۔لہذا وہ کہتا ہے کہ آج سرفرازی کا وقت آ گیا ہے کہ اُس دراز قد محبوب کے دیدار ہوں گے۔

1.8 غزل نمبر 5

مُفلسی سب بہار کھوتی ہے　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے
کیوں کے حاصل ہو مجھ کوں جمعیت　　زُلف تیری قرار کھوتی ہے
ہر سحر، شوخ کی نگہ کی شراب　　مجھ انکھیاں کا خُمار کھوتی ہے

1.8.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
مفلسی	غریبی، ناداری محتاج، افلاس	جمعیت	اجتماع، جماعت، اطمینان، سکون
سحر	صبح، طلوع آفتاب سے پہلے کا وقت	خُمار	سرور، کیف، سرشاری، نشہ

1.8.2 غزل نمبر (5) کی تشریح

پہلا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ زندگی کی تمام بہاریں، رونقیں، خوشیاں، ناداری چھین لیتی ہے۔ مُفلسی یعنی ناداری، غریبی اِنسان کی تمام مُسکراہٹیں ختم کر دیتی ہیں۔ شاعر مزید کہتا ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ یہ ایسی لعنت ہے کہ آدمی کا عتبار ختم کر دیتی ہے۔ نادار پر کوئی بھروسا نہیں کرتا۔

دُوسرا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ مجھے اِطمینان کیونکر حاصل ہوسکتا ہے۔ مجھے سکُون کیونکر مہیا ہوسکتا ہے کہ تمہاری یہ پیچ دار دراز زُلفیں میرے دِل و دِماغ پر چھائی رہتی ہیں اور اِس طرح مجھے بے قرار کیے رہتی ہیں۔

تیسرا شعر:۔

محبوب کی آنکھوں کو پیمانے سے اکثر تشبیہہ دی جاتی ہے۔ پیمانے میں شراب ہوتی ہے۔اب شاعر کہتا ہے کہ ہر صُبح اُس شوخ، شریر، چنچل محبوب کا دیدار کرتا ہوں۔اُس کی نگاہوں کی شراب پیتا ہوں اور اِس طرح سے خُمار کی حالت سے نجات پالیتا ہوں۔خُمار اُس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں نشہ اُترنے لگتا ہے اور بدن جیسے ٹوٹتا ہے۔

1.9 غزل نمبر 6

طالب نہیں مہر و مُشتری کا　　دیوانہ ہوا ، جو تجھ پری کا
یو' غمزۂ شوخ ، ساحری کا　　اُستاد ہے سحرِ سامری کا
تجھ تِل سوں، اے آفتاب طلعت!　　ممنون ہوں ذرّہ پروری کا
کفارِ فرنگ کو دیا ہے تجھ　　زُلف نے درس کافری کا
توں سر سوں، قدم تلک جھلک میں　　گویا ہے قصیدہ انوری کا
خورشید ستی ہوا ہے ہمسر　　چیرہ، تیرے سر اُپر زری کا

1.9.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
مہر	شمس، خورشید، آفتاب	مشتری	سیارہ، پیلے رنگ کا سیارہ
غمزہ	ناز ونخرا، ناز وادا	ساحری	جادوگری
سامری	موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا ایک جادوگر	آفتاب طلعت	روشن سورج

ذرہ پروری	ناچیز کی قدر افزائی، شفقت، مہربانی	کفار فرنگ	دوسرے ملک کے کافر		
سرسوں	سرسے	چہرہ	دلیر، فتح مند، زورآور		

1.9.2 غزل نمبر(6) کی تشریح

پہلا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ایک بار جو تجھ ایسی خوبصورت محبوب کا عاشق ہو جاتا ہے، تیرا دیوانہ ہو جاتا ہے، اُسے پھر کسی دُوسری چیز کی طلب باقی نہیں رہتی۔ اُس کے دِل میں چاند تاروں کی خواہش باقی نہیں رہتی۔(مُشتری ایک تارے کا نام ہے)

دُوسرا شعر:۔

اے محبوب تمہارا یہ آنکھ کا ہلکا سا شوخ اِشارہ جادُوگری میں سامری کے جادُو کا اُستاد ہے۔ سامری کا جادُو وہ ہے کہ جِس نے حضرت موسیٰ کے زمانے میں سونے کے بچھڑے میں گویائی پیدا کر دی تھی۔

تیسرا شعر:۔

کہ تمہارے اِس سُورج ایسے چمکتے چہرے پر جو تِل ہے، گویا ناچیز کو تو نے اعلیٰ بنا دیا ہے۔ تمہاری اِس ذرّہ پروری کا بہت مشکُور رہوں۔ تو نے تِل کو اپنے خوب صورت چہرے پر جگہ دی۔ یہ ذرّہ پروری کی ایک مثال ہے۔

چوتھا شعر:۔

کہ اہلِ فرنگ جو اِسلام کو نہیں مانتا، کافر ہے۔ دراصل اے محبوب اُس کو تمہاری زُلفوں نے کافری کا سبق پڑھا کر گُمراہ کر دیا ہے۔ ورنہ وہ بھی کافر نہ ہوتا۔

پانچواں شعر:۔

اے شوخ محبوب تو آب وتاب کا ایک مجسمہ ہے۔ سر سے پاؤں تک آب وتاب اور مشابہت میں تو جیسے انوریؔ کا قصیدہ ہے۔ انوریؔ فارسی کا زبردست قصیدہ گو شاعر ہے۔ گویا اے محبوب تو سر سے پاؤں تک وہی آب وتاب رکھتا ہے۔ جو انوریؔ کے قصیدے میں ہوتی ہے۔

چھٹا شعر:۔

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تیرے سر پر سونے کی ایک خوب صورت لکیر سی جو مانگ ہے۔ یہ خورشید کی برابری کر رہی ہے۔ اِس میں وہی سج دھج ہے، وہی چمک ہے جو خورشید کی کرنوں میں ہوتی ہے۔

1.10 غزل نمبر 7

دِل کوں گر مرتبہ ہو درپن کا | مُفت ہے دیکھنا سری جن کا
جامہ زیبوں کو کیوں تجوں؟ کہ مجھے | گھیر رکھتا ہے دور دامن کا
اے زباں! کر مدد کہ آج صنم | مُنتظر ہے بیان روشن کا
حکمتِ عشق، بوعلی سوں نہ پوچھ | نئیں وہ قدر شناس اِس فن کا
آئینہ، ہو کے تجھ سے ہم زانو | غیرت افزا ہوا ہے گُلشن کا
ٹک ولؔی کی طرف نگاہ کرو | صُبح سوں مُنتظر ہے درشن کا

1.10.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
کوں	کو	درپن	آئینہ،شیشہ،آرسی
سری جن	بنانے والا، پرورش کرنے والا	ہم زانو	گھٹنے کے بل

1.10.2 غزل نمبر(7) کی تشریح

پہلا شعر:۔ دِل کو آئینے سے اکثر تشبیہہ دی جاتی ہے کہ یہ بھی اسی طرح نرم و نازُک وصاف ہوتا ہے۔شاعر اِس کے بر عکس بات کرر ہا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر دِل کو درپن یعنی آئینے کا رُتبہ مل جائے، گویا وہ آئینہ ہو جائے تو پھر محبوب کا دیدار کرنا بہت آسان ہو جائے اور بہ قول شاعر یہ صُورت پیدا ہو جائے۔ ع

دِل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میں جامہ زیب لوگوں کو، وہ لوگ کہ جن کو ہر لباس اچھا لگتا ہے یعنی کہ محبوب لوگوں کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں کہ مجھے تو اُن کے دامن کا گھیرا ہی گھیرے رہتا ہے۔ میں اُس کی پکڑ سے باہر نکل ہی نہیں سکتا۔

تیسرا شعر:۔ بہت کچھ کہنا ہوتا ہے مگر جب محبوب کے سامنے جاتا ہے تو کچھ بیان نہیں کر سکتا۔شاعر اپنی زبان سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ آج میرا محبوب میری روشن بیانی کا منتظر ہے لہذا وہ زبان سے کہتا ہے کہ آج میری مدد کرنا کہ میں اپنے دِل کی بات اُس کے سامنے کہہ سکوں۔

چوتھا شعر:۔ بوعلی سینا ایک بہت بڑے مُفکر کا نام ہے۔شاعر کہتا ہے کہ وہ بہت بڑا فلاسفر سہی، لیکن عشق کی حکمت، اُس کے قانون سے وہ بالکل ناواقف ہے۔لہذا عشق کی حکمت اُس سے پوچھنا بے سُود ہے۔وہ عشق کے قانون کا شناسا نہیں ہے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ذرا وَلی کی طرف نگاہ اُٹھاؤ کہ وہ صُبح سے تمھارے دیدار کا اِنتظار کر رہا ہے۔

1.11 غزل نمبر8

دیکھنا ہر صُبح تجھ رُخسار کا ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا
بُلبُل و پروانہ کرنا دِل کے تئیں کام ہے تجھ چہرۂ گُلنار کا
صُبح تیرا درس پایا تھا صنم شوقِ دِل محتاج ہے تکرار کا
ماہ کے سینے اُپر اے شمع رو! داغ ہے تجھ حُسن کی جھلکار کا
دِل کوں دیتا ہے ہمارے پیچ وتاب پیچ تیرے طرّہ طرار کا
جو سُنا تیرے دہن سوں اِک بچن بھید پایا نسخۂ اسرار کا
چاہتا ہے اِس جہاں میں گر بہشت جا تماشا دیکھ اُس رُخسار کا
سرکشی ، آتش مزاجی ہے سبب ناصحوں کو گرمئ بازار کا
اے ولؔی! کیوں سُن سکے ناصح کی بات؟ جو دوانا ہے پری رُخسار کا

1.11.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
رخسار	گال، گلا، رخ، چہرہ	گلنار	سرخ، آتشی
تکرار	بحث، جھگڑا، اصرار	جھلکار	آب وتاب
پیچ وتاب	معشوقانہ خرام، کش مکش، قہر وغضب	طرۂ طرار	معشوق کی زلفیں
دہن	منہ، مسام، خم	بھید	راز، چھپی ہوئی بات، سراغ
سرکشی	نافرمانی، غرور، گھمنڈ	ناصحوں	خیرخواہ، نصیحت دینے والے، مخلص
دوانا	دیوانا		

1.11.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر:۔غزل کے مطلع میں شاعر فرماتا ہے کہ اے محبوب ہر صُبح تیرے رُخساروں کا نظّارہ کرنا گویا خورشید کے طلوع ہونے کا نظّارہ کرنا ہے۔ یہاں شاعر نے چہرے کو سُورج اور صُبح اُس کا نظّارہ کرنے کو، سُورج طلوع ہونے کے منظر کا نظّارہ کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

دُوسرا شعر:۔بُلبُل پھول کا عاشق اور پروانہ آگ کا دیوانہ تصّور کیا گیا ہے۔شاعر نے رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔لہٰذا اُس نے محبوب کے چہرے کے لیے لفظ گُلنار استعمال کیا ہے۔گُل اور نار، پھول اور آگ۔بُلبُل اور پروانہ دونوں کا معشوق۔ویسے چہرۂ گُلنار کے معنی سُرخ چہرے کے ہوتے ہیں۔وہ کہتا ہے کہ دِلوں کو بُلبُل ویرانہ کی طرح عاشق بنا لینا تیرے روشن چہرے کے لیے معمولی بات ہے۔

تیسرا شعر:۔شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب صُبح تیرا دیدار کیا تھا، اب دِل کا اشتیاق تُم سے بات کرنے کا حاجت مند ہے، حاجت رکھتا ہے۔

چوتھا شعر:۔اِس شعر میں شاعر نے صنعتِ حُسنِ تعلیل سے کام لیا ہے۔کہتا ہے کہ چاند کے سینے پر جو داغ دِکھائی دیتا ہے، اے شمع ایسا روشن چہرہ رکھنے والے محبوب دراصل تمھارے حُسن کی جھلکار کا داغ ہے۔اُس نے تمھارے حُسن کی جھلک دیکھ لی تھی۔جبھی سے اُس کا سینہ داغ دار ہو گیا ہے۔

نواں شعر:۔غزل کے مقطع میں شاعر خود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے ولؔی اُس کے خوب صورت گالوں کو جو ایک بار دیکھ لے وہ اُن کا دیوانہ ہو جائے گا اور پھر دیوانے کو کون نصیحت کر سکتا ہے۔وہ نصیحت کرنے والے کی کیوں کر سُنے گا۔

1.12 غزل نمبر 9

پِی کے ہوتے ، نہ کر تو مہ کی ثنا	معتبر نہیں ہے حُسنِ دور نما
باعثِ نشۂ دوبالا ہے	حُسنِ صورت کے ساتھ حُسنِ ادا
اے گُلِ باغ حُسن ! مُکھ سوں ترے	جلوہ پیرا ہے رنگ و بوے حیا
ماہِ نو ، تجھ بھواں پہ کر کے نظر	سوئے مغرب چلا ہے روبہ قضا
سُرخ رویاں منیں سرآمد ہے	تجھ قدم کے اثر سوں رنگِ حنا
نئیں ہے گُلِ پی کے مُکھ سا عالم میں	قائل اِس بات کی ہے بادِ صبا

1.12.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
مہ	مہتاب، چاند	ثنا	مداح،تعریف
دوبالا	دگنا، دوچند، بڑھ چڑھ کر	مکھ	رخ، چہرہ
قائل	ہار ماننے والا،تسلیم کرنے والا	بادصبا	صبح کی ہوا

1.12.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر:۔ چوں کہ دُور سے دِکھائی دینے والی چیز اعتبار کے قابل نہیں ہوتی۔ لہذا شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی موجودگی میں چاند کی تعریف مت کر۔ کیوں کہ چاند بہت فاصلے پر ہے اور محبوب نزدیک ہے۔ محبوب خوب صورت، حقیقت ہے، جب کہ چاند کی خوب صورتی دھوکہ بھی ہوسکتی ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا محبوب خوب صورت ہے اور اِس کے ساتھ خوب صورت ادائیں بھی رکھتا ہے اور جب

یہ دونوں چیزیں ہوں تو نشے کو دوگنا کرنے کے برابر ہوا یعنی خوب صورتی دوگنی ہو جاتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر، محبوب کو حُسن کے باغ کا پھول قرار دیتا ہے اور مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تمھارے چہرے سے حیا اور رنگ و بو اپنا جلوہ دِکھا رہی ہے، گویا تمھارے چہرے سے حیا ٹپک رہی ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ خوب صورت چہرے والے محبوبوں میں حِنا بہت مقبول ہے۔ اُسے بڑی سبقت حاصل ہے اور وہ برتری اُسے اِس لیے حاصل ہے کہ اُس نے تیرے قدموں کو چھوا ہے۔ وہ تمھارے قدموں لگی ہے، اِس لیے سرُخ چہروں والے محبوب لوگوں میں اُسے برتری حاصل ہے۔

ساتواں شعر:۔ غزل کے مقطع میں شاعر کہتا ہے اے ولؔی تیرے کلام کو وہ سمجھ سکتا ہے جس کو قدُرت نے تیز ذہن عطا کیا ہو۔

1.13 غزل نمبر 10

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حُسنِ بے حجاب اُس کا
بغیر از دیدۂ حیراں، نہیں جگ میں نقاب اُس کا

ہوا ہے مجھ پہ شمعِ بزمِ یک رنگی سے یو روشن
کہ ہر ذرّہ اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اُس کا

کرے عُشاق کوں، جوں صورتِ تصویر، حیرت سوں
اگر پردے سوں وا ہووے جمالِ بے حجاب اُس کا

سجن نے یک نظر دیکھا نگاہِ مست سوں جس کوں
خراباتِ دوعالم میں ، سدا ہے دو خراب اُس کا

مرا دِل پاک ہے از بس ولؔی! زنگِ کدورت سوں
ہوا جیوں جوہرِ آئینہ مخفی پیچ و تاب اُس کا

1.13.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
دیدۂ حیراں	حیرت زدہ	تاباں	روشن، چمک دار، درخشاں
دائم	ہمیشہ قائم یا موجود رہنے والا، مدام	عشاق	عشق کرنے والے
خرابات	شراب خانے کے رند	جیوں	جیسے، جس طرح
مخفی	چھپا ہوا، گپت، پوشیدہ، خفیہ	پیچ وتاب	معشوقانہ خرام، کش مکش، قہر وغضب

1.13.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر غزل کے مطلع میں کہتا ہے کہ محبوبِ حقیقی یعنی خُدا کا حُسن دُنیا میں ہر طرف ظاہر ہے۔ کوئی پردہ نہیں ہے۔ اگر کوئی پردہ ہے تو وہ ہماری حیران آنکھوں کا پردہ ہے کہ جو اُس کو دیکھ نہیں پاتیں۔ عابدؔ پیشاوری کا ایک شعر ہے۔

ہر ایک ذرّے میں وہ نہاں ہے مگر یہ ہے شرطِ دید عابدؔ
وہ دیکھ سکتا ہے اُس کا جلواہ کہ جس کی آنکھوں میں روشنی ہے

تیسرا شعر:۔ کہ اُس کا حُسن بے حجاب ہے مگر اُس کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ اگر اُس کا وہ بے حجاب حُسن کا پردہ کھل جائے تو وہ عشاق یعنی عاشقوں کو اِس قدر حیرت زدہ کردے کہ وہ تصویر ہو جائیں۔

چوتھا شعر:۔ کہ محبوب جسے ایک بار اپنی مست آنکھوں سے دیکھ لے پھر وہ اِس عالم کے خرابات یعنی مے خانے میں ہمیشہ خراب حال رہے گا۔

پانچواں شعر:۔ پُرانے زمانے میں لوہے کے آئینے ہوتے تھے۔ اُن پر زنگ بھی لگتی تھی۔ رگڑ رگڑ کا اُنھیں صاف کیا جاتا تھا اور تب تک رگڑتے تھے کہ جب تک اُن میں وہ گول دائرے نظر نہیں آتے تھے۔ جس کو شاعر پیچ وتاب کہتا ہے۔

چوں کہ دِل کو آئینے سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ جس طرح آئینے کا کمال اُس کے پیچ وتاب میں ہے، اُسی طرح میرے دِل کا آئینہ بھی نفرت کے زنگ سے پاک ہے۔ گویا یہ آئینہ زنگ آلودہ نہیں ہے۔

1.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ محمد وؔلی دکنی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر 2:۔ شمال ہند میں وؔلی کے کلام کے آنے کے بعد اردو شاعری کا چلن عام ہوا! کی وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر 3:۔ وؔلی دکنی کی شاعری کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

سوال نمبر 4:۔ وؔلی دکنی کی غزل گوئی پر نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر 5:۔ اردو شاعری میں وؔلی دکنی کے مقام کا تعین کیجیے۔

1.15 کتابیات

1 قدیم دکنی شاعری میں مشترکہ کلچر، از ڈاکٹر انوری بیگم، مطبوعہ، کتابی دنیا دہلی۔

2 وؔلی دکنی (تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر)، مرتب، گوپی چند نارنگ، مطبوعہ، ساہتیہ اکادمی، دہلی۔

3 مطالعہ وؔلی، از ڈاکٹر شارب ردولوی، مطبوعہ، اعلیٰ پریس۔ بلیماران، دہلی۔

4 وؔلی انتخاب وتہذیب، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، مرتب، محمد خاں اشرف، مطبوعہ، جواہر آفیسٹ پریس دہلی۔

5 انتخاب وؔلی، تصحیح وترتیب از ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی، مطبوعہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔

6 کلیات وؔلی، مرتبہ، نورالحسن ہاشمی، مطبوعہ، اترپردیش اردو اکادمی لکھنو۔

اکائی نمبر2

خواجہ میر دردؔ کی غزلیات اور شرح

ساخت:

2.1 سبق کا تعارف
2.2 سبق کا ہدف
2.3 خواجہ میر دردؔ کی حیات اور غزل گوئی
2.4 غزل نمبر1
2.4.1 فرہنگ
2.4.2 غزل کی تشریح
2.5 غزل نمبر2
2.5.1 فرہنگ
2.5.2 غزل کی تشریح
2.6 غزل نمبر3
2.6.1 فرہنگ
2.6.2 غزل کی تشریح
2.7 غزل نمبر4
2.7.1 فرہنگ
2.7.2 غزل کی تشریح
2.8 غزل نمبر5

2.8.1 فرہنگ
2.8.2 غزل کی تشریح
2.9 غزل نمبر6
2.9.1 فرہنگ
2.9.2 غزل کی تشریح
2.10 غزل نمبر7
2.10.1 فرہنگ
2.10.2 غزل کی تشریح
2.11 غزل نمبر8
2.11.1 فرہنگ
2.11.2 غزل کی تشریح
2.12 غزل نمبر9
2.12.1 فرہنگ
2.12.2 غزل کی تشریح
2.13 غزل نمبر10
2.13.1 فرہنگ
2.13.2 غزل کی تشریح
2.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات
2.15 کتابیات

2.1 سبق کا تعارف

دردؔ ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ اور ایک عالی مرتبہ باپ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے ایسے مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی جہاں علم وفضل کے چشمے پھوٹتے تھے۔ چنانچہ علم وفضل کی روایت انھیں وراثت میں ملی تھی۔ وہ شاہ گلشن سے خاص عقیدت رکھتے تھے اور ان کی طرح تصوف اور موسیقی کے ساتھ ساتھ شاعری کی طرف بھی فطری میلان رکھتے تھے۔ اس پر طرۂ امتیاز یہ کہ میر دردؔ نے ذہانت و ذکاوت بھی خداداد پائی تھی۔ ان کے علم وفضل اور گہرے شعور وادراک کا اندازہ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے بخوبی لگ جاتا ہے۔ انھیں فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا اور دونوں زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے۔ ان کی نثری تصانیف جو فارسی زبان میں ہیں ان میں قرآن وحدیث کے حوالوں کی کثرت سے اس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ دردؔ عربی زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے اور روحانی تعلیم سے بھی بہرہ مند تھے۔

خواجہ میر درد ''نالہ درد'' میں خود اپنے متعلق یوں لکھتے ہیں '' فقیر کے اشعار باوجود رتبہ شاعری اور نتیجہ شاعری کے نتائج نہیں ہیں۔ فقیر نے کبھی شعر آورد سے موزوں نہیں کیا اور نہ کبھی اس میں مستغرق ہوا۔ کبھی کسی کی مدح نہیں کی نہ ہجو لکھی اور فرمائش سے شعر نہیں کہا۔''

دردؔ کی شاعری اور زندگی دونوں میں یک رنگی ہے اور دردؔ اردو شاعری میں تصوف کے امام کہلاتے ہیں۔ انہوں نے جو کہا سچ کہا اور اثر و تاثیر میں ڈوب کر کہا، وحدت الوجود ان کا محبوب موضوع رہا، انسان کا مقام اور حیات و کائنات پر بحث تصوف کے آئینے میں ان کی شاعری کے خاص جواہر ہیں۔ آپ کا شمار میر تقی میرؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ کے ہم عصر شعراء میں ہوتا ہے۔ دردؔ کے مزاج میں دردمندی، سوگواری اور خاکساری تھی، خود ان کا تخلص بھی درد پسندی کی علامت بن گیا تھا۔ دردؔ کی شاعری اپنی شان، ادا اور بے نیازی میں اپنی مثال آپ ہے۔

2.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں خواجہ میر درؔد کی حیات، غزل گوئی اوران کی غزلیات کی تشریح کوشامل کیا گیا ہے جس کا مقصد طلباء کودرؔد کے کلام اوران کی زندگی سے واقف کروانا ہے۔درؔد کی صوفیانہ زندگی کے تمام مراحل کااس اکائی میں بخوبی و بحسن ذکر کیا گیا ہے۔

2.3 خواجہ میر درؔد کی حیات اورغزل گوئی

سیّدخواجہ میر نام اور درؔد تخلص تھا۔۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔خواجہ میر درؔد کے ماں باپ دونوں سادات خاندان سے تھے۔ یہ وہ خاندان ہے جس کومسلمانوں میں سب سے زیادہ باعزت خیال کیا جاتا ہے۔ چونکہ اِس کا سِلسِلہ رسول اللہؐ کے خاندان سے جا کر مِلتا ہے۔درؔد کے پردادا خواجہ محمد طاہر،اورنگ زیب کے زمانے میں بخارا سے دہلی آئے۔ اورنگ زیب جو عالموں اور درویشوں کا بڑا قدر دان تھا،اُس نے اُنھیں بڑی عزت دی اور دربار میں شامل کیا۔شاہی خاندان میں اُن کے بیٹوں کی شادیاں ہوئیں۔خواجہ طاہر کے چھوٹے بیٹے فتح اللہ خان نے شاہی خاندان کے بجائے ایک عام سیّد گھرانے کی لڑکی سے شادی کی۔ میؔر دردؔ اُنہی کے پوتے تھے۔درؔد کے والد کا نام خواجہ ناصر تھااورعندلیبؔ تخلص کرتے تھے۔اُنہوں نے خاندانی منصب کوچھوڑ کر درویشی اِختیار کی۔فارسی میں تصوف پر کئی کتابیں لکھیں۔

میر درؔد نے دواُستادوں مفتی دولت اور سراج الدین خاں آرزؔو سے فارسی زبان وادب کا سبق لیا۔اِس کے علاوہ اُنھوں نے اپنے والد ناصرعندلیب سے بھی دینی فیض حاصل کیا۔اُنھیں اپنے والد کی طرح فنِ موسیقی سے بھی لگاؤ پیدا ہوگیا۔اِبتدامیں درد نے شاہ عالم کی فوج میں سپاہی کا پیشہ اختیار کیالیکن طبعیت موافق نہ ہونے کی وجہ سے جلد ہی سبکدوش ہوگئے۔اُنتیس برس کی عُمر میں والد کی طرح درویشی اِختیار کی۔والد کی وفات کے بعداُنتالیس برس کی عُمر میں اُنھیں باپ کی جگہ پر بٹھایا گیا۔درد نے اپنی باقی عُمر بڑے ہی پاکیزہ اور درویشانہ انداز میں بسر کی۔تصوف کواپنا اوڑھنا بچھونا بنالیااور شاعری میں بھی تصوف کو ہی خصوصیت کے ساتھ برتا۔جب دہلی کی حالت بہت خراب ہوگئی اور سبھی اسے

چھوڑ کر جانے لگے تو اُس وقت بھی دردؔ نے دہلی نہیں چھوڑی۔ اُن کا ایک دیوان ملتا ہے جس میں اُردؤ اور فارسی کی غزلیں ہیں۔ ۱۷۸۵ء میں اِنتقال کیا اور دہلی میں ہی دفن کیے گئے۔

دردؔ غیر معمولی خوبیوں کے مالک تھے۔ اُنھیں جو مذہبی ماحول مِلا اُس سے وہ خُدا کی محبت میں ایسے کھو گئے کہ پھر کچھ اور نہ سُوجھا۔ اِن کے باپ دادا مغل دربار میں اُونچے عہدوں پر رہے اور شان و شوکت اُن کے قدم چومتی تھی لیکن اِس کے باوجود دردؔ کی طبعیت میں مذہب کی پابندی، خوفِ خُدا رحم اور ہمدردی اور درویشی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُن کی بُلند شخصیت کا ثبوت یہ ہے کہ اُس زمانے میں جتنے بھی تذکرے لکھے گئے سب میں دردؔ کا ذکر بڑی عزت سے ہوا ہے۔ پھر چاہے وہ میرؔ کا تذکرہ ''نکات الشعرا ہو یا میر حسن کا ''تذکرۂ شعرأ اُردو۔

کلام کی خصوصیات اور غزل گوئی میں اُن کا مقام:۔

میر دردؔ نے جیسی زندگی گذُاری، جن چیزوں پر ایمان اور یقین تھا وہی خیالات اُن کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہیں اُردو شاعری خصوصاً صنفِ غزل میں بہت اونچا درجہ دیا جاتا ہے اور اُردو شاعری کی عمارت کے چار ستونوں میں سے ایک کہا جاتا ہے۔ ''آبِ حیات'' کے مصنف مولانا محمد حسین آزاد نے اُن کی غزلوں کے بارے میں کہا ہے کہ وہ تلواروں کی آبداری کو نشتروں میں بھر دیتے ہیں اور بقول امیرؔ مینائی ''پسی ہوئی بجلیاں'' معلوم ہوتی ہیں۔

اُن کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کا سیدھا سادہ اندازِ بیان ہے۔ جس طرح اُن کی زندگی سادہ تھی اُسی طرح اُن کے کلام میں بھی کسی طرح کی بناوٹ نہیں پائی جاتی۔ ویسے تو دہلی اسکول کی خصوصیت سادگی ہی ہے لیکن سادگی اور صفائی میں دردؔ کا مقابلہ نہیں۔ میر تقی میرؔ جن کو خدائے سُخن کہا جاتا ہے اُن کے ہاں بھی ایسی گھلاوٹ اور صفائی نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک ایک ہی طرح کی دِل میں اُتر جانے والی شاعری ہے۔

اِن کے اشعار کی خوبی یہ ہے کہ اِن میں نہ تو کسی قسم کی بناوٹ ہے اور نہ سجاوٹ، نہ اُونچے الفاظ ہیں اور نہ نئی ترکیبیں، مگر شعر کہنے کا انداز ایسا انوکھا اور پُر تاثیر ہے کہ سُننے والا سوچے کہ اس میں کیا خاص بات ہے۔ یہ تو ہر ایک کہہ

سکتا ہے مگر جب اِس جیسا شعر کہنے بیٹھے تو بڑے سے بڑا اُستاد بھی نہ کہہ سکے۔ میؔر کے لیے مشہور ہے کہ اُن کے کلام میں صرف ''آہ'' ہے مگر دردؔ کی شاعری بھی اِس سے الگ نہیں۔ دِل کی بے بسی کا حال اور زبان پر مہر کوئی ایسا موضوع نہیں کہ جسے اوروں نے برتا نہ ہو لیکن دردؔ کا کا انداز دیکھیے۔

آہ کہیں یہ ناتواں حال کرے سو کیا بیاں
مُنہ پہ ہے مہرِ خامشی، دِل میں بھرا خروش ہے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

شمع کی مانند ہم اِس بزم میں
چشمِ تر آئے تھے، دامن تر چلے

شاعر نے خود کو شمع سے تشبیہہ دی ہے کہ ہماری بھی شمع کی طرح آنکھیں آنسوؤں سے پُر رہتی ہیں جس سے دامن بھیگ جاتا ہے۔ ''دامن تر'' کے معنی گنہگار کے ہیں۔

اِنسان جب غمگین ہو تو ہر چیز غمگین دِکھائی دیتی ہے۔ پھول کا کھلنا خوشی کی علامت ہے لیکن وہ اِس منظر کو بھی غم میں ڈوبا ہوا دیکھتے ہیں۔ پھول کھلنے کو وہ کپڑے کا چاک ہونا تصور کرتے ہیں اور نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ پھول بھی کسی کے غم میں ماتم زدہ ہے اور اپنا لباس چاک کر رہا ہے۔

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
اُدھر گُل پھاڑتے تھے جیب، روتی تھی اِدھر شبنم

دردؔ کی شاعری میں درد و غم کے ساتھ ساتھ عشقِ حقیقی بھی نمایاں ہے۔ وہ تصوفانہ مضامین کو بڑی خوبی سے بیان کر جاتے ہیں۔ مثال دیکھئے:

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دِل ہے وہ کہ جہاں تُو سما سکے

میرا تو جی وہاں رہتا ہے نت جہاں ہے تو
اگرچہ میں یہ نہیں جانتا کہ کہاں ہے تُو

....

بستے ہیں تیرے سائے میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

اِن اشعار میں عشقِ حقیقی کے ساتھ ایک اور بات بھی نمایاں ہے کہ دردؔ کے ہاں مذہب کا اختلاف کوئی معنی نہیں رکھتا۔اُن کے نزدیک ہندو مسلمان سبھی اُسی کے بندے ہیں۔

دردؔ ایک اِنسان ہیں اور وہ اِنسان کی محبت میں بھی تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ محبت کے موضوع کو بھی بڑی سادگی سے بیان کر جاتے ہیں جس کی مثال ہمیں میرؔ کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آ گیا
وہ نگاہیں جو چار ہوتی ہیں
برچھیاں ہیں کہ پار ہوتی ہیں

....

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جُز جفا
پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

....

اُس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

2.4 غزل نمبر 1

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دِل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے — نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے

قاصد! نہیں یہ کام تیرا، اپنی راہ لے — اُس کا پیام دِل کے سِوا کون لا سکے

غافل! خُدا کی یاد پہ مت بھول زنہار — اپنے تئیں بھُلا دے اگر تُو بھُلا سکے

یارب! یہ کیا طلسم ہے؟ اِدراک وفہم یاں — دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

اطفائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے — یہ آگ وہ نہیں، جسے پانی بھُجا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بےخود ہے جس کو حشر — اے دردؔ! چاہے لائے بخود، پھر نہ لا سکے

2.4.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
ارض وسما	زمیں اور آسمان	وسعت	فراخی، جسامت، طول، کشادگی
فتادہ	بےوقعت، گرا ہوا	زنہار	امان، پناہ، حاشا، ہرگز
طلسم	جادو، ٹونا، سحر، منتر، نظر بندی	ادراک	سمجھ، دانائی، شعور
فہم	عقل، خرد، علم، سمجھ بوجھ	اطفائے راز	بجھانے کا علم
آب اشک	آنسوؤں کا پانی	حشر	قیامت، عاقبت، کہرام، ہجوم

2.4.2 غزل نمبر (1) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے خُدا یہ زمین و آسمان تیری وسعت کو نہیں پا سکتے۔ تیری وسعت کو پانا اُن کے بس میں نہیں ہے۔ یہ صرف میرا دِل ہے کہ جہاں تو سما سکتا ہے، جہاں تو مکین ہو سکتا ہے۔ شاعر نے زمین و آسمان کی کشادگی کو دِل کے مقابلے میں ہیچ قرار دیا ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میں وہ گرا پڑا اِنسان ہوں کہ مجھے کوئی اُٹھا نہیں سکتا۔ جس طرح قدم کے نِشان کو مٹائے بغیر اُٹھایا نہیں جا سکتا، اُسی طرح مجھے بھی موت کے بغیر کوئی اُٹھا نہیں سکتا۔

تیسرا شعر:۔ اے قاصد، اے نامہ بر یہ ٹھیک ہے کہ تو نامہ لے جاتا ہے لیکن مجھے جس کا پیام درکار ہے وہ تیرے بس کا نہیں، لہٰذا تو چلا جا۔ یہ محبوبِ حقیقی کا پیام لانا تیرا کام نہیں ہے۔ اُس کا پیام تو دِل کے سِوا کوئی دُوسرا لا ہی نہیں سکتا۔

چوتھا شعر:۔ اے غفلت شعار اِنسان خُدا کی یاد کو اپنے دِل میں ہمیشہ رکھ۔ اُس کو کبھی مت بُھلا۔ اگر بُھلا سکتا ہے تو اُس کی یاد میں خود کو بُھلا دے۔

ساتواں شعر:۔ حشر گویا قیامت۔ اُس دِن قیامت کا شور ہوگا۔ اب شاعر کہتا ہے کہ اے دردؔ عشق کے شراب میں جو مست ہو گیا، جو بے خود ہو گیا، اُس کو ہوش میں لانا ممکن نہیں ہے۔ قیامت کا شور بھی اُس کو ہوش میں نہیں لا سکتا۔

2.5 غزل نمبر 2

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جُستجو کریں	دِل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک آن میں کسرت نُمائیاں	گر آئینہ کے سامنے ہم آ کے ہؤ کریں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو !	دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضؤ کریں
سرتا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم	پر یہ کہاں مجال جو کچھ گُفتگو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پر اِتنا ہوں ناقبوُل	منھُ پھیر لے وہ جس کے مجھے رُوبرو کریں
نے گُل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار	کِس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بُو کریں
ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر	اے درد! آ کے بیعتِ دست سبؤ کریں

2.5.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
ہوس	لالچ،حرص،خواہش،تمنا	فلک	آسمان،سما،آکاش،چرخ
کسرت	ورزش،ریاضت	ثبات	سلامتی،مضبوطی،پائیداری
زاہدان	پرہیزگار،عابدین،علائقین دنیا	سبو	جام،مٹکا،گھڑا،پیالہ

2.5.2 غزل(2) کی تشریح

پہلاشعر:۔ غزل کے مطلع میں دردؔ کہتے ہیں کہ اے فلک،اے آسمان،تم میں ہم کس خواہش کی تلاش کریں۔خواہش تو دِل میں ہوتی ہےاور ہمارے پاس تو دِل ہی نہیں رہا کہ تمنا پیدا ہو۔

تیسراشعر:۔ تر دامنی گناہوں سے بھرے ہوئے دامن کو کہتے ہیں۔اب شاعر کہتا ہے کہ ہمارے گناہوں سے بھرے دامن پر مت جا۔اِس تر دامن پر مت جا۔یہ اِتنا پاکیزہ ہے کہ اگر ہم اِس کو نچوڑ دیں تو فرشتے بھی اِس سے آکر وضو کریں۔یعنی نماز ادا کرنے سے پہلے پاکیزہ ہونے کے لیے اِس سے مُنہ دھویں۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میں سچ بولتا ہوں گویا آئینہ ہوں۔وہ بھی اصل صورت دِکھاتا ہے۔لیکن اِس قدر نا قبول ہوں کہ جس کے سامنے آنے سے ہر کوئی کتراتا ہے۔مجھے جس کے بھی رُوبرو کریں وہ اپنامُنہ پھیر لیتا ہے۔

چھٹاشعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ نہ ہی پھول کو پائیداری ہےاور نہ ہی ہمیں خود اپنا بھروسہ ہے۔گویا ہر چیز بے ثبات ہے تو پھر کس کے لیے اس چمن کے رنگ وبُو کی خواہش کریں۔یعنی اِس دُنیا کی خواہش کریں۔

ساتواں شعر:۔ شاعر خود سے مخاطب ہے۔کہتا ہے کہ اے دردؔ ہماری یہ صلاح ہے کہ تمام پرہیزگار دستِ سبو کی اطاعت قبول کریں۔یعنی کہ معارفت کے جام اُٹھائیں۔

2.6 غزل نمبر3

جگ میں کوئی نہ ٹُک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
اُس نے قصداً بھی میرے نالے کو — نہ سُنا ہوگا، گر سُنا ہوگا
دیکھیے غم سے اب کے جی میرا — نہ بچے گا، بچے گا، کیا ہوگا
دِل زمانے کے ہاتھ سے سالم — کوئی ہوگا ؟کہ رہ گیا ہوگا
حال مجھ غمزدے کا جِس تِس نے — جب سُنا ہوگا رو دیا ہوگا
دِل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں — کہیں غُنچہ کوئی کھلا ہوگا
قتل سے میرے وہ جو باز رہا — کسی بد خواہ نے کہا ہوگا
دِل بھی اے درد! قطرۂ خوں تھا — آنسوؤں میں کہیں گِرا ہوگا

2.6.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
ٹک	تھوڑی سی مدت، ذرا،تھوڑا، کچھ	نالے	عاشق کی دعا،فریاد،آہ وبکا،زاری
سالم	سلامت،محفوظ،کامل،پورا	بدخواہ	براچاہنے والا،دشمن،کینہ ور

2.6.2 غزل(3) کی تشریح

پہلاشعر:۔ زمانہ کسی کوخوش نہیں رہنے دیتا۔اب شاعر کہتا ہے کہ دُنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ وہ ذرا مسکرایا ہواور زمانے نے اُس کو رُلایا نہ ہو۔یعنی وہ ہنستے ہی رونہ دیا ہو۔

دُوسرا شعر:۔ محبوب عاشق کی جانب ہمیشہ غافل رہتا ہے۔اب شاعر کہتا ہے کہ محبوب نے ارادتاً بھی میرے نالے کو ان سُنا کر دیا ہوگا۔گویا اُس نے میری آہ وفغاں کو سُن کر بھی نہ سُنا ہوگا۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ زمانہ کسی کو سکون میّسر نہیں ہونے دیتا۔کوئی ایسا دِل نہیں ہے کہ جو زمانے کے چکر سے سلامت بچا ہو۔

پانچواں شعر:۔ کہ میں غموں کا مارا ہوں اور جس کسی نے بھی میرا حال سُنا ہوگا وہ ضرور زاروقطار رویا ہوگا۔یعنی میری حالتِ زار کا قِصّہ سُن کر کوئی رونے سے بچ نہیں سکتا۔

آٹھواں شعر:۔ غزل کے مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ دِل کو کہاں تلاش کریں۔اِس کی حقیقت ایک قطرۂ خون سے زیادہ نہیں ہے اور ہم جو بے قراری کے عالم میں زاروقطار رور ہے ہیں، جو خون کے آنسو رور ہے ہیں، دِل بھی اُنھیں آنسوؤں میں کہیں بہہ گیا ہوگا۔

2.7 غزل نمبر 4

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے — جِس لیے ہم آئے تھے سو کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے
کیا ہمیں کام اِن گُلوں سے؟ اے صبا! — ایک دم آئے اِدھر، اُدھر چلے
شمع کی مانند ہم اِس بزم میں — چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اُس کو پرے — شیخ صاحب چھوڑ گھر، باہر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے، ساغر چلے
دردؔ! کچھ معلوم ہے؟ یہ لوگ سب — کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

2.7.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
تہمتیں	اتہام، بہتان، الزام	صبا	نہایت خوشگوار ہوا، نسیم سحر
ساقیا	شراب پلانے والا، معشوق، صنم	ساغر	پیالہ، شراب کا پیالہ، جام

2.7.2 غزل (4) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم دُنیا میں شائد تہمتیں اُٹھانے آئے تھے۔ بدنامیاں مول لینے آئے تھے کہ چند تہمتیں اپنے ذمے لگا کر اس دُنیا سے رُخصت ہو رہے ہیں۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ زندگی کوئی زندگی ہے۔ یہ تو قیامت خیز طوفان ہے اور ہم تو اِس زندگی کے ہاتھوں ہی مر چلے ہیں۔ گویا اِنسان کی موت کا سبب تو زندگی ہی ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ شمع کی طرح چشم میں آنسو لیے ہم اِس دُنیا میں آئے تھے اور گُناہوں سے دامن تر کر کے جا رہے ہیں۔ کہ شمع بھی روتی ہوئی آتی ہے اور کتنے ہی پروانوں کی موت کا سبب بنتی ہے اور اپنا دامن گناہوں سے بھر کر بلآخر بُجھ جاتی ہے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر نے تصّوف کا فلسفہ اس شعر میں بیان کر دیا ہے کہ اُس فلسفے کے مطابق اپنے باطن کو صاف کرنے کی ضرورت ہے اور خُدا کا قیام اگر کہیں ہوتا ہے تو وہ دِل ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ شیخ صاحب خُدا کو دِل کے بجائے اِدھر اُدھر تلاش کرر ہے ہیں۔ مسجدوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ گویا گھر میں ڈھونڈنے کے بجائے باہر ڈھونڈ رہے ہیں۔

ساتواں شعر:۔ غزل کے مقطع میں شاعر خود سے سوال کرتا ہے کہ کچھ علم ہے کہ یہ سب لوگ کہاں سے دُنیا میں آئے تھے اور اب دُنیا سے کس طرف جا رہے ہیں۔ گویا پیدا ہوئے تو کہاں سے آئے اور مر رہے ہیں تو کہاں جا رہے ہیں۔

2.8 غزل نمبر 5

اُس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

آجاوے ایسے جینے سے اپنا تو جی بہ تنگ
جیتا رہے گا کب تلک؟ اے خضر! مر کہیں

پھرتی رہی تڑپتی ہی عالم میں جا بہ جا
دیکھا نہ میری آہ نے روئے اثر کہیں

یوں تو نظر پڑیں ہیں تنِ افگار اور بھی
دِل ریش کوئی آپ سا دیکھا نہ پر کہیں

ظالم! جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تو، ولے
پچھتاوے پھر تو آپ ہی، ایسا نہ کر کہیں

2.8.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
خضر	حضرت خضر (جن کی طویل عمر کی مثال دی جاتی ہے)	جفا	ظلم، زیادتی
تن افگار	دکھی تن، رنجیدہ، غمگین		

2.8.2 غزل (5) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب بڑا مغرور ہے۔ کبھی سیدھے مُنہ بات نہیں کرتا، یاد کیا کرے گا۔ پر نہ جانے کیسے بھولے سے اُس نے مجھے کبھی یاد کر لیا تھا۔ یہ اُس کا اثر ہے کہ تب سے میں بے خود ہو گیا ہوں۔ خود اپنی خبر مجھے نہیں ہے۔

دُوسرا شعر:۔ خضر ایک پیغمبر جن کی نسبت مشہور ہے کہ اُنھوں نے آبِ حیات پی رکھا ہے اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ نکتہ اِس شعر میں یہ ہے کہ مسّرت کے ساتھ اگر غم نہ ہو تو خوشی کا احساس نہیں ہوتا۔ لہٰذا زندگی کے ساتھ اگر موت نہ ہو تو زندگی بے لُطف ہو جاتی ہے۔ اب شاعر حضرتِ خضر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ایسی بے لطیف زندگی کیوں کر جیتا ہے، کیوں

نہیں مرجاتے، آخر کب تک جیو گے۔ ہمارا جی تو ایسی بے لطیف زندگی جینے سے بیزار ہو جائے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے مُقدر کا اندازہ لگائیے۔ سُنتے ہیں کہ آہوں میں اثر ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے اِس دِل سے نِکلی آہیں دُنیا میں جگہ جگہ بھٹکتی پھرتی رہیں۔ اُنھوں نے کبھی اثر کا مُنہ نہیں دیکھا۔ گویا بے اثر رہیں۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ویسے تو محبت میں بہتوں کی بُری حالت دیکھی ہے، زخمی تن اُن کے دیکھے ہیں۔ لیکن آپ ایسی حالت کا عاشق کہ جس کا دِل ریشہ ریشہ ہو گیا ہو کہیں نہیں دیکھا۔

پانچواں شعر:۔ محبوب چوں کہ ظُلم کرتا ہے لہذا استعارتاً شاعر اُسے ظالم کہہ کر خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ پر تو جور وفا جو چاہے کر لے لیکن کچھ ویسا مت کرنا کہ جس پر خود تجھے بعد میں پچھتانا پڑے۔

2.9 غزل نمبر 6

آنکھوں کی راہ ہر دم اب خوں ہی رواں ہے
جو کچھ ہے میرے دِل میں، مُنھ پر مرے عیاں ہے
غنچہ ہے دِل گرفتہ ، گُل کا ہے چاک سینہ
گُلشن میں ہیں تو پر کچھ آسوُدگی کہاں ہے
آہوں کی کشمکش میں کہیں دیکھیو نہ ٹوٹے
تارِ نفس سے اے دِل! وابستہ میری جاں ہے
گُمنام اب جہاں میں مجھ سا نہیں ہے کوئی
عنقا کا نام تو ہے، ہر چند بے نشاں ہے
مت موت کی تمنّا اے دردؔ! ہر گھڑی کر
دُنیا کو دیکھ تُو بھی تُو تو ابھی جواں ہے

2.9.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
عیاں	ظاہر، کھلا ہوا، آشکارا	آسودگی	راحت، آرام، سکون، اطمینان
عنقا	نایاب، نادر، معدوم، ناپید		

2.9.2 غزل (6) کی تشریح

پہلا شعر:۔ محبوب کے ظُلم وستم کے سبب دِل کا خون ہو چُکا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ ہماری آنکھوں میں اب آنسو نہیں ہیں بلکہ اُن کی جگہ اب آنکھوں سے خون ہی بہہ رہا ہے۔ لہذا چہرے پر خون ہے۔ گویا جو حالت ہمارے دِل کی ہے وہ چہرے سے صاف ظاہر ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ دُنیا میں کوئی بھی سکون و آرام سے نہیں ہے۔ غنچے کو دیکھیے کہ وہ دِل گرفتہ ہے، رنجیدہ ہے۔ پھول کو دیکھیے کہ اُس کا سینہ بھی چاک چاک ہے۔ اب یہ دونوں گُلشن میں تو ہیں مگر اِنھیں آسودگی کہاں ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ سانسوں کے تار سے ہماری جان بندھی ہوئی ہے اور محبوب کے ظُلم وستم سے دِل بہت تکلیف میں ہے۔ لہذا آہیں نِکل رہی ہیں۔ اب اِن آہوں کی کشمکش سے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری سانسوں کا تار ہی ٹوٹ جائے اور ہمارا کام تمام ہو جائے۔

چوتھا شعر:۔ اِس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ مجھ ایسا گُم نام دُنیا میں کوئی دُوسرا نہیں ہے۔ دُنیا کی کوئی شے ایسی نہیں ہے جو میری طرح گُم نام ہے۔ جِس کا نام تک کوئی نہیں جانتا ہو۔ عنقا ایک خیالی پرندہ ہے۔ اگرچہ عنقا حقیقت میں نہیں ہے، خیالی ہے تاہم اُس کا نام تو ہے۔

پانچواں شعر:۔ اے دردؔ تو ہر گھڑی موت کی خواہش مت کیا کر۔ یہ دُنیا دیکھنے کی چیز ہے اور تُو تو ابھی جوان ہے۔ دُنیا کو دیکھ، دُنیا کی رنگینیوں کو دیکھ۔

2.10 غزل نمبر 7

گلیمِ بخت سیہ سایہ دار رکھتے ہیں	یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں
ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی	جو کچھ اُپجے ہے جی میں، سومار رکھتے ہیں
بلا ہے نشہ دُنیا کہ تا قیامت آہ	سب اہلِ قبر اُسی کا خمار رکھتے ہیں
ہمارے پاس ہے کیا؟ جو کریں فدا تجھ پر	مگر یہ زندگیِ مستعار رکھتے ہیں
وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا	اگرچہ دردِ اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں

2.10.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
گلیم	اونی کپڑا، کالین، کملی، کمل	اُپج	ابھار، نمو، نمو کی کیفیت
زندگی مستعار	چند دن کی زندگی، عارضی زندگی		

2.10.2 غزل (7) کی تشریح

پہلا شعر:۔ غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ سیا بختی کا گھنا کمبل ہم پر سایہ کیے رہتا ہے۔ گویا ہمیشہ بدبختی کا سایہ ہم پر رہتا ہے اور لے دے کے یہی ایک ہم خاکساروں کے پاس ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے مُقدر کو ہمیشہ فتح نصیب ہوئی ہے کہ جو خواہش بھی ہمارے دِل میں پیدا ہوئی ہے ہم نے اُسے مار ڈالا ہے۔

تیسرا شعر:۔ دُنیا کی رنگینیوں کا نشہ بھی بلا کا نشہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ نشہ قیامت تک نہیں اُترے گا اور سب اہلِ قبر اِسی خُمار میں قبر میں پڑے رہیں گے۔ یہاں شاعر نے صنعتِ حُسنِ تعلیل سے کام لیا ہے۔ مُردوں کو تو ویسے ہی قیامت تک نہیں اُٹھنا ہے مگر شاعر نے اِس کا جواز دُنیا کا نشہ قرار دیا ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ہم تُم پر کچھ نثار کریں تو کیا کریں کہ ہمارے پاس ہے ہی کیا جو تُم پر نثار کریں۔ فقط یہ مانگے کی زندگی ہے، گویا یہ بھی ہماری نہیں ہے۔

پانچواں شعر:۔ اے دردؔ، ہم محبوب کو اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ زندگی کی طرح ہے جو کہ ہر وقت مُسلسل حرکت میں رہتی ہے، ایک پل کے لیے بھی ہمارے پاس نہیں ٹھہرتی۔

2.11 غزل نمبر 8

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا؟ — پر اُسے آہ! کچھ اثر نہ کیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما — اِس طرف کو کبھو گزر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خُدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا تو نے، تو نے پر نہ کیا
کون سادِل ہے وہ؟ کس جس میں آہ! — خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے سامنے آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا
سب کے جو ہر نظر میں آئے دردؔ! — بے ہُنر! تو نے کچھ ہُنر نہ کیا

2.11.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
کبھو	کبھی، کسی وقت	خطر	خطرہ، خوف، ڈر

2.11.2 غزل (8) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اِس محبت میں وہ کون سی رات ہے جو ہمارے لیے عذاب نہیں لائی اور کس رات ہم نے نالے نہیں کیے۔ گویا ہر شب ہم نے شور وفغاں کیا ہے۔ مگر ہمارے محبوب پر اِس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر محبوب سے مُخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تُم سب پر کرم کرتے ہو۔ اُن کے ہاں جاتے ہو لیکن اِدھر سے گویا ہماری طرف سے کبھی بھُولے سے بھی گزر نہیں کرتے ہو۔

تیسرا شعر:۔ کہ کتنے ہی لوگ ہیں جِن کو تُمہاری بے التفاتی نے جان سے مار ڈالا ہے۔ تمہیں کچھ خُدا کا بھی خوف نہیں ہے کہ حشر میں اِس کا جواب بھی دینا پڑے گا۔

چوتھا شعر:۔ کہ ہمیں تیرے دیدار کی خواہش تھی اور یہ خواہش حسرت بن گئی، کبھی پُوری نہیں ہوئی۔ لیکن اے محبوب تُم نے کبھی ہماری خواہش کا پاس نہیں کیا اور کبھی ہمیں اپنا جلواہ نہیں دِکھایا۔

ساتواں شعر:۔ مقطعے میں شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ جوہر رکھتے تھے، ہُنر رکھتے تھے۔ اُن سب کے ہُنر روشن دِن کی طرح سب پر ظاہر ہیں۔ لیکن اے دردؔ تو، بے ہُنر تھا اور کوئی جوہر اپنے اندر پیدا نہیں کر سکا۔

2.12 غزل نمبر 9

مجھے در سے اپنے تو ٹالے ہے، یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں؟
کوئی اور بھی ہے ترے سِوا؟ تو اگر نہیں تو جہاں نہیں

پڑی جس طرف کو نگاہ یاں، نظر آ گیا ہے خُدا ہی واں
یہ ہیں گو کہ آنکھوں کی پتلیاں، مرے دِل میں جائے بُتاں نہیں

میرے دِل کے شیشے کو بے وفا! تو نے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیا
میرے پاس تو وہی ایک تھا، یہ دُکانِ شیشہ گراں نہیں

کوئی سمجھے کیوں کہ یہ مُدعا، کہ پہیلی سا ہے یہ ماجرا
کہا میں تجھے نہیں چاہ کیا؟ لگا مجھ سے کہنے کہ ہاں نہیں

تجھے دردؔ! کیوں کہ سُناؤں میں ؟ نہ خُدا کسی کو دِکھائے یہ
جو کچھ اپنے جی پہ گزرتی ہے کہوں کیا کہ اُس کا بیاں نہیں

2.12.1 فرہنگ

مشکل الفاظ **معنی**

مشکل الفاظ	معنی
مدعا	مقصد، مطلب، غرض، مراد

2.12.2 غزل(9) کی تشریح

پہلا شعر:۔ یا خُدا تو مجھے اپنے در سے ٹال رہا ہے۔ میرے یہاں نہ آنے کے حیلے کر رہا ہے۔ مگر یہ بتا کہ تُو کہاں نہیں ہے۔ کس جگہ تمہارا جلوہ نہیں ہے۔ تیرے بغیر تو دُوسرا کوئی نہیں ہے اور تیرے سبب سے تو یہ دُنیا ہے۔ اگر تُو نہیں تو پھر یہ دُنیا بھی نہیں۔

دُوسرا شعر:۔ جس طرف کو نظر اُٹھائی ہے، اے خُدا تمہارا ہی جلواہ دِکھائی دیا ہے۔ یہ خوب صورت مشعوق اگر چہ بہت عزیز ہیں تاہم ہمارے دِل میں اُن کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ گویا ہمارا دِل آشنائے خُدا ہے اور دُوسرا اِس میں نہیں آسکتا۔

تیسرا شعر:۔ میرے اِس دِل کو جو شیشے کی طرح نرم اور نازُک تھا، اے بے وفا یعنی بے وفا محبوب تُم نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ کیوں کہ تُم نے اِسے توڑ دیا ہے۔ اب میں یہ دِل، یہ آئینہ کہاں سے لاؤں کہ میرے پاس تو یہی ایک تھا جو تُم نے توڑ دیا ہے۔ کوئی شیشہ بنانے کی دُکان نہیں تھی جو بنا لیتے۔ اب کیسے گزرے گی۔

چوتھا شعر:۔ ہمارے محبوب کا مُدعا، مطلب کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ یہ تو پہیلی کی طرح کا ماجرا ہے، جس کو سمجھنا نہایت مُشکل ہے۔ میں نے جو اُس سے پُوچھا کہ تُمھیں ہم سے محبت نہیں ہے؟ تو کہنے لگا کہ ہاں نہیں ہے۔ اب اُس شاطر محبوب کو ہم سے محبت ہے کہ نہیں کوئی کیوں کر جانے۔ بہ یک وقت ہاں بھی کہتا ہے نہیں بھی کہتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ اے دردؔ، میں تُمھیں کیسے سُناوں، نہیں سُنا سکتا کہ ہمارے دِل کا حال کیا ہے۔ کیا حالت ہے ہمارے دِل کی۔ کہ دُنیا کی کوئی زبان اِس حالت کو بیان کر ہی نہیں سکتی۔ جو کچھ ہمارے دِل پر گُزر رہا ہے خُدا کرے وہ کسی دِل پر نہ گزرے۔

2.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ خواجہ میر دردؔ کے حالات زندگی قلم بند کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ خواجہ میر دردؔ کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ خواجہ میر دردؔ کے صوفیانہ خیالات کی وضاحت کیجئے۔

سوال نمبر 4:۔ خواجہ میر دردؔ ایک صوفی شاعر تھے! کی وضاحت کیجئے۔

سوال نمبر 5:۔ خواجہ میر دردؔ کے فلسفہ تصوف پر روشنی ڈالیئے۔

سوال نمبر 6:۔ خواجہ میر دردؔ کی غزلیات کی تشریح معہ حوالہ کیجئے۔

2.15 کتابیات

1 خواجہ میر دردؔ (کتابیات)، از ڈاکٹر الف، دنسیم ،مطبوعہ، ادارہ قومی زبان، اسلام آباد۔

2 خواجہ میر دردؔ (تنقیدی و تحقیقی مطالعہ، مرتبین، ثاقب صدیقی، انیس احمد، مطبوعہ، مرکزی پرنٹرز، چوڑی والان

3 خواجہ میر دردؔ، از ظہیر احمد صدیقی ،مطبوعہ، ترقی اردو بیورو، نئ دہلی

4 دیوانِ خواجہ میر دردؔ، مطبوعہ، اردو مرکز بلیماران، دہلی۔

5 خواجہ میر دردؔ (مونوگراف)، از قاضی عبید الرحمان ہاشمی ،مطبوعہ، اردو اکادمی دہلی۔

6 خواجہ میر دردؔ، تصوف اور شاعری، از ڈاکٹر وحید اختر ،مطبوعہ، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

7 خواجہ میر دردؔ، ہندستانی ادب کے معمار، از قاضی جمال حسین ،مطبوعہ، ساہتیہ اکادمی، دہلی

اکائی نمبر3

میر تقی میرؔ کی غزلیات اور شرح

ساخت:

3.1 سبق کا تعارف

3.2 سبق کا ہدف

3.3 میر تقی میرؔ کی حیات اور غزل گوئی

3.4 غزل نمبر1

3.4.1 فرہنگ

3.4.2 غزل کی تشریح

3.5 غزل نمبر2

3.5.1 فرہنگ

3.5.2 غزل کی تشریح

3.6 غزل نمبر3

3.6.1 فرہنگ

3.6.2 غزل کی تشریح

3.7 غزل نمبر4

3.7.1 فرہنگ

3.7.2 غزل کی تشریح

3.8 غزل نمبر 5

3.8.1 فرہنگ

3.8.2 غزل کی تشریح

3.9 غزل نمبر 6

3.9.1 فرہنگ

3.9.2 غزل کی تشریح

3.10 غزل نمبر 7

3.10.1 فرہنگ

3.10.2 غزل کی تشریح

3.11 غزل نمبر 8

3.11.1 فرہنگ

3.11.2 غزل کی تشریح

3.12 غزل نمبر 9

3.12.1 فرہنگ

3.12.2 غزل کی تشریح

3.13 غزل نمبر 10

3.13.1 فرہنگ

3.13.2 غزل کی تشریح

3.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

3.15 کتابیات

3.1 سبق کا تعارف

میر ان شعراء کرام میں سے ہیں، جو اپنی حقیقت کو خود خوب پہچانتے تھے۔اسی لئے اکثر اپنے اشعار میں شاعرانہ تعلّی کا اطلاق کیا ہے۔اپنے لئے فرماتے ہیں۔

سب دیئے ہیں میر کو جگہ اپنی آنکھوں پہ
اس خاک رہ عشق کا اعزاز تو دیکھو

میر تقی میر اردو شاعری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جو اردو شاعری کا سنہری دور کہلاتا ہے۔یہ اردو شاعری کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو میر جیسا صاحب طرز، صاحب اسلوب اور غم کو آفاقیت بنا دینے والا شاعر نصیب ہوا۔اسی لیے ''آب حیات'' میں مولانا محمد حسین آزاد رقم طراز ہیں، کہ میرؔ نے اپنی مشہور کتاب ''نکات الشعراء'' میں اس دور میں صرف دو شعراء کو تسلیم کیا جن میں خود ایک، دوسرے سوداؔ مگر کسی کے پوچھنے پر دردؔ کو بھی آدھا شاعر تسلیم کر لیا۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

3.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں میر تقی میرؔ کے حالات زندگی اور غزل گوئی کے علاوہ ان کی غزلیات کی تشریح شامل ہے جس کا مقصد طلبا کو میر تقی میرؔ کے کلام کو سمجھانے اور پڑھانے کا ہے۔

3.3 میر تقی میرؔ کی حیات اور غزل گوئی

حالاتِ زندگی:۔ میر محمد تقی نام اور میرؔ تخلص تھا۔ ۲۲ے۱ء میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔میرؔ کے دادا شاہی فوج میں فوجدار تھے اور والد میر متقی علی مشہور صوفی بزرگ تھے۔دس بارہ سال ہی کی عُمر تھی کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔میرؔ نے خود اس

قصّے کا ''ذکرِ میرؔ'' میں بڑے دِل خراش انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ وہ لوگ جواُن کے والد کے ہوتے اُن کے پاؤں کی مٹی کوسُرمے کی طرح آنکھوں سے لگاتے تھے، باپ کی موت ہوتے ہی روگردانی کرنے لگے۔ سوتیلے بھائی نے جوسلُوک میرؔ سے کیا، کوئی دُشمن بھی نہیں کرتا۔ ساری جائیداد ہڑپ لی۔ اُن کے اس سلُوک کی وجہ سے میرؔ کا بچپن بڑی مصُیبتوں میں گُزرا۔ میرؔ کو چھوٹی سی عُمر میں تلاشِ معاش کے لیے دہلی جانا پڑا۔ وہاں کسی طرح اُن کی رسائی صمام الدولہ تک ہوئی۔ اُنھوں نے میرؔ کے لیے ایک روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ میرؔ آگرہ لوٹ آئے۔ یہ وظیفہ مُشکل سے ایک سال چلا ہوگا کہ نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر دیا اور اُس میں صمام الدولہ مارے گئے۔ میرؔ کو دوبارہ آگرہ چھوڑنا پڑا۔ لیکن کہتے ہیں کہ اِس بار میرؔ کو کسی دوشیزہ سے عشق ہوگیا تھا جس کی یاد اُنھیں عُمر بھر ستاتی رہی۔ اب کی بار وہ دہلی آئے نے فن کارانہ انداز میں پیش کر کے امتیازی خصوصیت حاصل کر لی۔ میرؔ دہلی آ کر اپنے سوتیلے بھائی کے ماموں سراج اتو غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے تھے۔ یہی دو غم میرؔ کی شاعری کا سانحہ بن گئے۔ یہ وہ حقیقتیں تھیں جن کو میرلدین خان آرزوؔ کے ہاں ٹھہرے۔ وہ خود اچھے شاعر تھے۔ میرؔ نے اُن کے فیض سے بہت کچھ حاصل کیا۔ میرؔ کو یہاں بھی زیادہ دیر فراغت حاصل نہ ہوسکی۔ میرؔ ''ذکرِ میرؔ'' میں لکھتے ہیں کہ آرزوؔ بڑے بھلے آدمی تھے مگر جیسے ہی سوتیلے بھائی نے خط لکھا کہ میرؔ فتنۂ روزگار ہے۔ اِس کی ہرگز تربیت نہ کی جائے تو وہ بھانجے کی بات نہ ٹال سکے اور میرؔ پر طرح طرح کے ظُلم ڈھانے لگے۔ اِس دوران میں میرؔ پر جنوں کی حالت طاری ہوگئی۔ اُنھیں چاند میں کوئی حسین چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ ہر وقت پاگلوں کی طرح رہنے لگے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وہ یہاں بھی کچھ زیادہ خوش نہ رہ سکے۔

اِن تمام واقعات نے اور ان تمام مصائب نے اس طرح اثر کیا کہ اُن کی آہیں اثر کرنے لگیں۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ دُرانی نے دہلی پر حملہ کیا اور جو کچھ کسر اُس سے رہ گئی احمد شاہ ابدالی نے پُوری کر دی۔ دہلی تباہ ہوگئی۔

بقول میرؔ دہلی کی حالت اُس بیوہ کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں تھی مگر بیواؤں سے کہیں بدتر زندگی بسر کر رہی تھی۔ ایک ایک کر کے تمام شاعر دہلی چھوڑ رہے تھے۔ میرؔ کو بھی دہلی چھوڑنا پڑی۔ میرؔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں کافی عزت مِلی۔ بات کم کرتے تھے اور آہستہ آہستہ۔ مزاج میں قناعت اور خودداری ضرورت سے زیادہ

تھی۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ وہ کہیں خود کو ایڈ جسٹ نہیں کر پائے۔ اِس بات کا اُنھیں شدت سے احساس بھی تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

حالت تو یہ ہے مُجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دِل سوزشِ دردنی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے مجلسوں میں نام مرا مؔیر بے دماغ

اِس حد سے زیادہ بدمزاجی کی وجہ سے اکثر دُکھ اُٹھاتے، فاقے کرتے لیکن اپنے اِس مزاج کے باعث کسی کے آگے دستِ سوال نہیں پھیلاتے۔ اکثر اہل دُنیا سے بیزار رہتے۔ آپ کا اِنتقال ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں ہوا اور وہیں مزار بھی ہے۔

کلام کی خصوصیات اور غزل گوئی میں اُن کا مقام:۔

یوں تو مؔیر نے قریب قریب تمام اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل اُن کی مخصوص چیز ہے اور اُس میں اُن کا رُتبہ بہت بُلند ہے۔ تغزل کو جس کامیابی اور خوش اسلُوبی سے مؔیر صاب نے نبھایا ہے وہ اُن ہی کا حِصّہ ہے اور اِس سبب سے اُن کی انفرادیت و اہمیت قائم و دائم ہے۔ اُن کے اشعار میں حقائق، سوز و گداز، نشتریت، سلاست، روانی، شیرینی وغیرہ کی کیفیتیں بہت پائی جاتی تھیں۔ اُن کے کلام میں سادگی اور صفائی اِتنی زیادہ ہے کہ بلا غور و فکر اشعار ذہن میں سما جاتے ہیں اور دِل میں نشتر کی طرح اُتر جاتے ہیں۔ نفسِ جذبات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کلام میں اُس دل کی وارداتیں ہیں، جس پر عشق کا پُورا وار ہو چکا ہے۔

برائے بیان مؔیر نے قصائد بھی کہے ہیں۔ لیکن وہ سؔودا سے بہت پیچھے ہیں۔ اُس کا سبب شاید یہ رہا ہو کہ اُن پر درد اور یاس کا غلبہ ہے جو قصیدے کے لیے کار آمد نہیں۔ مثنوی نِگاری میں مؔیر صاحب کو کامیابی ہوئی۔ وہ وارداتِ عشق نہایت عُمدہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں مگر منظر نِگاری پر قُدرت نہیں رکھتے۔ مؔیر کی زبان صاف، شُستہ اور پاکیزہ

ہے۔ دِل کے خیالات کو جذبے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں نہایت عُمدگی سے ادا کر دیتے ہیں اور پھر زبان میں اللہ تعالیٰ نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اِس واسطے اِن کی شاعری میں دیگر شعراء کے مقابلے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ اِن تمام باتوں کے باوجود میرؔ اچھی مثنویاں لکھنے کے باوصف مثنوی نِگاری میں میر حسن تک نہیں پہنچ سکے۔ البتہ غزل میں جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے میرؔ کا مدِ مقابل شاید ہی کوئی دُوسرا شاعر ہو۔

میرؔ اُردو زبان کے بہت بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے اُستادوں نے اُن کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ غالبؔ اور ناسخؔ سے لے کر جدید شاعروں تک مختلف شعراء نے اُن کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ غالب ایک جگہ لکھتے ہیں:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

اور

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ذوقؔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میرؔ کے کلام کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے۔ ایک دیوان فارسی اور چھ اُردوٗ کے دیوان ہیں۔ بہت سی مثنویاں ہیں۔ ایک رسالہ نیضِ میرؔ، ایک تذکرہ ''نکات الشعرا'' اور ''ذکرِ میر'' (خودنوشت سوانحِ عُمری) اُن کی یادگاریں ہیں۔ اُردوٗ دیوان میں غزلوں کے علاوہ رُباعی، مخمس، ترجیع بند، مسدّس، مرثیے وغیرہ سب کچھ ہے۔ میرؔ صاحب کی شاعری اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اُردوٗ زبان میں نہ صرف ممتاز حیثیت رکھتی ہے بلکہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ الفاظ کا صحیح استعمال کہ جس

طرح کی بات یا مضمون ہوگا اُسی طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جس سے دِل کشی اور تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً ایک شعر میں کہتے ہیں:

ہم خاک میں مِلے تو مِلے لیکن ایک سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

یہاں وہ سپہر کی جگہ آسمان یا فلک کا لفظ بھی لا سکتے تھے۔ مگر آسمان و فلک سے چونکہ ظلم و ستم منسوب ہیں لہذا سپہر کا لفظ لاکر میرؔ نے شعر میں وسعت پیدا کردی ہے۔ اِسی طرح ایک جگہ موقع یہ ہے کہ میرؔ نہایت تکلیف میں ہیں۔ بہ مُشکل نیند آئی ہے۔ اب کہتے ہیں کہ بھائی اُس بیمار کے پاس آہستہ بولو کہ وہ جاگ نہ جائے۔ بات آہستہ بولنے کی تھی۔ لہذا چاہئے تھا کہ الفاظ بھی ویسے ہی استعمال کیے جائیں کہ ہلکی سی زبان کی جنبش سے ادا ہو جائیں۔ اب دیکھئے میرؔ نے کِس طرح زبان کے استعمال کا حق ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میرؔ کے کلام کی ایک اور نُمایاں خوبی اُن کے کلام کا وہ دور ہے کہ جس کو پڑھنے سے دِل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ اور جو لُطف سے خالی نہیں ہوتی۔ اُن کی زبان کی سادگی اور وضاحت، سوز و گداز، مضامین کی جدّت اور تاثیر ایسی خوبیاں ہیں جو اُردوٗ کے کسی دُوسرے شاعر میں نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری عاشقانہ ہے۔ مگر کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی، صفائی اور خوبی سے ادا کرتے ہیں جس پر ہزار بُلند پروازیاں، نازک خیالیاں قُربان ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چُور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہِ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کے سر پر غُرور تھا

ایک جگہ کہتے ہیں:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

میرؔ کے شاعرانہ جلال کی وجہ سے اُن کو خدائے سُخن کہا جاتا تھا۔ میرؔ کے اسلُوب کو اُن کی شخصیت ہی کا ایک حِصّہ خیال کرنا چاہئے۔ اُنھوں نے یہ لہجہ اور اندازِ بیان خود کو مٹا کر حاصل کیا ہے اور اُن کے کردار کی ہم آہنگی ہی سے اس میں وہ جلا اور درد پیدا ہوا ہے۔

میرؔ کی عشقیہ شاعری میں اُن کی ناکامی اور محرومی کا احساس بھی موجود ہے۔ اُن کا یہ احساسِ غم زندگی کی بُنیادی حقیقت ہے۔ میرؔ ناکام ہوتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے۔ اُن کے غم میں ایک ٹھہراؤ کی کیفیت، ضبط اور خودداری کا احساس موجود ہے۔ اُنھوں نے آلامِ روزگار، آرام اور عیش پر فتح حاصل کر لی ہے۔

میرؔ ذہن کو درد اور تاثیر کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ وہ عالم ہے جہاں غم اور مسرّت کی دھوپ چھاؤں ہے اور وضاحت وسراحت کے بجائے استعارہ اور کنایہ کی حکومت ہے۔ میرؔ کے کلام کی دل آویزی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ بات دِل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرؔ اُردوٗ غزل کا بے تاج بادشاہ ہے جس نے اُردوٗ کے تمام غزل گو شعراء کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا ہے اور جس کی عظمت کا لوہا پوُری اُردوٗ دُنیا نے تسلیم کیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

جب نام تیرا لیجیے، تب چشم بھر آوے
اِس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

....

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گُلاب کی سی ہے
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا

دم کے جانے کا نہایت غم رہا

....

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

....

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اِس آخری شعر میں انا کی حد ہوگئی ہے۔ اپنی بابت فرمانا کا لفظ میرؔ اور صرف میرؔ کو زیب دیتا ہے۔

3.4 غزل نمبر1

ہستی اپنی حباب کی سی ہے	یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازُکی اُس کے لب کی کیا کہیے	پنکھڑی اِک گُلاب کی سی ہے
بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں	حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز	اُسی خانہ خراب کی سی ہے
میرؔ! اُن نیم باز آنکھوں میں	ساری مستی شراب کی سی ہے

3.4.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
حباب	پانی کا بلبلا،	نمائش	دکھاوا،ظہور،نموداری،
سراب	وہ ریت جس پر دور سے پانی کا دھوکا ہوتا ہے	اضطراب	بے چینی، بے قراری

3.4.2 غزل(1) کی تشریح

پہلا شعر:۔ میرؔ زندگی کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے اِس شعر میں کہتے ہیں کہ اِنسان کی زندگی بڑی مُختصر ہے۔ایک بُلبُلے کی مانند ہے کہ جو پل میں ختم ہو جاتا ہے۔اِس کی ساری نمائش اور رنگینی سراب کی مانند ہے۔یعنی دھوکا ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر محبوب کی خوب صورتی کا تذکرہ کر رہا ہے۔ہونٹوں کا نازُک ہونا خوب صورتی کی دلیل ہے۔اب شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کے ہونٹ اِتنے نرم و نازُک ہیں کہ بیان مُشکل ہے۔اُنھیں گُلاب کی پنکھڑی کہیں تو بجا ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میری حالت اِس قدر بے قرار ہوگئی ہے کہ مایوسیوں اور ناکامیوں کے باوجود میں بار بار

محبوب کے در پر جاتا ہوں اور اِس طرح اپنی خواری کا سامان کرتا ہوں۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ محبت میں ہم نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ ہم آوارہ ہو گئے۔ اب محبوب اِسی حوالے سے طنز کرتا ہے کہ میری آواز سُنتے ہی اُس نے فوراً کہا کہ یہ آواز تو اُسی کانہ خراب کی لگتی ہے۔

پانچواں شعر:۔ مقطعے میں شاعر کہتا ہے اے میرؔ محبوب کی اُن نیم باز گویا آدھی کھُلی آدھی بند آنکھوں میں وہ کیفیت ہے جسے پُورے مے خانے کی مستی ان میں سما گئی ہے۔

3.5 غزل نمبر 2

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا

ہوش جاتا نہیں رہا، لیکن — جب وہ آتا ہے، تب نہیں آتا

صبر تھا ایک مونسِ ہجراں — سو وہ مُدت سے اب نہیں آتا

دِل سے رُخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

3.5.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
مونس ہجراں	غم بانٹنے والا، ساتھی	گریہ	اشک باری، رونا، آنسو بہانا

3.5.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ محبت میں اُس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ہر وقت آنکھوں سے اشک جاری رہتے ہیں اور جب آنکھوں سے آنسو بہنا بند ہو جاتے ہیں تو دِل کی حالت اور بھی خراب ہو جاتی ہے اور آنکھوں سے لہُو گویا خون کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ویسے تو ہم ہوش میں رہتے ہیں لیکن جیسے ہی محبوب سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ یعنی وہ جب سامنے آتا ہے تو نہ جانے کون سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ کہ محبوب کی جُدائی میں ایک صبر ہی تھا جو ہمارے ساتھ تھا۔ گویا ہم میں صبر کا مادہ تھا اور ہم اُس جُدائی کو برداشت کر پاتے تھے۔ مگر اب ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ صبر بھی ساتھ چھوڑ گیا ہے۔

3.6 غزل نمبر 3

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دِل — سارے عالم میں، میں دِکھا لایا
دِل، کہ یک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی — اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا
دِل، مجھے اُس گلی میں لے جا کر — اور بھی خاک میں مِلا لایا
اب تو جاتے ہیں مے کدے سے میؔر — پھر ملیں گے، اگر خُدا لایا

3.6.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
متاع	مال واسباب، سرمایہ، پونجی	گرانی	بوجھ، وزنی، بھاری پن

3.6.2 غزل (3) کی تشریح

پہلا شعر:۔ کہ دِل کی دولت کچھ ایسی نہیں جو ہر کسی کے پاس ہو اور اسے جانچنے کے لیے جس نظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی سوائے عاشق کے کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ لہذا شاعر کہتا ہے کہ یہ انمول دِل کی دولت بھی اہلِ جہاں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں اِس دولت کو سارے جہان میں دِکھا لایا ہوں۔ نہ کسی نے اِس کو پہچانا اور نہ ہی کسی نے اِس کا مول ہی لگایا۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ دِل ہے جو تمام آفتوں کی جڑ ہے۔ یہ ایک جہان کے سر بلائیں نازل کرتا ہے۔ اور اِس کی حقیقت یہ ہے کہ محض ایک قطرۂ خوں ہے۔ اِس سے زیادہ نہیں۔ بقولِ غالب:۔

بہت شور سُنتے تھے پہلو میں دِل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نِکلا

تیسرا شعر:۔ عشق میں بڑی مُصیبتیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ اِس کا بوجھ وہ نہیں جس کو ہر کس و نا کس اُٹھا لے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ عشق کا بوجھ جو سب کے لیے گراں تھا، کسی سے اُٹھ نہیں پایا۔ اُس بھاری عشق کے بوجھ کو میں ناتواں اُٹھا لایا ہوں۔ گویا میں نے عشق کیا، اُس کی تکلیفوں کو جھیلا ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے عشق نے ہم کو پہلے ہی خاصا رُسوا کر رکھا ہے۔ اب دِل کی بے قراری ہے کہ وہ چین نہیں لینے دیتی۔ لہٰذا اُس نے محبوب کے کُوچے میں جانے کے لیے مجبور کر دیا۔ اور نتیجہ وہی نِکلا کہ ہم سرُخرو نہیں ہو پائے بلکہ اور بھی خاک میں مِل گئے، رُسوا ہو گئے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اب تو اِس دُنیا کے مے کدے سے جا رہے ہیں۔ یعنی دُنیا سے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر خُدا نے چاہا اور وہ دُنیا میں دوبارہ لایا تو پھر ملیں گے۔

3.7 غزل نمبر 4

غم رہا، جب تک کہ دم میں دم رہا
دِل کے جانے کا نہایت غم رہا

دِل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

جامۂ احرامِ زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں، لیک نا محرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مُدت تک وہ کاغذ نم رہا

صُبح پیری، شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ چیتا، یاں بہت دِن کم رہا

3.7.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
مژہ	پلک، پپوٹا	جامہ احرام	وہ بن سلا کپڑا جو حاجی زیب تن کرتے ہیں

3.7.2 غزل (4) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ درد والم ہماری زندگی کا حِصّہ رہا ہے۔ جب تک دم میں دم رہا یعنی سانسیں چلتی رہیں، غم نے ہمیں سکُون میّسر نہیں ہونے دیا۔ اِس پر محبت میں دِل کھو دیا۔ اب اِس دِل کے جانے کا غم اِتنا شدید تھا کہ زندگی عذاب ہو گئی۔

دُوسرا شعر:۔ یہ دِل ہے جو طرح طرح کی بلائیں نازل کرتا ہے۔ کبھی چین سے بسر نہیں کرنے دیتا۔ شاعر کہتا ہے کہ اب اِس دِل کی حقیقت کُھلی ہے۔ جو محض ایک خون کا قطرہ تھا کہ آنسو بن کر آنکھ سے نِکلا تو دامن تک بھی نہ پہنچ پایا۔ پلکوں پر آ کر ہی جم گیا۔

تیسرا شعر:۔ ظاہری لباس کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ محض دِکھاوا ہے۔ اصل حقیقت دِل کی ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ زاہد کے پاکیزہ لِباس پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دھوکا ہے کہ وہ کعبے میں ہوتے ہوئے بھی اُس سے نامحرم ہے۔ گویا کعبے کی عظمت سے روشناس نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ میؔر کہتے ہیں کہ ہماری زندگی رنج والم میں گزری۔ رونا ہمارا مُقدر ہو گیا۔ زندگی بھر روئے اور بہت روئے۔ اِتنا روئے کہ اپنی زندگی کی تلخیوں اور رونے کی کہانی کو جس کاغذ پر ہم نے رقم کیا تھا وہ بھی ایک عرصے تک گیلا رہا۔ گویا ہمارے رنج والم اور رونے کی شدت سے بے جان کاغذ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ بچپن اور جوانی تو خیر گُزر چُکے ہیں۔ اُس میں آخرت کا نہ سوچا تو نہ سہی۔ مگر اے میؔر تمھارا تو اب بوڑھاپا بھی ختم ہونے کو جا رہا ہے لیکن تُم نے آخرت کی خبر نہیں لی۔ یہ نہیں چیتا یعنی سوچا کہ زندگی کے دِن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔

3.8 غزل نمبر 5

جس سر کو غرُور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زِنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
لے سانس بھی آہستہ ، کہ نازُک ہے بہت کام
آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری کا

3.8.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
تاج وری	بادشاہت،سلطنت	نوحہ گری	آہ وزاری، رونا، بین کرنا، ماتم،گریہ وزاری
آفاق	دنیا،عالمگیر	اسباب	مال ودولت، سرمایہ، جاگیر
زنداں	جیل خانہ،قیدخانہ	شورش	شوروغل، چیخ وپکار، اودھم
سنگ مداوا	پتھر مارنے سے علاج	آشفتہ	برہم، دیوانگی، پریشان، فریفتہ، عاشق

3.8.2 غزل (5) کی تشریح

پہلا شعر:۔ میؔر اکثر اخلاقی مضامین بھی اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں۔ یہ شعر بھی اِسی نوعیت کا ہے۔ زندگی کو چونکہ ثبات نہیں ہے۔ اِس لیے کسی بھی طرح کا غرور بے جا ہے۔ اب میؔر کہتے ہیں کہ جس اِنسان کو آج اس بات پر گھمنڈ ہے کہ وہ صاحبِ تاج وتخت ہے، اُس کے سر پر تاج ہے۔ اُسے کیا معلوم ہے کہ وہ کل مرجائے گا اور اُس کی موت پر نوحہ گری کا شور بپا ہوگا۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اِس مسافر خانے سے کوئی سلامت آخرت کا سفر نہیں کرسکتا۔ جو کچھ مال ودولت جمع کیا ہوتا ہے، راستے ہی میں لُٹ جاتا ہے۔ گویا یہیں رہ جاتا ہے۔ لہذا زندگی میں آخرت کی فکر ضروری ہے کہ نیک اعمال ہی ساتھ جاتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ محبت میں دِل کی بے قراری، دیوانگی کی حد کو پہنچ گئی ہے۔ ہمارے شورش اور ہنگامے سے تنگ آکر ہمیں زنداں میں ڈال دیا گیا۔ لیکن اِس سے بھی ہماری بے قراری کم نہیں ہوئی۔ زنداں میں بھی نہ ہماری دیوانگی میں کوئی فرق پڑا اور نہ شور وہنگامے کم ہوئے۔ شاعر مزید کہتا ہے کہ اب ہماری اِس دیوانگی کا سنگ باری ہی علاج ہے۔ (پُرانے زمانے میں دیوانگی کو خون کی خرابی خیال کرتے تھے اور وہ گندا خون نکلنے کو اِس کا علاج۔)

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہماری ایک بار جس سے آنکھ لڑ گئی پھر اُسی کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں۔ اُسی سے آنکھ ملاتے ہیں، اُسی کو دیکھتے ہیں۔ ہر کسی سے آنکھ لڑانا ہمارا شیوہ نہیں ہے۔ یہ چسکا تو آئینے کو ہے۔ وہ ہر کسی کو دیکھتا ہے۔ شاعر نے صنعتِ حُسنِ تعلیل سے کام لیا ہے۔ آئینے کے سامنے جو جائے گا وہ اُس کو اُس کی صورت دِکھائے گا۔ شاعر نے اُس کے صورت دِکھانے کو دیکھنے اور اُس کی خصوصیت کو چسکے سے تعبیر کیا ہے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ دُنیا میں دِل جوڑنے کا کام بہت نازُک ہے۔ اِس کو شاعر شیشہ گری سے تعبیر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اِتنا نازُک کام ہے کہ تیز سانس لینے سے بھی کبھی کبھی کام بگڑ جاتا ہے۔ یعنی دِل ٹوٹ جاتا ہے۔ لہذا بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

3.9 غزل نمبر 6

عشق میں بے خوف وخطر چاہیے — جان کے دینے کو جگر چاہیے
حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے — اُٹھتے پلک اِک پہر چاہیے
کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دِل — اِس کے پرکھنے کو نظر چاہیے
عشق کے آثار ہیں اے بوالہوس — داغ بہ دِل، دست بہ سر چاہیے
شرط سلیقہ ہے ہر اِک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہُنر چاہیے

3.9.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
ضعف	بے ہوشی، غشی	دست	ہاتھ

3.9.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر:۔ عشق کا راستہ بڑا پُر خطر ہوتا ہے۔ اِس پر چلنے والے کو قدم قدم پر صبر آزما امتحانوں سے گُزرنا پڑتا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ عشق میں جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں اور جان دینے کے لیے بڑے جگرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا جو کوئی عشق کے اِس میدان میں قدم رکھے، اُس کے دِل میں خوف، ڈر بالکل نہ ہو اور بڑا حوصلہ رکھتا ہو۔

دُوسرا شعر:۔ کہ محبت میں جو حال دِل کا ہوا ہے اُس سے کمزوری و بے ہوشی کا سا عالم رہتا ہے۔ اب ہماری یہ کمزوری اِس حال کو پہنچ چکی ہے کہ پلک اُٹھانے یعنی آنکھ کھولنے کی بھی سکت باقی نہیں رہی ہے اور اِس کے کھولنے کو ایک مُدّت چاہیے ہوتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ محبت میں دِل کے داغ دراصل عاشق کا سرمایہ ہیں۔لیکن ہر کوئی اِس کی عظمت کو پہچان نہیں سکتا۔اِس کے پرکھنے کے لیے جس نظر کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت کم لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے بولہوس، اے لالچی اِنسان، تجھے کیا معلوم کہ عشق کیا ہے؟ دِل پر صدمے اُٹھانا اور سر پر ہاتھ دھر کر ہر وقت سرگرداں رہنا عشق کی علامتیں ہیں۔لیکن تجھے اِس سے کیا واسطہ۔تُو تو ہر وقت ہوس کا رر ہتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر کام میں سلیقہ پہلی شرط ہے۔سلیقے کے بغیر کوئی کام درُست نہیں ہوتا۔سلیقہ ایک ہُنر ہے اور ہر کام کے لیے ضروری ہے۔یہاں تک کہ عیب کرنے کے لیے بھی اِس ہُنر کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

3.10 غزل نمبر 7

جب نام تیرا لیجئے، تب چشم بھر آوے — اِس زندگی کرنے کو، کہاں سے جگر آئے

واعظ نہیں کیفیتِ مے خانہ سے آگاہ — یک جرعہ بدل ورنہ یہ مندیل دھر آوے

صناع ہیں سب خوار، ازاں جُملہ ہوں میں بھی — ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہُنر آوے

اے وہ! کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ، یہ زنہار — کہیو! کبھو جو مِیؔر بلاکش اِدھر آوے

ق

مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو — ہر گام پہ اِس رہ میں سفر سے عذر آوے

3.10.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
چشم	آنکھ، نظر	واعظ	نصیحت کرنے والا، پندگو، ناصح

جرعہ	گھونٹ	مندیل	پگڑی، رومال، عمامہ، چھوٹی دستار
صناع	ہنر مند، ماہرِفن	خوار	ذلیل، رسوا، بے عزت
ازاں جملہ	ان میں سے، منجملہ	زنہار	نفی سے آگاہ کرنے والا، حاشا، ہرگز
گام	قدم، چال	عذر	بہانہ، ٹال مٹول، چوں و چرا، معذرت

3.10.2 غزل(7) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر محبوب سے مُخاطب ہے، کہتا ہے کہ تمھاری جفا اور بے وفائی سے ہمارا حال اب اُس منزل کو پہنچ گیا ہے کہ جب تمھارا نام تک بھی زبان پر آتا ہے تو ہماری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اب وہ حوصلہ ہم کہاں سے لائیں کہ ایسی زندگی جی سکیں۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ واعظ، وعظ کرتا ہے، نصیحت کرتا ہے اور شراب پینے سے منع کرتا ہے۔ دراصل وہ اس شراب کی مستی اور مے خانے کی کیفیت سے واقف نہیں ہے۔ اگر شراب خانے کی کیفیت سے وہ آگاہ ہوتا تو شراب کے ایک گھونٹ کے لیے وہ اپنی پگڑی تک گِروی رکھ دیتا۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ تمام ہُنر مند اِس زمانے میں خوار ہیں اور چوں کہ میں بھی ہُنر رکھتا ہوں، اِس لیے میں بھی بدنام ہوں۔ دراصل اِس دُنیا میں ہُنر مند ہونا ہی سب سے بڑا عیب ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ تُم سرِ راہ بیٹھے اگر کہیں دُکھ اور مُصیبت برداشت کرنے والے یعنی مؔیر کو اِس طرف سے نکلتے دیکھو تو اُس سے کہنا کہ ٹھیک ہے، تُم دُکھ برداشت کر سکتے ہو۔ مگر ہرگز ہرگز اِس محبت کے دشت میں قدم مت رکھنا کہ یہ وہ جنگل ہے کہ جِس میں حضرتِ خضر کو بھی سفر کرنے میں دِقت ہو۔ اور ہر قدم پر وہ سفر سے باز آنے کا بہانہ کریں۔

3.11 غزل نمبر 8

اُس کا خرام دیکھ کے، جایا نہ جائے گا — اے کبک ، پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا

ہم رہروانِ راہِ فنا ہیں ، بہ رنگ عُمر — جاویں گے ایسے،کھوج بھی پایا نہ جائے گا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دِل — تو صُبح تک، تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

اب دیکھ لے، کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک — پھر ہم سے اپنا حال دِکھایا نہ جائے گا

یاد اُس کی اِتنی ،خوب نہیں میرؔ ! باز آ — نادان! پھر وہ جی سے بھُلایا نہ جائے گا

3.11.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
خرام	نازوانداز کی چال،نرم رفتار		

3.11.2 غزل(8) کی تشریح

پہلاشعر:۔ شاعر کبک بری سے مُخاطب ہے۔مشہُور ہے کہ اُس کی چال بڑی دِل کش ہوتی ہے۔اب شاعر اُس سے کہتا ہے کہ میرے محبوب کا خرام یعنی ناز وادا بھری چال ایسی ہے کہ اُس کو دیکھنے کے بعد تُم سے جایا نہیں جائے گا، چلنا تو دُور کی بات ہے۔تُم اُس میں اِس قدر کھو جاؤ گے کہ اپنے حال میں واپس آنا بھی مُشکل ہوگا۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم راہِ فنا کے مُسافر ہیں اور عُمر کی مانند کہ جو گُزر گئی اُس کا نِشاں بھی باقی نہیں رہتا۔ایسے گُزر جائیں کہ پھر ڈھونڈ پانا ممکن نہیں ہوگا۔

تیسرا شعر:۔ محبت کے رنج والم میں دِل ہے کہ ایک پھوڑے کی صورت اِختیار کر چُکا ہے۔اب شاعر کہتا ہے کہ اگر رنج و

غم کی یہی صورت رہی اور ساری رات یہ دِل پھوڑے کی طرح پکتا رہا تو صُبح تک اُس کی حالت نا قابلِ برداشت ہو جائے گی۔اِس کو ہاتھ تک نہیں لگایا جا سکے گا۔

چوتھا شعر:۔ شاعر محبوب سے مُخاطب ہے۔کہتا ہے کہ ہمارے دِل کی حالت اگر تُم دیکھنا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ ابھی تازہ ہی سینہ چاک ہوا ہے۔پھر اس کے بعد ہم سے دِکھایا نہیں جا سکے گا۔کیوں کہ پھر درد میں اور شدّت پیدا ہو جائے گی۔

پانچواں شعر:۔ اے میرؔ محبوب کی یاد دِل میں رہنا اچھی بات ہے لیکن اِتنی شدّت سے اُسے یاد کرنا بھی اچھا نہیں ہے۔اے نادان، وہ تو کبھی کسی سے وفا نہیں کرتا اور اگر اُس کی یاد کو اِس طرح دِل سے لگا لو گے تو بھلانا مُشکل ہو جائے گا۔

3.12 غزل نمبر 9

لذت سے نہیں خالی ، جانوں کا کھپا جانا　　کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا
تھا ناز بہت ہم کو ، دانست پر اپنی بھی　　آخر وہ بُرا نِکلا ، ہم جِس کو بھلا جانا
اس گریہ خونیں کا ہو ضبط تو بہتر ہے　　اچھا نہیں ، چہرے پہ لوہو کا بہا جانا
اُس شمع کی مجلس میں جانا ہمیں پھر واں سے　　اِک زخمِ زباں تازہ ہر روز اُٹھا جانا
اے شورِ قیامت ہم! سوتے ہی نہ رہ جائیں　　اِس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا
ہے میری تری نسبت روح اور جسم کی سی　　کب آپ سے میں تجھ کو، اے جان جُدا ہونا
جاتی ہے گُزر جی پر اُس وقت قیامت سی　　یاد آوے ہے جب تیرا ایک بارگی آ جانا
کب میرؔ! بسر آئے؟ تُم ویسے فریبی سے　　دِل کو تو لگا بیٹھے، لیکن نہ لگا جانا

3.12.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	**معنی**	**مشکل الفاظ**	**معنی**
دانست	واقفیت، آگاہی، سمجھ، خیال، شناخت	گریہ	رونا، اشک باری، رقت

3.12.2 غزل (9) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ محبت میں جان پر کھیل جانا لذت سے خالی نہیں ہے، بے مزہ نہیں ہے۔ مگر یہ مزہ تو مرنے والا ہی لے سکتا ہے۔ خضر و مسیحا موت کی لذت سے لُطف اندوز کیوں کر ہو سکتے ہیں کہ اُنھوں نے آبِ حیات پی رکھا ہے اور کبھی مرنا نہیں ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمیں اپنی سمجھ پر بڑا ناز تھا کہ یہ آدمی کو پہچاننے میں کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔ لیکن سب غلط ثابت ہوا کہ اِس نے جِس کو اچھا سمجھا وہی دراصل بُرا تھا۔ بہ قول شاعر:

جس نظر پہ ناز تھا ہم کو، وہ کتنی خام تھی

اِس نے جب جس کو کہا اچھا، وہی اچھا نہیں

چھٹا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تیری میری نسبت یعنی تعلق رُوح اور جسم کا سا ہے کہ ایک دُوسرے کے بغیر وجُود ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اے میری جان میں نے تجھے اپنے سے جُدا کب مانا ہے۔

ساتواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے دِل پر اُس وقت قیامت کی سی گُزر جاتی ہے جب تیرا وہ اچانک میرے پاس آ جانا یاد آتا ہے۔

آٹھواں شعر:۔ غزل کے مقطعے میں شاعر کہتا ہے اے میرؔ اُس جیسے فریبی سے گُزر نہیں ہو سکتی۔ تُم نے اُس سے دِل تو لگا لیا ہے لیکن خُدا کے لیے محبت کو جان کا روگ نہ بننے دینا۔

3.13 غزل نمبر 10

پتا پتا ، بُوٹا بُوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے
عاشق ساتو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دُنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اُس کے، اپنا وارا جانے ہے
چارہ گری بیماری دِل کی رسمِ شہرِ حُسن نہیں
ورنہ دِلبر ناداں بھی اِس درد کا چارا جانے ہے
مہر و وفا و لُطف و عنایت، ایک سے واقف اِن میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ، رمز و اشارا جانے ہے
عاشق تو مُردہ ہے ہمیشہ، دیکھے سے جی اُٹھتا ہے
یار کے آ جانے کو یکا یک، عُمرِ دوبارہ جانے ہے
کیا کیا فتنے؟ سر پر اُس کے، لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دِل، بے تاب وتواں کو عشق کا مارا جانے ہے
تشنہ خوں ہے اپنا کتنا؟ میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اُس کے آبِ گوارا جانے ہے

3.13.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
زیاں	خسارہ،نقصان	تاب وتواں	صبر،قرار، برداشت

3.13.2 غزل(10) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر دُنیا کو چمن اور اِسی مُناسبت سے پتوں کو اہلِ دُنیا قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ چمن میں محض ایک گُل یعنی محبوب ہی ہے جو میرے حال سے واقف نہیں ہے۔ ورنہ چمن کا ایک ایک پیڑ اور پتّا میرے حال سے آشنا ہے۔ گویا دُنیا کا کوئی آدمی ایسا نہیں ہے (محبوب کو چھوڑ کر) جس کو میری حالت کا پتا نہیں ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے عاشق کا سا سادہ بھی کوئی دُنیا میں ہوگا کہ محبت میں اپنے دِل کے نُقصان کو بھی اپنا فائدہ خیال کرتا ہے۔ یعنی محبت میں دِل سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، تکلیفیں برداشت کرتا ہے لیکن مایوس نہیں ہوتا بلکہ اِسی میں اپنا فائدہ سمجھتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ دِل کی بیماری کا علاج یعنی عاشق پر کرم کرنا حُسن والوں کا شیوہ ہی نہیں ہے ورنہ نادان سے نادان دِلبر یعنی محبوب بھی اِس درد کا علاج جانتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ ہمارا معشوق بھی عجیب ہے۔ وہ جس کو سمجھتا ہے کہ یہ میرے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے اُس پر کرم کرنے کے بجائے طرح طرح کی بلائیں نازل کرتا ہے۔ گویا جو اُس کے عشق میں بے اِختیار ہو جاتا ہے وہ طرح طرح کے فتنوں سے دوچار رہتا ہے۔

ساتواں شعر:۔ غزل کے مقطے میں شاعر کہتا ہے کہ مُصیبتیں برداشت کرنے والا ناسمجھ میرؔ بھی اپنے خون کا اِس قدر پیاسا ہے کہ محبوب کی تیز دھار تلوار کی چمک کو گوارا خیال کرتا ہے۔ برداشت کرنے کے لائق تصوّر کرتا ہے۔

3.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ میر تقی میر کے حالات زندگی قلم بند کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ میر تقی میرؔ کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ میر تقی میر کے اسلوب پر روشنی ڈالیئے۔

سوال نمبر 4:۔ میر تقی میرؔ کے غزلیات کی تشریح معہ حوالہ کیجئے۔

3.15 امدادی کتب

1 میر تقی میر کے ادبی معرکے، از محمد یعقوب، مطبوعہ، مکتبہ اردو، باڑہ ہندوراؤ، دہلی۔

2 میر تقی میرؔ حیات اور شاعری، از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مطبوعہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی۔

3 میر تقی میرؔ، از ڈاکٹر عبادت بریلوی، مطبوعہ، ادارۂ ادب وتنقید، لاہور۔

4 انتخاب کلیاتِ میر، از میر تقی میر، مع فرہنگ، مقدمہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، مطبوعہ، ایچ، ایس، آفسٹ۔

5 غزلیات میرؔ کی اسلوبیات، از شاہد پرویز، مطبوعہ، اردو انڈیا انٹرنیشنل، نئی دہلی۔

6 میر تقی میرؔ کی جمالیات، از شکیل الرحمان، مطبوعہ، نیرالی دنیا پبلیکیشنز۔

اکائی نمبر4

خوجہ حیدر علی آتش کی غزلیات اور شرح

ساخت:

4.1 سبق کا تعارف

4.2 سبق کا ہدف

4.3 خوجہ حیدر علی آتش کی حیات اور غزلیات کی شرح

4.4 غزل نمبر 1

4.4.1 فرہنگ

4.4.2 غزل کی تشریح

4.5 غزل نمبر 2

4.5.1 فرہنگ

4.5.2 غزل کی تشریح

4.6 غزل نمبر 3

4.6.1 فرہنگ

4.6.2 غزل کی تشریح

4.7 غزل نمبر 4

4.7.1 فرہنگ

4.7.2 غزل کی تشریح

4.8 غزل نمبر 5

4.8.1 فرہنگ
4.8.2 غزل کی تشریح
4.9 غزل نمبر6
4.9.1 فرہنگ
4.9.2 غزل کی تشریح
4.10 غزل نمبر7
4.10.1 فرہنگ
4.10.2 غزل کی تشریح
4.11 غزل نمبر8
4.11.1 فرہنگ
4.11.2 غزل کی تشریح
4.12 غزل نمبر9
4.12.1 فرہنگ
4.12.2 غزل کی تشریح
4.13 غزل نمبر10
4.13.1 فرہنگ
4.13.2 غزل کی تشریح
4.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات
4.15 کتابیات

4.1 سبق کا تعارف

گرچہ خوجہ حیدرعلی آتش کو دبستان لکھنؤ کا نمائندہ شاعر نہیں کہا جاتا کیوں کہ اس دور میں تو ناسخ ہی اپنی شعری خصوصیات کے لحاظ سے لکھنؤ کی نیابت کر رہے تھے اور ان کی شاعری کا ڈنکا دور دور تک بج رہا تھا، لیکن دہلی اور لکھنؤ کے اتصال سے آتش نے نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا اور یہی ان کی شناخت بھی ہے جہاں ان کے یہاں داخلیت ہے وہیں لکھنؤ کی خارجیت بھی موجود ہے۔ اسی لیے آتش کے اشعار جہاں ذہن پر دستک دیتے ہیں وہیں دل کے تاروں کو بھی چھیڑتے ہیں۔ سید عبداللہ محاکمہ کرتے ہوئے آتش کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں: ''میں تو یہ کہوں گا کہ لکھنوی ادب اور شاعری کا صحیح نمائندہ آتش ہی تھا ناسخ نہ تھا۔ کیونکہ آتش کے کلام میں اسی زندگی کی لطافتوں کی روح کھینچ کر اس طرح جلوہ گر ہوگئی ہے جس طرح شراب کے جوہر میں شراب روح کی طرح کشید ہو کر سراپا لطافت بن جاتی ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو آتش کی شاعری لکھنوی شاعری کی ہی روحِ لطیف ہے۔ آتش ہی لکھنؤ کا وہ بڑا شاعر تھا جس نے لکھنؤ کے مشاعروں کے لیے بھی لکھا اور اپنے لیے بھی شاعری کی اور اس کی یہی شاعری ہے جس میں لکھنؤ کا وہ ادب پیدا ہو گیا ہے جس کی حیثیت مستقل ہے۔'' ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی اپنی تصنیف ''مقدمہ کلام آتش'' میں نقطہ پیش کیا ہے کہ ''آتش ہی لکھنوی دبستان کی نمائندگی کا حق رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ناسخ کے پاس صرف کرتب تھا استادی اور زبان دانی کا دعویٰ تھا۔ لیکن آتش اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ وہ وجدان اور احساس جمال کے مالک تھے۔۔۔۔ آتش کا کلام سونے پر سہاگہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناسخ، تخلیقی قوت کے فقدان کی وجہ سے ذہنی ورزش کی طرف مائل رہے۔ اس لیے ان کا کلام زندگی سے دور جا پڑا اور اس میں کوئی رس باقی نہ رہا۔ بقول رام بابو سکسینہ ''میرؔ و غالبؔ کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے تو وہ آتش ہے۔'' آل احمد سرور نے لکھنؤ کے ادب پر تنقید کرتے ہوئے آتش و ناسخ پر بھی رائے زنی کی ہے، ''ناسخ کی شاعری میں نشتریت سرے ہی سے نہیں وہ جس طرح باقاعدہ ورزش کرتے ہیں اسی طرح ڈھلے ڈھلائے شعر کہتے ہیں۔ ناسخ خوددار انسان تھے انہوں نے کبھی اپنے آپ کو ذلیل نہ کیا مگر شاعر وہ بہت معمولی تھے۔ آتش کے یہاں

جذبہ بھی ہے۔ گرمی بھی ہے۔ اور گداز بھی وہ دربار سے متعلق نہیں تھے۔''

غرض یہ کہ آتش نے فکر حسین کے لئے دلاویز اسلوب سے کام لیا۔ ردیفوں اور قافیوں کے استعمال میں بھی ان کا جمالیاتی شعور بہت نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ان سے آتش کے یہاں ایک سحر آفرین مصوری، موسیقیت و نغمگی پیدا ہوگئی ہے۔ جس سے ان کے فن کی لے نشاطیہ اور تمنا خیز فکر کی لے سے بہت ہم آہنگ ہوگئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لکھنؤ کے عام شعری ماحول سے متاثر ہو کر آتش کے یہاں شاعری کہیں کہیں نری قافیہ پیمائی اور لفظوں کے طلسمی کھیل تک محدود ہو گئی ہے لیکن ہر بڑے شاعر کے یہاں ایسے نقائص موجود ہیں۔ آتش کے اشعار میں چھپی ہوئی فطر کی بجلیاں، ان کا نشاطیہ آہنگ اور ان کا دل میں اتر جانے والا صاف اور سادہ لب ولہجہ ان کی شاعری کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ آتش کی اردو کلیات دو دیوانوں پر مشتمل ہے۔ پہلا دیوان ان کی زندگی میں ہی شائع ہو چکا تھا لیکن دوسرا دیوان ان کی وفات کے بعد میر دوست علی خلیل نے مرتب کر کے پہلے دیوان میں شامل کر دیا۔

4.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں خواجہ حیدر علی آتش کی حیات اور ادبی خدمات کا عمومی جائزہ اور ان کی غزلیات کی تشریح معہ فرہنگ کے شامل ہے تاکہ طلبا کو آتش کے کلام سے واقف کروایا جا سکے۔

4.3 خوجہ حیدر علی آتش کی حیات اور غزل گوئی

حالاتِ زندگی:۔ آتش کا نام خواجہ حیدر علی اور تخلص آتش تھا۔ آتش کے بزرگ دہلی کے مکین تھے۔ اُن کے والد خواجہ علی بخش دہلی سے فیض آباد آئے اور یہیں آتش ۱۷۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ جس کے نتیجے میں آتش کی تعلیم تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ البتہ بعد میں فارسی اور عربی میں کسی حد تک دسترس حاصل کر لی۔

پیری و مریدی خاندانِ آتش کا شیوہ تھا لیکن آتش نے اِس خاندانی روش کو چھوڑ کر شاعری اختیار کی۔ اُس زمانے میں انشا و مصحفی کے معرکے زوروں پر تھے۔ آتش نے شیخ مصحفی کی شاگردی میں اتنا نام پیدا کیا کہ مسلم الثبوت اُستاد ہو گئے۔ بیس روپے لکھنو کے نواب سے ملتے تھے جن میں سے پندرہ روپے آتش گھر میں دیتے اور باقی راہِ خُدا میں حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ نتیجہ جس کا یہ ہوتا کہ تنگدستی میں رہتے مہینے میں ایک آدھ بار فاقہ کشی کی نوبت بھی آتی۔ اکثر شاگرد امیر زادے تھے اُن میں سے اگر کوئی سلوک کرنا چاہتا تو اِنکار نہیں کرتے تھے۔ پیری فقیری اگرچہ چھوڑ دی تھی لیکن فقیرانہ انداز اُن کی طبعیت سے گیا نہیں۔ محمد حسین آزاد صاحب اُن کی آخری زندگی سے متعلق لکھتے ہیں کہ ایک چھوٹے مکان میں جس پر کچھ چھت، کچھ چھپر سایہ کیے تھے، بوریا بچھا رہتا تھا۔ اسی پر ایک تکیہ باندھے قناعت کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے اور چند روزہ زندگی کو اِس طرح گُزار دیا جیسے کوئی بے نیاز و بے پرواہ فقیر تکیہ میں بیٹھا ہو۔ متوسط الحال اشراف یا کوئی امیر آتا، وہ سلام کر کے کھڑا رہتا کہ آپ فرمائیں تو بیٹھے۔ یہ کہتے کیوں مرزا صاحب بوریے کو دیکھتے ہو کہ کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ یہاں مسند تکیہ کہاں؟

آخری عُمر میں خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ مگر وہ بانکپن اور سپاہانہ وضع کے ساتھ گذر کرتے رہے۔ سپاہانہ لباس اور ہمیشہ سلیم شاہی جوتا پہنتے اور تلوار باندھتے تھے۔ بھنگ پینے کے بڑے شوقین تھے اور آخری وقت تک اِس شوق کو نبھاتے رہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ ۱۸۴۳ء میں ایک دِن بھلے چنگے بیٹھے تھے، یکا یک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلے کی طرح بُجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں سوائے راکھ کے ڈھیر کے اور کچھ نہ تھا۔ امیر دوست علی خلیل نے آخری رسوم کا اِنتظام کیا۔

آتش، ناسخ کے ہمعصر تھے، جس سے دونوں میں ہنگامہ آرائی رہتی تھی۔ مگر خُدا کا لاکھ لاکھ شُکر ہے کہ یہ ہنگامہ آرائی محض نوکِ زبان تک محدود رہتی۔ سودا اور انشا کی طرح ہاتھا پائی کی نوبت نہ آئی۔ لیکن اِتنا ضرور ہے کہ آدابِ دربار بھی نہ رہا تھا۔ کبھی کبھی دربار میں نوک جھونک ہو جاتی۔ آتش کا کارنامہ صرف ایک دیوان اُن کی غزلوں کا ہے جو اُن کے سامنے شائع ہو گیا تھا اور دُوسرا جو اُن کی وفات کے بعد مرتب ہوا۔ لکھنؤ اسکول کا سب سے قابلِ قدر کارنامہ زبان کی

درُستی ہے۔گُلستانِ اُردو، کوخس وخاشاک سے پاک کرنا اس اسکول نے اپنا فرض سمجھا اور حق تو یہ ہے کہ اس سِلسِلے میں اس اسکول کو بہت کچھ کامیابی بھی ملی۔ ناسخ نے خاص طور پر اصول وضع کیے کہ کون سے الفاظ رکھے جائیں اور کون سے نکال باہر کیے جائیں۔آتش نے صفائی زبان اپنے یہاں آئینہ کر کے دِکھایا۔ چنانچہ سب سے پہلی خصوصیت جو آپ کو خواجہ آتش کے یہاں ملے گی وہ زبان کی صفائی اور محاورات کا بہترین استعمال ہے۔

خصوصیاتِ کلام:۔

آتش کے کلام میں رنگینی، سادگی اور روانی ہے۔تصنع اُن کے کلام میں نہیں ہے۔زبان کی صفائی اور محاورات کا برمحل استعمال اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں اور روزمرہ اور بول چال کا لُطف کلامِ آتش میں بے حد مزہ پیدا کرتا ہے۔ پھراس پر لُطف یہ ہے کہ اختصار کے ساتھ مضمون ادا ہوتا ہے جو سونے پر سُہاگے کا کام دیتا ہے۔

ناگفتنی ہے عشق ِ بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکرِ خُدا کچھ نہ پوچھئے

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کلامِ آتش میں صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔تخیل کی بُلند پروازی نہ ہونے کے برابر ہے۔مگر یہ خیال محض خیال ہی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کا کلام مضامینِ بُلند سے خالی نہیں ہے۔آتش کے یہاں تصوف کی عکاسی اس مزے اور آزادی کے ساتھ ہے کہ اُنہیں اُردو کا حافظ کہنا چاہئے۔یہی فقیرانہ اور آزادانہ رنگ آتش کو انفرادی حیثیت دے کر دُوسرے شعراء سے ممتاز کرتا ہے اور شعر میں جان پیدا کرتا ہے۔ایک جگہ کہتے ہیں۔

کام ہے شیشے سے ہم کو اور نہ ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شرابِ روح فردو سے غرض

....

تصوف اور اُس میں مستی کا عالم اِس ایک شعر سے ملاحظہ ہو:

جہاں و کارِ جہاں سے ہوں بے خبر میں مست
زمیں کدھر ہے کہاں آسماں نہیں معلوم

....

آتش کے کلام میں ثقیل الفاظ بہت کم استعمال ہوئے ہیں اور جہاں کہیں ایسے الفاظ آ بھی گئے ہیں وہاں بھی آتش کی طرزِ ادا اور نشستِ الفاظ نے اُنہیں دِلچسپ بنا دیا ہے۔ آتش الفاظ کا انتخاب اور اُن کی بندش بڑی سوجھ بوجھ سے کرتے ہیں اور اس کام کو وہ مرصع کاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشِ مرصع ساز کا

حُسن کے خارجی لوازمات کی تعریف لکھنؤ اسکول میں عام تھی۔ مگر اِس میں بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ کہنے والا کبھی کبھی خود اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ معنویت اور شاعرانہ حُسن تو بھول بھلیاں ہو جاتا تھا مگر آتش نے کمال یہ کیا کہ اس رنگ میں بھی دِلچسپی اور معنی آفرینی قائم رکھی۔

آتش کے یہاں چند کمزوریاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی عامیانہ مضامین بھی نظم کر دیتے ہیں، جو ظاہر ہے باتیں ہی ہیں۔ دُوسرے یہ کہ الفاظ کہیں کہیں صحیح طور پر نظم نہیں ہوتے۔ اِس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اُس زمانے میں عوام کی زبان پر وہ الفاظ ویسے ہی رائج ہوں جن کو خواجہ آتش نے نظم کیا اور پھر اِس قسم کی مثالیں دُوسرے شعراء کے ہاں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً میرؔ مسجد کو مسیّت کہتے ہیں۔ اسی طرح آتش نے بھی چند الفاظ لکھ دیے ہیں جو پُر تکلف بھی ہیں اور ناہمواری بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

ماحول سے متاثر ہو کر آتش نے کہیں کہیں رعایت لفظی پر بھی توجہ کی ہے۔ چنانچہ کلام کا ایسا حِصّہ درد و تاثیر سے صاف مجروح نظر آتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ محض قافیہ پیمائی اور رعایت لفظی کی خاطر شعر کہہ دیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں آتش روایتی شاعری سے الگ ہو کر کیف و مردانگی اور خودداری کے ساتھ جذبات قلم بند کرتے ہیں وہاں اُن کی معیاری

خصوصیت اُن کو دُوسرے شعراء سے الگ بلکہ ممتاز حیثیت بھی عطا کرتی ہے۔

اُردو شاعری کا خاصا رہا ہے کہ محبوب عاشق کو ذلیل کرتا ہے، اُس پر ظُلم کرتا ہے مگر عاشق ہے کہ بے آبرو ہو کر نکلنے کے باوجود اُسی در، اُسی کوچے کی خاک ہو کر پڑے رہتے ہیں۔ آتش کے کلام میں البتہ کہیں کہیں غیرت مندی کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

جب وہ نہیں ملتا ہے تو ہم بھی نہیں ملتے

غیرت کا اب اپنی بھی تقاضا ہے تو یہ ہے

آتش کے کلام کی ایک اور خوبی اُن کی تشبیہات اور استعارات میں مُضمر ہے۔ تشبیہہ و استعارہ نہ صرف کلام میں شگفتگی پیدا کرتے ہیں بلکہ اُن کے برمحل استعمال سے کلام میں ایک نئی جان پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل شاعر جب کوئی بڑا دعویٰ کرتا ہے تو اُسے ثابت کرنے کے لیے اُسے کسی بڑی چیز کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ایسی تشبیہہ لاتا ہے جس میں قُدرتی، مناسبت ہو اور دِل کشی ہو۔ آتش اس فن سے واقف ہیں۔ اُنہوں نے تشبیہہ واستعارے کا استعمال بڑی قُدرت اور دِل کشی کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً محبوب کے ابروؤں کو تلوار سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ مگر اِس میں جس قدر قُدرت کے ساتھ آتش نے محبوب کے ابروؤں کو تلوار سے تشبیہہ دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

دست علی کی ضرب کا جنبش میں اثر ہے

ان ابروؤں میں معجزہ ہے ذوالفقار کا

مجموعی طور پر آتش کی شاعری میں بانکپن، سرمستی، جذبۂ شاعری، تخیل کی غیر معمولی قُدرت، مصّوری، تصویر سازی اور دل ریزی ایسی خصوصیات ہیں جو قاری کو محصور کرتی ہیں۔ آتش کی غزل گوئی ایک مسلسل ریاضت ہے، جستجو ہے، انتشار میں وحدت کی تلاش ہے۔ احساس و تخیل کو جگائے رکھنے کی ایک کامیاب کاوش ہے۔ آتش اوّل و آخر غزل گو تھے۔ اُن کے کلیات میں سوائے غزلوں کے کسی دُوسری صنف کا نام تک نہیں ملتا۔ اس حوالے سے بھی آتش کا مقام دُوسرے شعراء سے الگ ہی ہے۔ تمام تر اُردو شاعری میں شاید ہی آتش جیسا پُختہ تر اور استوار تر غزل گو کوئی دُوسرا ہو۔

4.4 غزل نمبر 1

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟ کہتی ہے تجھے خلقِ خُدا غائبانہ کیا؟
چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر دِل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا؟
طبل و علم ہی پاس ہے اپنے، نہ ملک و مال ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟
آتی ہے کس طرح سے؟ مری قبضِ روح کو دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا؟
یوں مُدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے آتش! غزل یہ تُو نے کہی عاشقانہ کیا

4.4.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
طبل	بڑا ڈھول، نقارہ	حسد	بدخواہی، جلن، کینہ

4.4.2 غزل (1) کی تشریح

پہلا شعر:۔ اِس شعر میں غالباً حاکمِ وقت کی طرف اِشارہ ہے کہ تُو اِس خوش فہمی میں ہے کہ جو تُو سوچتا ہے درُست، جو کرتا ہے بجا ہے لیکن تجھے معلُوم نہیں کہ لوگ تیرے حوالے سے کیا سوچتے ہیں۔ اب شاعر کہتا ہے کہ دُنیا میں جو کہانیاں تیرے متعلق بنی ہیں اُنھیں بھی سُن اور یہ بھی سُن کہ یہ خُدا کی مخلوق تیری پیٹھ پیچھے تجھ کو کیا کہتی ہے۔ کس طرح یاد کرتی ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر دِل زنگِ کدُورت سے پاک ہو اور ہر طرح سے صاف ہو تو پھر دِل ایک شیش محل کی طرح ہو جاتا ہے کہ جس میں چاروں طرف محبوبِ حقیقی کی صورتیں ہی صورتیں جلواہ گر نظر آئیں گی۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ زمانے کی گردش اُسے ہی نُقصان پہنچا سکتی ہے جس کے پاس کچھ ہو۔ ہمارے پاس چوں کہ نہ ہی مال و دولت ہے اور نہ ہی بادشاہت یا دُوسرا کوئی سامان ہے تو پھر اگر زمانہ ہمارے خلاف ہو بھی گیا تو ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔

چوتھا شعر:۔ موت آتی ہے تو کوئی نہ کوئی بہانہ ساتھ لاتی ہے کہ فلاں ایک حادثے میں مر گیا، فلاں حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گیا۔اب شاعر کہتا ہے کہ ہماری رُوح نِکالنے گویا ہماری موت کے لیے کون سا بہانہ ڈھونڈ رہی ہے۔یعنی ہماری موت کا سبب کیا بنتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے آتشؔ تُم نے نہایت پاکیزہ اور بُلند مضامین کی بہت بڑھیا غزل کہی ہے۔اب اگر حریف حسد سے اِس کی داد نہ دے تو دُوسری بات ہے۔مگر تمھاری یہ عاشقانہ غزل لاجواب ہے، بہت خوب ہے۔

4.5 غزل نمبر 2

تصّور سے کسی کے میں نے کی ہے گُفتگو برسوں	رہی ہے ایک تصویر خیالی رُوبرو برسوں
ہوا مہمان آ کر، رات بھر وہ شمع رو برسوں	رہا روشن میرے گھر کا چراغِ آرزوٗ برسوں
چمن میں جا کے بھولے سے میں خستہ دِل کراہا تھا	کیا کی گُل سے بُلبُل شکوۂ دردِ گلو برسوں
برابر جان کے رکھا ہے اُس کو مرتے مرتے تک	ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزوٗ برسوں
دیا ہے حکم، تب پیرِ مغاں نے سجدۂ خم کا	کیا ہے جب شرابِ ناب سے ہم نے وضو برسوں
اگر میں خاک بھی ہوں گا تو آتشؔ! گردِ باد آسا	رکھے گی مجھ کو سرگشتہ، کسی کی جُستجو برسوں

4.5.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
دردگلو	گلے درد	مغاں	آتش پرست، مجوسی

4.5.2 غزل(2) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ برسوں سے ایک خیالی تصویر ہمارے رُوبرو رہی ہے اور مُدّتوں ہم نے خیالوں میں اُس تصویر سے گفتگو کی ہے، بات کی ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا وہ محبوب جو شمع کی طرح روشن چہرہ رکھتا ہے، برسوں رات رات بھر میرے گھر مہمان کی طرح رہا ہے اور اِس طرح میری آرزوؤں کے چراغ سے میرا گھر مُدّتوں جگمگاتا رہا ہے۔ گویا برسوں اُس نے مجھے شادکام کیا ہے۔

تیسرا شعر:۔ بُلبُل پھول کا عاشق ہے اور باغ میں نغمے گاتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ میں شِکستہ دِل بھولے سے یعنی بے اِرادہ چمن میں جاکے فغاں کر بیٹھا تھا، کراہا اُٹھا تھا۔ میرے نالے میں ایسی تاثیر تھی کہ مُدّتوں درد دِگلو کا بہانہ کر کے بُلبُل نغمہ گانے سے پرہیز کرتی رہی۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے مرتے دم تک اپنی آرزُو کو جان کی طرح عزیز رکھا، یعنی بہت عزیز رکھا ہے۔ ایسا عزیز رکھا ہے کہ وہ برسوُں ہماری قبر پر آ کر رویا کرے گی۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم محبت میں خاک بھی ہو جائیں گے تو بھی اے آتش گردآلود ہوا کی طرح مُدّتوں کسی کی تلاش ہمیں پریشان رکھے گی۔

4.6 غزل نمبر 3

مگر اُس کو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
اُلٹتی ہیں صفیں، گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

خوشی سے اپنی رُسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے، تنگ جب دیوانہ آتا ہے

فراقِ یار میں ، دِل پر نہیں معلوم کیا گذُری؟
جو اشک آتا ہے آنکھوں میں سو بے تابانہ آتا ہے

تماشہ گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کِس کو
کسے اِس انجمن میں یاد خلوت خانہ آتا ہے

زیارت ہو گی کعبہ کی یہی تعبیر ہے اِس کی
کئی شب سے ہمارے خواب میں بُت خانہ آتا ہے

عتاب و لُطف جو فرماؤ، ہر صورت سے راضی ہیں
شکایت سے نہیں واقف ، ہمیں شکرانہ آتا ہے

خُدا کا گھر ہے، بُت خانہ ہمارا دِل نہیں آتش
مقامِ آشنا ہے، یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

پہلا شعر:۔شاعر کہتا ہے کہ شاید اُس کی یعنی محبوب کی مستی بھری نرگسی آنکھوں کو فریب دینا آتا ہے کہ جب وہ پیمانہ یعنی آنکھیں گردش میں آتی ہیں تو صفیں کی صفیں دگرگوں ہوتی جاتی ہیں۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ کس کا جی چاہتا ہے کہ وہ بدنامی مول لے۔ خوشی سے کوئی رُسوائی گوارا نہیں کرتا ہے۔ لہذا اگر دیوانہ گریباں چاک کرتا ہے تو یونہی نہیں کرتا ہے بلکہ تنگ آمد بہ جنگ آمد والی بات ہوتی ہے۔ وہ سخت تنگ ہونے پر ہی اپنا دامن پھاڑتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی جُدائی میں اِس دِل پر جانے کیا کیا گُزر گیا ہے کہ آنکھوں میں جو آنسو آتا ہے بے تابانہ آ رہا ہے۔ گویا بہت جلد اور بے قراری کی کیفیت لیے آتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ کائنات کی اِس تماشا گاہ میں کسی کو عاقبت سنوارنے کا خیال نہیں آتا۔ عدم کی طرف دھیان کسی کا نہیں جاتا۔ اور کیسے جائے کہ دُنیا پُر رونق انجمن کی طرح ہے اور اِس انجمن میں عدم، اُس بے رونق مقامِ تنہا کی یاد کیوں کر آ سکتی ہے۔

پانچواں شعر:۔ خواب کی تعبیر اکثر اُلٹ ہوتی ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ چوں کہ کئی دِنوں سے ہمارے خواب میں بُت خانہ آ رہا ہے لہذا اِس کے برعکس تعبیر ہوگی اور ہمیں کعبے کی زیارت نصیب ہوگی۔

چھٹا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تُم ہم پر قہر کرو کہ کرم کرو، ہمیں منظُور ہوگا۔ ہم شکایت نہیں کریں گے کہ ہم شکایت سے واقف ہی نہیں ہیں۔ ہم ہر حال میں شکر گُزار رہوں گے۔

ساتواں شعر:۔ آتش کہتے ہیں کہ ہمارا دِل خُدا کا گھر ہے۔ اِس میں خُدا مکیں ہے۔ اِس میں بُتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ گویا یہ بُت خانہ نہیں ہے۔ یہ اُس کے مقام سے واقف ہے۔ اِس میں کوئی غیر نہیں آ سکتا۔

4.7 غزل نمبر 4

یہ آرزُو تھی تجھے گُل کے رُوبرو کرتے	ہم اور بُلبُلِ بے تاب گُفتگو کرتے
پیام بر نہ ہوا میسر تو خوب ہوا	زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزُو کرتے
مری طرح ہیں مہ و مہر بھی آوارہ	کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جُستجُو کرتے
جو دیکھتے تری زنجیرِ زُلف کا عالم	اسیر ہونے کی، آزاد آرزُو کرتے
وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی	دِل و جگر کو کہاں تک بھلا لہُو کرتے
نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش !	برستی آگ ،جو باراں کی آرزُو کرتے

4.7.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
پیام بر	نامہ بر، پیغام پہنچانے والا	اسیر	قید،محبوس، گرفتار
برگشتہ طالع	بدقسمتی، بدنصیبی	باراں	بارش، بادل

4.7.2 غزل (4) کی تشریح

پہلا شعر:۔ بُلبُل گُل کا عاشق ہے۔اُس کے نزدیک پھول سب سے حسین ہے۔اِدھر شاعر اپنے محبوب کو سب سے زیادہ حسین خیال کرتا ہے۔اب وہ کہتا ہے کہ ہماری یہ خواہش تھی کہ اے محبوب تجھے گُل کے سامنے بٹھاتے اور پھر ہم بُلبُل سے بات کرتے کہ بتا کون زیادہ حسین ہے۔بُلبُل پر حقیقت واضح ہو جاتی اور اُس کی خوش فہمی دُور ہو جاتی۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر نامہ بر میّسر نہیں ہو سکا ہے تو اچھا ہی ہوا کہ غیر کی زبان سے اپنی آرزُو کا خلاصہ کیوں کر

کرتے۔اپنی آرزُو کا اِظہار اُس کی زبان سے کیوں کر کرواتے۔

تیسرا شعر:۔ اِس شعر میں شاعر نے صنعتِ حُسنِ تعلیل سے کام لیا ہے۔سُورج چاند گردش میں دِکھائی دیتے ہیں۔شاعر نے اِس کا شاعرانہ سبب یہ بتایا ہے کہ وہ کسی کی تلاش میں آوارہ ہیں۔لہٰذا وہ کہتا ہے کہ یہ بھی میری ہی طرح آوارہ ہیں۔اِس سے معلُوم ہوا کہ یہ بھی کسی ہم دم کی تلاش میں ہیں۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب جو لوگ محبت میں گرفتار نہیں ہیں، آزاد ہیں اگر وہ ایک بار تمھاری پیچ دار حلقہ نُما زُلفوں کو دیکھ لیں تو اُنھیں آزاد ہونے پر افسوس ہو اور وہ اِن زُلفوں میں قید ہونے کی خواہش کریں۔

پانچواں شعر:۔ محبوب کی جُدائی میں دِل وجگر کا جو حال ہوتا ہے اُس کا بیان لفظوں میں مُمکن نہیں ہے۔اب شاعر کہتا ہے کہ اگر وہ جانِ جاں یعنی جان سے عزیز محبوب نہیں آتا تو کم از کم موت ہی آجاتی کہ ہم دِل وجگر کو کہاں تک لہو کریں کہ اب برداشت سے باہر ہے۔

چھٹا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے آتش ہماری بدنصیبی کا عالم مت پُوچھو کہ جس چیز کی ہم خواہش کریں اُس کے برعکس ہوتا ہے۔اگر ہم بارش کی دُعا کریں تو اُس کی جگہ آگ برسے۔ ہماری طالع کی برگشتگی کا یعنی بدنصیبی کا یہ عالم ہے۔

4.8 غزل نمبر 5

گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے — بُلند آج نہایت غُبار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں — نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار راہ میں ہے

سمندِ عُمر کو اللہ رے، شوقِ آسائش — عناں گستہ و بے اِختیار راہ میں ہے

جنوں میں خاک اُڑاتا ہے ساتھ ساتھ اپنے — شریک حال ہمارا غبار راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

4.8.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
غبار	دھول، گرد، میل	عناں گشتہ	تیز چلنا، بھاگنا، دوڑنا

4.8.2 غزل (5) کی تشریح

پہلاشعر:۔ جب کوئی گھوڑا دوڑے گا تو غُبار اُٹھے گا، یہ فطری ہے۔ شاعر اِس کا ایک دُوسرا شاعرانہ سبب بتا تا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی چھوٹوں کو سرفراز کرنے والا شہہ سوار اِس راستے سے گُزرا ہے کہ جو غُبار اِس قدر بُلندی پر پہنچ گیا ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ زندگی ہی میں عدم یعنی دُوسری دُنیا کہ جہاں مرنے کے بعد جانا ہے، کی فکر ضروری ہے۔ اُس کو دھیان میں رکھنا اور اعمال دُرست کرنا لازم ہے کہ اِس جہان اور اُس جہان کے بیچ کوئی مقام اب نہیں ہے کہ جہاں قیام کر کے عاقبت سنوار سکتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ زندگی کے گھوڑے کو یا اللہ یہ کیا آرام وسکون کا شوق ہے کہ زندگی کے جس گھوڑے پر اِنسان سوار ہے، کہاں رُک جائے، کس طرف کو مُڑ جائے، معلُوم نہیں ہے۔ اِس کے باوجود اِنسان بڑے اِطمینان اور آرام وسکون کے ساتھ اُس پر سوار ہے۔ اُس کو اِس کی بے اِختیاری کا بالکل خوف نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ دیوانگی کے عالم میں آدمی آوارہ ہو جاتا ہے۔ وہ بے سمت دوڑتا جاتا ہے اور گرد وغُبار اُڑاتا جاتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ ہم آوارہ ہیں، خاک اُڑا رہے ہیں۔ گویا ہمارے ساتھ ساتھ غُبار اُڑ رہا ہے۔ لہٰذا یہی ہمارے دُکھ درد کا ساتھی ہے۔

پانچواں شعر:۔ چل نِکلنا کسی کام کے لیے شرط ہوتی ہے۔ پھر حالات خود بخود سازگار ہو جاتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے سفر کا آغاز کرنا شرط ہے پھر مُسافر نوازوُں کی کچھ کمی نہیں ہے۔ راستے میں ہزاروُں سایہ دار درخت اُسے نوازنے کے لیے موجود رہتے ہیں۔

4.9 غزل نمبر 6

وحشی تھے بُوئے گُل کی طرح سے جہاں میں ہم　　نکلے ،تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم
ساقی ہے ، یارِ ماہ لقا ہے ، شراب ہے　　اب بادشاہِ وقت ہیں، اپنے مکاں میں ہم
کیا حال ہے؟ کسی نے نہ پوچھا ہزار حیف　　نالاں رہے جرس کی طرح کارواں میں ہم
شاگردطرز خندہ زنی میں ہے گُل ترا　　اُستادِ عندلیب ہیں، شور و فغاں میں ہم
دُنیا و آخرت میں طلب گار ہیں ترے　　حاصل تجھے سمجھتے ہیں دونوں جہاں میں ہم
آتش !سُخن کی قدر زمانے سے اُٹھ گئی　　مقدُور ہو تو قفل لگا لیں وہاں میں ہم

4.9.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
ماہ لقا	خوبصورت، حسین، چاند جیسا چہرہ	حیف	افسوس، تعجب، حیرت
جرس	گھنٹی جو اونٹ کے گلے میں لٹکی ہو	نالاں	روتا ہوا، عاجز، فریادی
خندہ زنی	ہنس مکھ، ہنسوڑ، متبسم	عندلیب	بلبل، ایک خوشنوا پرندہ
مقدور	حوصلہ، ہمت، طاقت	قفل	بندش، تالا

4.9.2 غزل (6) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم بُوئے گُل یعنی پھول کی خوشبُو کی طرح آوارہ تھے، بھٹکنے والے تھے۔ خوشبُو بھی ایک بار گُل سے نِکل جاتی ہے تو واپس لوٹ کر نہیں آتی اور نہ کہیں ٹھہرتی ہے۔ اُسی طرح ہم بھی محبت میں ایسے آوارہ ہیں کہ ایک بار جو گھر سے نکلے ہیں تو لوٹ کر ہی آئے ہیں اور نہ کہیں قیام کیا ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے پاس ہمارا خوب رُو معشوق ہے، شراب اور شراب پلانے والا ساقی ہے۔ جب یہ تمام چیزیں میسّر ہیں تو پھر ہم ایسے عشاق کو اور کیا چاہیے۔ لہذا اِس وقت اگر ہم یہ کہیں کہ ہم حاکمِ وقت ہیں تو کیا قباحت ہوگی۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے محبت کے میدان میں قدم کیا رکھا کہ سب نے ہم سے لاتعلقی اِختیار کر لی۔ محبت میں ہم گھڑیوں فریاد کرتے رہے مگر افسوس صد افسوس کہ کسی اپنے پرائے نے یہ نہیں پوچھا کہ تُم کیوں نالہ کر رہے ہو۔ تُمھارے دِل کی صورت، حالت کیسی ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر محبوب کی خندہ زنی اور اپنے شور و فغان کا تذکرہ کر رہا ہے۔ محبوب ہنس ہنس کر عاشق کو رُلاتا ہے اور عاشق نالہ و فریاد کرتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ مسکرانے میں پھول تُم سے کم تر ہے۔ پھول کے کھلنے کو پھول کے ہنسنے سے تعبیر کیا ہے۔ تُم گویا ہنسنے میں پھول کے اُستاد ہو۔ خود اپنے لیے کہتا ہے کہ بُلبُل بھی نالہ کرتا ہے مگر اُس میں وہ تاثیر نہیں ہے جو ہمارے نالے میں ہے۔ لہذا فریاد کرنے میں وہ ہمارا شاگرد ہے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ہمیں اِس دُنیا میں بھی تُمھاری طلب ہے، خواہش ہے اور آخرت کہ جہاں مرنے کے بعد رُوح جائے گی وہاں بھی تُمھاری ہی طلب رہے گی۔ گویا ہم دونوں جہانوں میں تجھے ہی سب کچھ خیال کرتے ہیں، حاصل خیال کرتے ہیں۔

چھٹا شعر:۔ شاعر زمانے سے سُخن کی بے قدری کا گِلا کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اِس زمانے میں شاعری کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور ایسی بے قدری ہے کہ اگر ہمارے اِختیار میں ہو تو ہم اپنے مُنھ کو تالا لگا دیں، خاموش ہو جائیں۔ ایک شعر تک نہ کہیں۔ مگر کہتے ہیں کیوں کہ مجبور ہیں۔

4.10 غزل نمبر 7

حباب آسائیں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اِس قطرے کو دریا کی خُدائی کا
ہوئی منظور محتاجی نہ تجھ کو اپنے سائل کی
بنایا کاسئہ سر واژ گوں کاسہ گدائی کا
نظر آتیں ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں اُس کو
کوئی، آئینہ خانہ کار خانہ ہے خُدائی کا
نکل اے جان! تن سے تا وصالِ یار حاصل ہو
چمن کی سیر ہے انجام بُلبُل کو رہائی کا
شکستِ خاطرِ احباب ہوتی ہے درُست اُس سے
توجہ میں تری اے یار! اثر ہے مو میائی کا
دِل اپنا آئنے سے صاف عشقِ پاک رکھتا ہے
تماشا دیکھتا ہے حُسن اُس میں خود نُمائی کا
نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتشؔ نے
بجا ہے اے صنم! جو تجھ کو دعویٰ ہے خُدائی کا

4.10.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
حباب آسائیں	کمزور، بلبلے کی طرح	آشنائی	دوستی، محبت، چاہ، اُنس، مانوسیت، ربط ضبط
سائل	بھکاری، گداگر، حاجت مند	کاسہ سر	کھوپڑی، سر کا خول
مومیائی	سلاجیت، پہاڑ سے نکلی ہوئی سیاہ رنگ دوا		

4.10.2 غزل (7) کی تشریح

پہلا شعر:۔ بُلبُلا دریا میں ہوتے ہوئے بھی الگ حیثیت رکھتا ہے اور جب تک اُس کی الگ حیثیت بنی رہتی ہے، وہ دریا نہیں ہوسکتا۔ گویا اُس کی الگ حیثیت ہی اُس کے دریا ہونے میں مانع آتی ہے۔ یہی معاملہ اِنسان کا ہے کہ اُس کا وجود ہی اُس کو محبوبِ حقیقی سے جُدا کرتا ہے۔ اب شاعر خود کو بُلبُلا اور محبوبِ حقیقی کو سمندر قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تُمھاری محبت پر ایمان لاتا ہوں اور مجھے تُم سے جُدا ہونے کا بڑا رنج ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے خُدا چوں کہ تجھے اپنے بندوں کی محتاجی قبول نہیں تھی اِسی لیے تُو نے اِس بھکاری کے ٹھیکرے نُماں کاسۂ سر کو یعنی اِنسانی کھوپڑی کو اوندھا رکھا ہے، اُلٹا رکھا ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرف کو نظر اُٹھایے اُسی کا جلوہ دِکھائی دیتا ہے۔ اُس کی تمثال نظر آجاتی ہے۔ گویا یہ کائنات قُدرتِ خُدا کا کوئی آئینہ خانہ ہے کہ جس میں صورتیں ہی صورتیں نظر آتی ہیں۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میری موجودگی نے مجھے میرے محبوبِ حقیقی سے دُور رکھا۔ لہٰذا موت آئے کہ مجھے اُس کا وصال حاصل ہوجائے۔ جس طرح بُلبُل رہا ہونے پر سیدھا اپنے محبوب گُل کے پاس جاتا ہے اُسی طرح شاعر کہتا ہے کہ زندگی کی اِس قید نے مجھے میرے محبوب سے دُور رکھا ہے۔ یہ جان نکلے تو مجھے وصال ہو۔

ساتواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے خُدا آتش نے اگر چہ تجھے دیکھا نہیں ہے لیکن اِس دُنیا اور اِس کی موجودات کو دیکھ کر اُس نے تجھے پہچان لیا ہے کہ یہ سب تیری قُدرت کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ لہذا اے میرے محبوبِ حقیقی اگر تجھے خُدائی کا دعویٰ ہے تو درُست ہے، بجا ہے۔

4.11 غزل نمبر 8

فریبِ حُسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا	خُدا کی یاد بھولا شیخ، بُت سے برہمن بگڑا
تکلّف کیا؟ جو کھوئی جان شیریں پھوڑ کر سر کو	جو غیرت تھی، تو پھر خسرو سے ہوتا کوہ کُن بگڑا
تری تقلید سے کبکِ دُری نے ٹھوکریں کھائیں	چلا جب جانور اِنساں کی چال، اُس کا چلن بگڑا
امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک	نہ اِک مو کم ہوا اپنا، نہ اِک تارِ کفن بگڑا
لگے مُنھ بھی چڑانے، دیتے دیتے گالیاں صاحب	زباں تو خیر بگڑی تھی، خبر لیجیے! دہن بگڑا

4.11.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
تکلف	بناوٹ، ظاہرداری، ہچکچاہٹ، جھجک	کوہ کن	سخت محنت، پہاڑ کھودنا، مشقت
تقلید	نقل، نقش قدمی، پیروی		

4.11.2 غزل(8) کی تشریح

پہلا شعر:۔ گبرآتش پرست کو کہتے ہیں اور چلن بگڑنا، عادات واطوار خراب ہونا ہوتا ہے۔حُسن کا فریب سر چڑھ کر بولتا ہے۔اب شاعر کہتا ہے کہ حُسن کی عیّاری نے گبر و مسلمان دونوں کے چلن بِگاڑ کے رکھ دیے ہیں کہ شیخ اِس کے دھوکے میں خُدا کی یاد دِل سے بھلا بیٹھا ہے اور مورتی یعنی بھگوان سے برہمن برہم ہوگیا ہے۔

دُوسرا شعر:۔ فرہاد شیریں سے محبت کرتا تھا۔اُس کو پانے کے لیے پہاڑ کھود کر دُودھ کی نہر لانے کی شرط رکھی گئی۔جب وہ اُس میں کامیاب ہوگیا تو اُسے معلوم ہوا کہ شیریں یعنی اُس کی محبوبہ مر چکی ہے تو اُس نے تیشہ سر پر مار کر خود کو ختم کر دیا۔اب شاعر کہتا ہے کہ فرہاد نے اپنی عزیز جان کھو کر کون سی غیرت کا کام کیا۔اگر اُس میں غیرت ہوتی تو وہ بادشاہ سے بگڑا ہوتا جس نے یہ شرط رکھی تھی۔

تیسرا شعر:۔ کبک وری: پہاڑی چکور

چکور کی چال بہت دِل کش ہوتی ہے۔لیکن وہ اکثر ٹھوکریں بھی کھاتا ہے۔اب شاعر محبوب کی مست چال کو دِل کش بتانے کے لیے صنعتِ حُسنِ تعلیل سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے محبوب تُمھاری چال اِس قدر حسین ہے کہ جانور بھی اِس کی نقل کرتے ہیں۔لہٰذا چکور نے تقلید کی مگر کہاں کر پاتا۔ایک جانور کی کیا بساط کہ وہ تُمھاری چال کی نقل اُتارے۔وہ اپنی چال، اپنی وضع خراب کر بیٹھا اور ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ مرنے کی بعد قبر آخری منزل ہوتی ہے۔عقیدہ ہے کہ حشر کے دِن سب مُردے قبر سے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔اب شاعر کہتا ہے کہ اِس زمین نے محشر یعنی قیامت کے دِن تک ہمیں امانت کی طرح سنبھال کر رکھا اور اِس طرح سنبھال کر رکھا نہ ایک بال تک ہمارا کم ہوا اور نہ ہی کفن کا کوئی دھاگہ ہی بگڑا۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا معشوق ہمیں گالیاں دیتا تھا۔اب اُس نے گالیوں کے ساتھ ساتھ مُنہ بھی چڑانا شروع کر دیا ہے۔گویا ہمیں چڑانے کے لیے مُنہ بھی ٹیڑھا بناتا ہے۔زبان تو اُس کی خیر خراب تھی ہی مگر اب اُس کی خیر و عافیت دریافت کرنی چاہیے کہ اُس کا مُنہ بھی بگڑ گیا ہے۔

4.12 غزل نمبر 9

سرِ شمع ساں کٹا یئے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

مقسوم کا جو ہے، سو وہ پہنچے آپ سے
پھیلایئے نہ ہاتھ، نہ دامن پساریے

طالب کو اپنے رکھتی ہے، دُنیا ذلیل وخوار
زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریے

تنہائی ہے، غریبی ہے، صحرا ہے، خار ہے
کون آشنائے حال ہے، کس کو پُکاریے

تُم فاتحہ بھی پڑھ چکے، ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں مِلا چکے، چلیے سدھاریے

نازُک دِلوں کو شرط ہے آتش! خیالِ یار
شیشہ خُدا جو دے تو پری کو اُتاریے

4.12.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
مقسوم کا	قسمت کا، مقدر کا	طمع	لالچ، حرص، ہوس

4.12.2 غزل (9) کی تشریح

پہلا شعر:۔شمع کا گل، بتی جب کٹتی ہے تو وہ آواز نہیں کرتی بلکہ اُس کی لو بڑھ جاتی ہے۔اِسی طرح جب کوئی حائل مُشکل کٹ جاتی ہے تو حوصلہ اور بڑھ جاتا ہے۔پس شاعر کہتا ہے کہ شمع کی طرح سر کٹا دیجئے مگر اُف نہ کیجیے اور منزلِ مقصود کتنی ہی مُشکل کیوں نہ ہو، ہمت مت ہاریئے۔اگر ایسا ہو سکا پھر منزل آسان ہو جائے گی۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ جو کچھ مُقدر میں ہوگا وہ خود بخود مِل جائے گا لہذا سوال کے لیے ہاتھ پھیلانا اچھی بات نہیں ہے کہ مُقدر میں اگر نہیں ہو تو کہاں ملتا ہے۔البتہ سُبکی ضرور ہوتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ طالب کو یعنی اُمید رکھنے والے کو دُنیا ہمیشہ ہی ذلیل رکھتی ہے۔ طلب گار کو کبھی عزت نہیں ملتی۔ لہذا یہ طلب ہی ہے، ہوس ہی ہے کہ وہ نالیوں سے خاک چھاننے پر مجبور کر دیتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ جذبۂ شوق میں اب ہم اُس مقام پر آ گئے ہیں جہاں غریب اُلوطنی، تنہائی، جنگل اور کانٹوں کے سِوا کچھ نہیں ہے۔ اب اِن میں سے کون ہمارے حال سے واقف ہے کہ جس کو آواز دیں، پُکاریں۔

چھٹا شعر:۔ غزل کے مقطعے میں شاعر کہتا ہے اے آتش محبوب کا خیال رکھنا کچھ بُری بات نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اگر خُدا نے یہ نرم و نازُک آئینے جیسا دِل دیا ہے تو پھر اِس میں محبوب کی تمثال اُتارنا لازم ہے۔

4.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر:۔ آتش کے حالات زندگی قلم بند کیجئے۔

سوال نمبر:۔ آتش کی غزل گوئی پر روشنی ڈالیئے۔

سوال نمبر:۔ آتش کی زبان و بیان پر بحث کیجئے۔

سوال نمبر:۔ آتش کے کلام کی اہم خصوصیات بیان کیجئے۔

سوال نمبر:۔ نصاب میں شامل آتش کی غزلیات کی تشریح معہ حوالہ کیجئے۔

4.15 کتابیات

1 مقدمہ کلام آتش، از خلیل الرحمٰن اعظمی، مطبوعہ، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ

2 خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی، حیات اور شاعری، از ڈاکٹر شعیب راہی، رانچی یونیورسٹی۔

3 انتخاب کلام خواجہ حیدر علی آتش، مرتبہ ولی الحق انصاری، مطبوعہ، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو۔

اکائی نمبر5

غالبؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح

ساخت:

5.1 سبق کا تعارف

5.2 سبق کا ہدف

5.3 غالبؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح

5.4 غزل نمبر1

5.4.1 فرہنگ

5.4.2 غزل کی تشریح

5.5 غزل نمبر2

5.5.1 فرہنگ

5.5.2 غزل کی تشریح

5.6 غزل نمبر3

5.6.1 فرہنگ

5.6.2 غزل کی تشریح

5.7 غزل نمبر4

5.7.1 فرہنگ

5.7.2 غزل کی تشریح

5.8 غزل نمبر 5

5.8.1 فرہنگ

5.8.2 غزل کی تشریح

5.9 غزل نمبر 6

5.9.1 فرہنگ

5.9.2 غزل کی تشریح

5.10 غزل نمبر 7

5.10.1 فرہنگ

5.10.2 غزل کی تشریح

5.11 غزل نمبر 8

5.11.1 فرہنگ

5.11.2 غزل کی تشریح

5.12 غزل نمبر 9

5.12.1 فرہنگ

5.12.2 غزل کی تشریح

5.13 غزل نمبر 10

5.13.1 فرہنگ

5.13.2 غزل کی تشریح

5.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

5.15 کتابیات

5.1 سبق کا تعارف

اردو زبان وادب کے درخشندہ ستاروں کی جھرمٹ میں ممتاز حیثیت کے مالک، اپنے عہد کے استاد اور عظیم فلسفی شاعر غالبؔ کی غزل گوئی اور جادو بیانی سے کون متعارف نہیں ہے۔ غالبؔ فطری طور پر چوں کہ فلسفیانہ ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے، اس لیے وہ مقتدی کی حیثیت سے شاعری کی دنیا میں بھلا اپنی پہچان کیوں کر بناتے؟ یہ ان کے ضمیر کو گوارہ نہ تھا اس لیے وہ اردو کی بے آب و گیاہ میدان میں اپنی جدت طرازی خیالات آفرینی، فکری بلندی اور ذہنی ہم آہنگی سے ایسی آب یاری کی کہ اس میدان کے مقتدیٰ اور امام تسلیم کیے گئے۔ غالبؔ نے قدیم روش پر چلنا بالکل پسند نہ کیا۔ اس لیے انھوں نے ایک الگ اچھوتی راہ پر اپنے آپ کو ڈھالا اور ان کے مزاج کی اس نفاست وندرت پسندی نے اردو غزل کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ اس سے پہلے غزل عاشقانہ مضامین کے بوجھ تلے سانسیں لے رہی تھی۔ بیچاری کیا کر بھی سکتی تھی۔ ہر طرف عاشقوں کا بول بالا تھا اور یہ حضرات محبت و نفرت کی بھڑاس نکالنے کے لیے اسی کو ذریعہ و آلہ بنا لیے تھے۔ پھر اس کی ملاقات زمانے کے ستائے ہوئے ایک دل کے دھنی شخص سے ہوئی۔ جس نے اس کو مختلف رنگوں سے سجایا اور نکھارا اور وہ شخص غالبؔ تھے۔

5.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں مرزا غالبؔ کے حالات زندگی اور ان کی غزلیات کی تشریح معہ حوالہ کی گئی ہے۔ اردو غزل میں غالبؔ کا نام اولیت کا مقام رکھتا۔ اس لئے طلبا کو غالبؔ کے کلام کو پڑھنا اور سمجھنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

5.3 غالبؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح

حالاتِ زندگی:۔ اسداللہ خان نام، مرزا نوشہ لقب اور نجم الدولہ الملک نظم جنگ شاہی خطاب تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے مگر آزاد کے ایک بیان کے مطابق جب یہی تخلص کسی اور نا معقول شاعر نے بھی رکھ لیا تو اُنہوں نے غالبؔ تخلص اختیار کر لیا۔ غالبؔ کے خاندان کا تعلق تہران سے تھا اور سلسلۂ نسب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ مرزا کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے۔ یہاں حاکمِ وقت نے اُن کی بڑی عزت افزائی کی۔ پانچ سو گاؤں کا علاقہ بہ طور جاگیر عطا کیا۔ مگر شاہِ عالم کی وفات کے بعد مُلک میں وسیع پیمانے پر بدنظمی کی وجہ سے وہ علاقہ اُن کے پاس نہ رہ سکا۔ غالبؔ کے والد عبداللہ بیگ خان، آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے۔ بعد میں لکھنؤ سے حیدرآباد چلے گئے۔ بالاخر الور آ کر مہاراجہ بختاور سنگھ کی مُلازمت کر لی اور یہیں ایک لڑائی میں ۱۸۰۱ء میں مارے گئے۔ اُس وقت مرزا کی عُمر صرف پانچ برس کی تھی۔ باپ کے اِنتقال کے بعد مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خان نے اُن کی پرورش کی۔

نصر اللہ بیگ خان، اکبر آباد کے صوبے دار تھے۔ ۱۸۰۶ء میں قُدرت نے مرزا کو اُن کے سایہ شفقت سے بھی محروم کر دیا۔ چونکہ اُن کو حاکمِ وقت نے سترہ سو روپے اور ڈیڑھ لاکھ سالانہ کی جاگیر عطا کی تھی۔ لہٰذا جو اُن کے ورثا تھے اُن کی پنشن مقرر ہوگئی۔ غالبؔ کو بھی سات سو روپے سالانہ ملتے رہے۔

شیخ ابراہیم ذوقؔ، بہادر شاہ ظفر کے اُستاد کے انتقال کے بعد غالبؔ چونکہ بہادر شاہ ظفر کے اُستاد ہو گئے تھے لہٰذا بہادر شاہ ظفر نے بھی غالبؔ کو پچاس روپے ماہوار اور خلعت مقرر کر دیے تھے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد بہادر شاہ ظفر آخری مغل تاجدار کا جو انجام ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ نتیجۂ غالبؔ کی تنخواہ بھی بند ہوگئی اور اس طرح غالبؔ کی زندگی بڑی تکلیف سے بسر ہونے لگی۔ مجبور ہو کر غالب رام پور چلے گئے۔ یہاں ایک سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ مگر وطن کی اُلفت نے مرزا کو وہاں چین نہ لینے دیا اور وہ واپس دہلی آ گئے۔ یہاں آنے کے تین سال بعد بڑی کوشش کرنے پر پینشن جاری ہوگئی۔ اس کے بعد غالبؔ دہلی ہی میں رہے۔ آخر ۱۸۶۹ء میں ۷۳ سال کی عُمر میں غالبؔ کا اِنتقال ہو گیا۔

غالبؔ کی شاعری:۔ مرزا غالبؔ کو فارسی سے بے حد لگاؤ تھا۔تمام عُمر وہ فارسی میں نہ صرف غیر معمولی دِل چسپی لیتے رہے بلکہ اِس زبان میں شعر بھی کہتے رہےاور ہندوستان کے فارسی شعراء میں نہایت بُلند مرتبہ تک پہنچ گئے۔غالبؔ کی طبعیت میں چونکہ متانت،ظرافت بڑی خوبی کے ساتھ یکجا ہوگئی تھی۔اس کے ساتھ اُن کے اخلاق اور شگفتگی مزاج کی وجہ سے مرزا کے کثیر الاحباب ہو گئے تھے۔ چنانچہ خط و کتابت کا سلِسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔اُن کے وہی خطوط آج اُردوٗ کا ایک بے نظیر مجموعہ ہو گئے ہیں۔جن کے اسلُوب نے نہ صرف مرزا کو بُلند مقام عطا کیا بلکہ اُردوٗ نثر کو ایک نئے انداز و اسلُوب کی راہ بھی دِکھائی۔

غالبؔ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔نو برس کی عُمر سے اُنہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔کہتے ہیں کہ نو برس کی عُمر میں انہوں نے مثنوی ''پتنگ'' لکھی تھی۔اگر یہ بات درُست ہے تو بچپن میں ہی غالبؔ کتنے ذہین تھے اور کس قدر شاعرانہ مذاق رکھتے تھے۔اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔اُنہوں نے غزل،قصیدہ،رُباعی،مرثیہ،قطعہ وغیرہ سب کچھ لکھا ہے اور ہر صنف میں اپنے مخصوص انداز واسلُوب سے کامیاب رہے۔مگر اُن کے ذہن رسا نے اُردوٗ غزل میں نئے نئے مضامین داخل کر کے اس صنفِ سُخن کو جو وسعت دی ہے،وہ تاریخِ ادب اُردوٗ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھی گئی ہے۔اُنہوں نے اُردوٗ شاعری کی دُنیا میں ایک اِنقلاب پیدا کر دیا۔اور میر تقی میرؔ،سرتاجِ شعراء اُردوٗ کی اُس پیش گوئی کو سچ کر دیا کہ اگر اس لڑکے نے صحیح راہ اختیار کر لی تو ایک دِن لاجواب شاعر بنے گا۔

مرزا غالبؔ کے کلام میں شوخی اور مزاح کا پہلو بہت نمایاں ہے۔یہ شوخی و مزاح اُن کی شخصیت کا ایک حِصّہ ہے۔شاعری میں کبھی زاہد سے چھیڑ چھاڑ کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی جنت و دوزخ کا مذاق اُڑاتے ہیں۔مرزا چاہے نثر لکھیں یا شعر کہیں،اُن کا اندازِ اسلُوب ہی اُن کی پہچان ہے۔نثر میں اُنہوں نے جو اسلُوب اختیار کیا آج تک لوگ اُس کی تقلید کرتے ہیں اور شاعری میں بھی جدّتِ مضامین کے ساتھ اُنہوں نے جدتِ اسلُوب سے کام لیا ہے۔اُن کی شاعری کی مستحکم بُنیاد اُن کی اسی جدّت طرازی پر قائم ہے،جس میں جدتِ الفاظ بھی شامل ہیں۔عام اور فرسودہ مضامین

بھی مرزا غالبؔ ایک خاص طرز ادا سے بالکل نئے اسلُوب سے ادا کر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا خاص لُطف محسوس کرتا ہے۔خود اُنہوں نے اپنے نئے اور دلکش انداز کا تذکرہ کیا ہے۔ایک جگہ کہتے ہیں۔

ہیں اور بھی دُنیا میں سُخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا اہے ندازِ بیاں اور

اسی طرح ایک اور شعر میں اُنہوں نے اپنے دلفریب اندازِ بیان کا ذکر کیا ہے۔

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

بات سے بات پیدا کرنا اُن کے کلام کی ایک بڑی خوبی ہے۔وہ کسی چیز کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بجائے اُس کے چند پہلوؤں کا ذکر کچھ اِس انداز سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کا ذہن اُس کے لوازم اکٹھے کر لیتا ہے۔گویا وہ ایک سُر چھیڑتے ہیں اور سُننے والے کا ذہن پُورا راگ ضبط کر لیتا ہے۔اس کے ساتھ ہی مرزا کے کلام میں جذبات کا صحیح عکس ملتا ہے۔وہ زندگی اور مختلف کیفیاتِ زندگی کی ہو بہو تصویر اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔غم واندوہ کے نالے، نا اُمیدی کی کیفیت، خوشی کے ترانے، گویا ہر طرح کے جذبات کی عکاسی کرنے میں مرزا کو کمال حاصل تھا اور بہ قول خود اُن کے پڑھنے والا یقیناً محسوس کرتا ہے کہ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں ہے

اِس بات میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں اور تمام ناقدین تسلیم بھی کرتے ہیں کہ اُردو شاعری میں غالبؔ کا مقام بہت بُلند ہے۔اُن کی معلومات وسیع اور اُن کا تخیل بُلند تھا۔گو اُن کو اپنی فارسی شاعری پر بڑا ناز تھا مگر جو شہرت اُردو شاعری اور بالخصوص اُردو غزل میں ملی وہ فارسی گوئی سے حاصل نہیں ہو سکی۔مرزا کی اُردو شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اُن کی شاعری کا پہلا دور اُن کی شاعری کا اِبتدائی دور ہے۔اور اس دور میں اُن کے کلام میں دو چیزیں نظر آتی ہیں۔اوّل اُن کی مُشکل پسندی اور دوم کلام میں فارسی کی رنگ آمیزی۔اس دور کی شاعری میں عجیب وغریب تشبیہات اور استعارات کے ساتھ ساتھ نا قابلِ فہم بُلند پروازیاں کثرت سے ملتی ہیں۔مگر اس دور میں بھی اُن کی انفرادیت مُسلم ہے۔اسی دور میں اُنہوں نے فارسی کے مشہور اور مُشکل پسند شاعر بیدلؔ کی پیروی کرنے کی سعی کی ہے۔گو اس روش کو مرزا نے خوب نبھایا ہے مگر پھر بھی یہ روش کچھ آسان نہ تھی۔خود مرزا نے ایک جگہ کہا ہے۔

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خان قیامت ہے

ماہرین کی نکتہ چینی اور دوستوں کے مشوروں نے غالبؔ کو یہ رنگ ترک کرنے پر آمادہ کرلیا۔یہیں سے اُن کے دُوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔اس دور میں فارسی رنگ آمیزی کا اثر کچھ کم ہوگیا۔زبان میں صفائی وسادگی اور شگفتگی آ گئی ،جس سے کلام کی تاثیر میں بے پناہ اضافہ ہوا۔فارسی تراکیب اور محاورات کا استعمال بھی کم ہو گیا۔مگر فکر ونظر کی بُلندی برابر قائم رہی۔

مرزا غالبؔ کی شاعری کا تیسرا دور اُن کے کمالِ فن کی انتہا ہے۔اس دور کا کلام جامعیت اور اختصار میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔اس دور کے کلام میں جدّت وندرتِ خیال کے ساتھ زبان کی لطافت ،شگفتگی وشتگی بڑا لُطف دیتی ہے۔اس دور میں ایجازِ کلام کے ساتھ سادگی ،سلاست اور نازُک خیالی ،جدّت طرازی سب کچھ بدرجہ اتم موجود ہے اور اسی سے غالبؔ کو شعرائے اُردوٗ کی صفِ اوّل میں نہایت ممتاز جگہ ملتی ہے۔

غالبؔ کے اشعار دل کے ساتھ دماغ کو بھی متاثر کرتے ہیں۔غالبؔ اُردو کے پہلے بڑے فلسفی شاعر تھے۔ اُن کے اکثر اشعار میں تلخ حقائق بڑی آسانی ،سادگی اور شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ہوتے ہیں۔وہ رموز وحقائق اور تصوف سے پُوری طرح واقف تھے۔وہ خود زندگی ہی کو ایک بڑی مُصیبت خیال کرتے ہیں۔ بلکہ حیات کو ایک قید خیال کرتے ہیں۔ایک جگہ کہتے ہیں۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مرزا کے کلام میں آلام و مصائب میں بھی ایک عظمت پوشیدہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر مرزا کی ظرافت و شوخی اس مایوسی و تاریکی کو اکثر دُور کر دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حزن و یاس کے بادلوں میں ظرافت کی دھوپ چھن رہی ہے۔ کہیں کہیں ضد کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

دِل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت ، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

کہیں کہیں غالبؔ ایک کامل مصّور کی طرح ایسی ایسی تصویریں کھینچتے ہیں کہ دیکھتے ہی بنتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

قفس میں مُجھ سے روداد چمن کہتے ہوئے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ایک جگہ اور کہتے ہیں۔

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس زیب تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

یا پھر ایک جگہ کہتے ہیں۔

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تری زُلفیں جس کے بازو پر پر یشاں ہو گئیں

اِس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کلامِ غالبؔ میں اُن کے اعلیٰ خیال، فلسفۂ حیات، ذہانت، طباع اور خصوصیت سے نئے اور انوکھے انداز واسلوب کی وجہ سے غالبؔ نہ صرف اپنے معاصرین میں بلکہ اس پُوری کائناتِ اُردو ادب کے فلک پر مۂ کامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

5.4 غزل نمبر 1

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا ؟	کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ	صُبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اِختیارِ شوق دیکھا چاہیے	سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے	مُدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا
بس کہ ہوں غالبؔ! اسیری میں بھی آتش زیرِپا	موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

5.4.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
پیرہن	لباس، پوشاک	شوخی	بے باکی، تیز رنگ، بے حجابی، شرارت
جوئے شیر	دودھ کی ندی	شمشیر	کٹار، تلوار
دام	جال، پھندہ، عشق میں گرفتاری	شنید	سننا، گفتار، بحث، تکرار
عنقا	نایاب، ناپید، انمول، نادر	موئے آتش دیدہ	آگ کا دکھایا ہوا بال، پیچ دار بال

5.4.2 غزل (1) کی تشریح

پہلا شعر:۔ غالبؔ نے اِس شعر میں زندگی کی بے ثباتی کا تذکرہ کیا ہے۔ ہر پیکرِ تصویر سے مُراد تمام موجودات سے ہے اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ اب جب یہ موجودات کا عالم ہے تو نقشِ ہستی کا اپنے کاغذی لباس یعنی بے ثباتی پر فریادی ہونا فطری ہے۔ پس غالبؔ کہتے ہیں کہ یہ کس بیدادِ تحریر کے نقش ہیں جو فریاد لیے ہوئے ہیں اور جن کے لباس

کاغذی ہیں۔ ایک روایت ہے کہ ایران میں کسی زمانے میں فریاد کرنے والا کاغذی لباس پہن کر دربار میں حاکم کے سامنے جاتا تھا تاکہ وہ سینکڑوں میں پہچانا جاسکے کہ یہ کوئی مظلوم ہے اور فریاد لے کر آیا ہے۔

دُوسرا شعر:۔ کاوکاو کے معنی کاوش و کاہش کے ہوتے ہیں۔ لفظی تکرار نے شعر میں حُسن پیدا کر دیا ہے اور جُستجُو کے معنی پیدا کر دیے ہیں۔ اب شاعر کہتا ہے کہ جُدائی کی رات کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہے یہ مجھ سے مت پوچھو کہ فُرقت کی رات کاٹنا، اُس کا صُبح کرنا اُتنا ہی مُشکل اور دشوار ہوتا ہے، جتنا دشوار فرہاد کے لیے پہاڑ کاٹ کر شیریں (اُس کی محبوب) کے محل تک نہر لانا تھا۔ شاعر نے خود کو کوہ کُن اور شبِ ہجر کی سختی کو پہاڑ کاٹنے اور نہر لانے سے تشبیہ دی ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر محبت میں جان دینے کو شہادت قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے اندر شہادت کا جذبہ اِتنا زیادہ ہے اور اِس کی کشش کا یہ عالم ہے کہ تلوار کے سا سینے سے اُس کا دم یعنی دھار بھی باہر آ گئی ہے۔ یعنی وہ میرے قتل کے لیے اِس قدر بے اِختیار ہوگئی ہے کہ اُس کا دم سینے سے باہر نکلا پڑتا ہے۔ حُسنِ تعلیل ہے کہ تلوار کی دھار تو ویسے ہی باہر ہوتی ہے۔ مگر شاعر کوئی دُوسرا شاعرانہ سبب بتاتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے اشعار عنقا صفت ہیں اور یہ دامِ شنیدن میں نہیں آسکتے۔ مطلب ہے کہ عقل کتنی ہی سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کر لے وہ ہمارے مفہوم کو نہیں پاسکتی۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میں زنجیر میں ایسا بے قرار ہوں کہ دِل کی گرمی سے میرے پیروں کی زنجیروں کے حلقے جلے ہوئے بالوں کی طرح کمزور ہوگئے ہیں۔ گویا میری بے قراری کے آگے اِن زنجیروں کی کوئی وُقعت نہیں ہے۔

5.5 غزل نمبر2

هرایک بات پہ کہتے ہوتُم کہ ''تُو کیا ہے؟'' | تمھیں کہو، کہ یہ اندازِ گفتگُو کیا ہے؟
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا | کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خُو کیا ہے؟
یہ رشک ہے، کہ وہ ہوتا ہے ہم سُخن تم سے | وگرنہ خوفِ بد آموزی عدو کیا ہے؟
چپک رہا ہے بدن پر، لہو سے پیراہن | ہماری جیب کو اب حاجتِ رفُو کیا ہے؟
جلا ہے جسم جہاں، دِل بھی جل گیا ہوگا | کریدتے ہو جو اب راکھ، جُستجُو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل | جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھرلہو کیا ہے؟
وہ چیز، جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز | سوائے بادۂ گُلفام مشکبو، کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گُفتار، اور اگر ہو بھی | تو کس اُمید پہ کہیے، کہ آرزؤ کیا ہے؟
ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اِتراتا | وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

5.5.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
برق	بجلی، تیز، پھرتیلا، چالاک	تندخو	غصہ والا طبعیت
رشک	ہم پیشہ ہونے کا حسد، غطبہ	بدآموزی	براکام، بدعمل
عدو	دشمن، مخالف، رقیب	بادہ	شراب، مے، دارو

5.5.2 غزل (2) کی تشریح

پہلا شعر:۔ محبوب عاشق کی ہر بات کھیل میں اُڑاتا ہے۔ اُس کو طنزاً کہتا ہے کہ تمھاری حقیقت کیا ہے، تو خود کو سمجھتا کیا ہے، تو کس ہوا میں ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ خُدارا تُم ہی بتاؤ کہ یہ بھی کوئی بات کرنے کا سلیقہ ہے اور اِس طرح توہین آمیز طرزِ گفتگو کیا تمھیں زیب دیتی ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر محبوب کی تندخوئی کے سبب سے اُسے کبھی شعلہ کہتا ہے اور کبھی برق، لیکن وہ حیران ہے کہ نہ وہ کرشمہ شعلے میں ہے جو اُس محبوب میں ہے اور نہ برق میں وہ ناز و ادا ہے۔ لہذا وہ پوچھتا ہے کہ کوئی مجھے بتائے کہ وہ اُسے کیا کہے۔

تیسرا شعر:۔ رقیب محبوب سے بات کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے اِس بات کا ڈر نہیں ہے کہ میرا رقیب یعنی دُشمن میری چغلی کھائے گا اور میری طرف سے تجھ کو بدگُمان کر دے گا۔ یعنی میرے خلاف تمھارے کان بھرے گا۔ بلکہ مجھے رشک تو اِس بات پر ہے کہ وہ تُم سے بات کرتا ہے، ہم کلام ہوتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اِس شعر میں بدن سے خون بہنے کا کوئی سبب بیان نہیں کیا ہے۔ لڑکوں نے پتھر مار کر خون بہایا ہے، خود سر پھوڑ لیا ہے یا پھر خون کے آنسو رو رو کر۔ یہ سب احتمال ہیں مگر تعین نہ کرنے سے شعر میں لطف پیدا ہو گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے گریباں کو اب رفو کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہے کیوں کہ لہو کے سبب سے پیراہن اب خود بدن سے چپک گیا ہے۔

پانچواں شعر:۔ عاشق سوزِ عشق سے جل گیا ہے۔ اب معشوق اُس کی راکھ کُریدر ہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے نادان اب راکھ کُرید کر کیا تلاش کرتا ہے۔ کہ جہاں جسم جل گیا ہے وہاں دِل کیا بچ گیا ہوگا جو اُس کی تلاش کرتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم اُس لہو کو لہو نہیں مانتے جو محض رگوں میں گردش کرتا ہے، دوڑتا پھرتا ہے۔ کہ یہ تو ہر کسی کے ہاں دوڑتا ہے۔ اِس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ہم تو اُس کو لہو مانتے ہیں جو آنسو بن کر آنکھ سے ٹپکتا ہے۔ گویا جو خون بن کر نہ ٹپکے وہ عاشق کا لہو نہیں ہو سکتا اور اُس کی کوئی وُقعت نہیں۔

ساتواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمیں بہشت بہت عزیز ہے اور وہ محض اِس لیے ہے کہ وہاں نہایت عُمدہ شراب ملے گی اور بہت زیادہ ملے گی۔ اِس کے علاوہ اور کیا چیز ہوسکتی ہے جس کے لیے ہمیں جنت اِس قدر عزیز ہو۔

آٹھواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ایک تو ہم میں بات کرنے کی طاقت ہی نہیں رہی ہے۔ عشق میں ہم اِس قدر ضعیف ہو چکے ہیں کہ اب بات کرنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔ بالفرض اگر ہو بھی تو کس اُمید پر اپنی آرزؤ وں کا اِظہار کریں۔ کیوں کہ نہ ہی اُس نے ہماری کوئی آرزؤ پوری کی ہے اور نہ اِس کی توقع ہی ہے کہ وہ ہماری کوئی آرزؤ پوری کرے گا۔

نواں شعر:۔ مقطع سے متعلق روایت مشہور ہے کہ ایک دِن اُستاد شاہ شیخ ابراہیم ذوقؔ پالکی میں بیٹھے جا رہے تھے کہ مرزا کی نظر پڑی۔ اب اُس سے مرزا کی معاصرانہ چشمک تھی۔ مصرعہ ''ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا'' پڑھ دیا۔ ذوقؔ نے سُن لیا اور بہادر شاہ ظفر سے شکایت کی۔ ظفر نے غالب کو بُلوایا اور مصرعہ سُنا کر پوچھا کہ آپ نے کون سی غزل کہی ہے۔ غالبؔ نے پوری غزل سُنائی اور مقطعے میں یہ مصرعہ شامل کر دیا۔

اِس میں شاعر نے کہا ہے کہ ذرا غالبؔ کو ملاحظہ فرمائیے کہ بادشاہ کے مصاحب بن کر کس طرح اِتراتے پھرتے ہیں ورنہ شہر میں اِن کی جو آبرو ہے، وہ معلوم ہی ہے یعنی کچھ نہیں ہے۔

5.6 غزل نمبر3

آہ کو چاہیے اِک عُمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے، تری زُلف کے سر ہونے تک؟
دام ہر موج میں ہے، حلقہ صدِ کام ِ نہنگ
دیکھیں کیا گُزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دِل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک؟
ہم نے مانا، کہ تغافل نے کرو گے ،لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تُم کو خبر ہونے تک
پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل!
گرمیِ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہونے تک
غم ہستی کا ، اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

5.6.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
دام	جال، پھندہ	نہنگ	برہنہ، بے حیا، ننگا، عریاں، بے عزت
بیتاب	بے چین، گھبراہٹ	تغافل	کم توجہی، بے پرواہی، بے خبری

5.6.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر:۔ آہ کو اثر پیدا کرنے کے لیے عرصہ درکار ہوتا ہے اور جب تک آہ میں اثر پیدا ہوگا اور تمھاری زُلف ہمارے دِل کے حالِ زار سے آگاہ ہوگی تب تک ہم زندہ کہاں رہیں گے۔ہم مر چکے ہوں گے۔

دُوسرا شعر:۔ بارش کا پہلا قطرہ سیپی میں گرتا ہے تو وہ موتی بنتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ ہر موج ایک جال کی مانند ہے اور اِس جال کا ایک ایک حلقہ مُنہ کھولے مگر مچھوں کا بنا ہوا ہے۔گویا سینکڑوں مگر مچھ مُنہ کھولے ہوئے ہیں۔ایسی خطرناک صورت میں ایک قطرۂ آب کے موتی بننے تک اُس پر کیا کیا مُصیبتیں حائل ہوتی ہیں۔درِ پردہ غالبؔ کہتے ہیں کہ اِنسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مُشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ عاشقی میں صبر ضروری ہے کہ صبر کے بغیر معاملات بگڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔لیکن آرزؤ بے قرار کیے رہتی ہے کہ مُراد پوری کرنے میں جلدی کر۔اِس طرح میں عجیب کشمکش میں پھنس گیا ہوں۔ایسی صورت میں جب تک جگر خون ہو کر عشق میں پختگی پیدا ہو میں دِل کا کیا علاج کروں۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ہمیں معلوم ہے کہ تُم ہماری جانب تغافُل نہیں کروگے اور ہماری خبر لوگے۔لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک تمھیں ہماری حالتِ زار کی خبر پہنچے گی تب تک ہمارا کام تمام ہو چکا ہوگا۔مطلب یہ کہ ہم سوزِ دِل کو برداشت نہیں کر سکیں گے اور ختم ہو جائیں گے۔

پانچواں شعر:۔ اِس شعر میں غالبؔ کہتے ہیں کہ جس طرح دھوپ شبنم کو فنا کی تعلیم دیتی ہے یہی حالت ہماری ہے کہ اے محبوب تُم آفتاب ہو اور میں شبنم کا ایک قطرہ اور میری زندگی محض تمھاری محبت بھری نظر تک ہے۔تُم سورج کی طرح مجھ پر اپنا پرتو ڈالوگی تو میں شبنم کی طرح فنا ہو جاؤں گا۔

ساتواں شعر:۔ شاعر خود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے اسدؔ زندگی کے غموں کا موت کے سوا دُوسرا کوئی علاج نہیں ہے کہ جب تک زندگی ہے غم رہے گا اور موت کے ساتھ ہی یہ ختم ہوگا۔دیکھو کہ محفلِ غم ہو یا بزمِ نشاط، شمع کو ہر صورت صُبح

تک جلنا ہی پڑتا ہے۔ جب تک صُبح نہیں ہوتی اور اُسے بجھا نہیں دیا جاتا یعنی ختم نہیں کر دیا جاتا اُسے جلنا پڑتا ہے۔ اِسی صورت غمِ حیات بھی موت کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔

5.7 غزل نمبر 4

هوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ؟ نہ ہو مرنا ، تو جینے کا مزہ کیا؟
فروغِ شعلہ خس یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟
دماغ عطرِ پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟
دِل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟
سُن اے غارت گر جنسِ وفا سُن شکستِ قیمتِ دِل کی صدا کیا؟
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ شکیب خاطر عاشق بھلا کیا؟
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ؟ یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا؟
بلائے جاں ہے غالبؔ! اُس کی ہر بات عبارت کیا ؟ اِشارت کیا؟ ادا کیا؟

5.7.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
نشاط	خوشی،طرب،انبساط	خس	سوکھی گھاس،کوڑا کرکٹ،کمزور، بے بس
انا البحر	میں سمندر ہوں	غارت	لوٹ کھسوٹ،لوٹ مار

5.7.2 غزل(4) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ دُنیا میں جو چہل پہل ہے اِس یقین کے سبب سے ہے کہ دُنیا میں رہنے کی مہلت بہت تھوڑی ہے۔ یہ اِنسانی فطرت ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوگی اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو انجام دیتا ہے اور جس قدر مہلت زیادہ ملتی ہے اُسی قدر کام میں تاخیر کرتا ہے۔ بس اگر موت نہ آیا کرتی اور ابد تک زندہ رہنا ہوتا تو جینے میں کوئی مزہ نہ آتا۔ کیوں کہ نہ تو یہ جوش وخروش ہوتا اور نہ یہ چہل پہل۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اہلِ ہوس کی محبت تنکے کے شعلے کی طرح ہے کہ دم بھر سے زیادہ روشن نہیں رہ سکتا۔ بھلا ایسے لوگوں کو وفا کی عزت کا کیا پاس ہوگا۔ دُوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ رقیب کی محبت چار دِن کی ہے۔ اُس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ وفا کی ناموس کہاں رکھ سکتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر صبا پیراہنِ محبوب کی خوشبو کو چارسُو پریشان کرتی پھرتی ہے تو ہمیں اِس کا غم نہیں ہے۔ اِس کا غم کیسا؟ غم تو جب ہوتا کہ ہم اِس سے لُطف اندوز ہو سکتے۔ مگر ہم تو سونگھ ہی نہیں سکتے کیوں کہ ہمیں اِس کی برداشت ہی نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر قطرے کے سازِ دِل سے انا البحر کا نغمہ نکل رہا ہے۔ ''میں سمندر ہوں'' کا گویا گیت گا رہا ہے۔ قطرہ اگر چہ بہت چھوٹا ہے لیکن جب دریا میں مِلتا ہے تو دریا بن جاتا ہے۔ اِس کے طرح ہر قطرہ دریا ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اِسی طرح ہم بھی اُس بحرِ بیکراں کے جُز ہیں۔ لہٰذا قطرے کی مانند ہم بھی انا الحق یعنی میں خُدا ہوں کے مُدعی ہیں۔

پانچواں شعر:۔ اے عاشقوں کو برباد کرنے والے معشوق ذرا غور سے سُن کہ دِل کی قیمت توڑنے میں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اِسی لیے دِل کو نہ توڑ۔ یعنی دِل کی بے قدری مت کر۔ کیوں کہ اِس کے ٹوٹنے کی آواز سے تمھیں جو لُطف اندوز ہونے کی سُوجھی ہے وہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوگی۔ اِس لیے کہ اِس کے ٹوٹنے سے کوئی آواز ہی پیدا نہیں ہوگی جو تُو سُن سکے اور لُطف انداوز ہو سکے۔

چھٹا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے کب دعویٰ کیا کہ تمھاری جُدائی میں مجھے قرار آئے گا۔ عاشق کا یہ دعویٰ کرنا حقیقت

ہی کیا رکھتا ہے۔ تُم میرے صبر و استقلال کو پل بھر میں غارت کر سکتے ہو۔ لہذا جگر داری کا دعویٰ کرنے کی غلط فہمی سے جو تُم بدگُمان ہو گئے ہو۔ وہ بدگُمانی دُور کرو اور مجھے زیادہ بے چین نہ کرو۔

ساتواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اے قاتل محبوب تو یہ صبر آزما وعدہ مجھ سے کیوں کرتا ہے۔ تیرے لیے یہ معمُولی بات ہے لیکن میرے لیے یہ صبر آزما وعدہ فِتنہ طاقت رُبا ہے۔ یعنی ایسا فِتنہ ہے جو طاقت کو زائل کرتا ہے۔ سکت باقی نہیں رہنے دیتا۔

آٹھواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی ہر بات میرے لیے بلائے جان ہے۔ گویا سخت مُصیبت ہے۔ وہ چاہے اُس کی تحریر ہو، چاہے اِشارہ ہو، چاہے ناز و انداز ہو۔ با الفاظ دیگر میرے اندر عشق کا جذبہ اِس قدر تیز ہے کہ محبوب کی ہر بات، ہر ادا دِل میں بے قراری پیدا کر دیتی ہے۔

5.8 غزل نمبر 5

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دِل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا، یعنی — پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزُر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزُر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال — دِلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ، لڑکپن میں اسؔد! — سنگ اُٹھایا تھا، کہ سر یاد آیا

5.8.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
دیدۂ تر	بھیگے ہوئی آنکھیں، آنسو بھری آنکھیں	ہنوز	ابھی تک، اب تک
نیرنگ	دھوکہ، فریب، شعبدہ، دغا	سنگ	پتھر، وزن، بوجھ

5.8.2 غزل(5) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ آج پھر مجھے دیدۂ تر یاد آ گیا ہے۔یعنی اپنی اشک آلودہ آنکھ یاد آ گئی ہے اور نتیجے کے طور پر میرا دِل وجگر فریاد کا آرزو مند ہو گیا ہے۔گویا پھر اُسی گریہ وزاری کی لذت حاصل کرنے کی سعی اِس میں پیدا ہو گئی ہے۔

دُوسرا شعر:۔ محبوب کو رُخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت دِل کی ہوئی تھی اُس کو شاعر نے قیامت سے تعبیر کیا ہے۔ابھی اُس قیامت نے دم بھی نہ لیا تھا یعنی اُس کے چلے جانے کے بعد ابھی دِل سنبھل بھی نہیں پایا تھا،سکون پذیر بھی نہ ہو سکا تھا کہ پھر اُس کے جُدا ہونے کا منظر یاد آ گیا اور دِل میں پھر وہی تلاطم پیدا ہو گیا۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میری تمنا کی سادگی اور نادانی دیکھیئے کہ مجھے پھر وہی شاطر محبوب یاد آ رہا ہے جس کی نیز نگ نظری نے میری زندگی تباہ کر دی۔سادگی یہی کہ معلوم ہے کہ اُس سے آرزو پوری نہیں ہو گی پھر بھی اُس کی طرف دھیان ڈھلا جاتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہماری یہ زندگی کسی نہ کسی طرح گُزر ہی جاتی تھی۔ہمیں بے کار ہی تیری راہ گُزر یاد آ گئی۔کیوں کہ اُس کا یاد آنا کسی طرح بھی سُودمند نہیں ہے۔اِس لیے اُس کا یاد آنا فضول ہے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا خیال مجھے تیرے کُوچے کی طرف لیے جا رہا ہے۔شاید وہ کھوئے ہوئے دِل کو اُدھر ڈھونڈنے چلا ہے۔کیوں کہ تیرے کُوچے ہی میں دِل کے کھو جانے کا شک ہے،وہم ہے۔

چھٹا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہمارے گھر کی سی ویرانی کہیں اور نہیں ہو سکتی۔مگر دشت کی ویرانی کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہم غلط تھے۔کیوں کہ دشت بھی ہمارے گھر ہی کی طرح ویران ہے کہ اُس کی ویرانی کو دیکھ کر ہمیں اپنا گھر یاد آ گیا ہے۔

ساتواں شعر:۔ عام طور پر پاگل کو بچے پتھر مارا کرتے ہیں۔غالبؔ کہتے ہیں کہ بچپن میں میں نے مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اُٹھایا تھا کہ تبھی مجھے اپنا سر یاد آ گیا۔مُراد یہ ہے کہ مجھے خیال آیا ہے کہ ہو سکتا ہے کل کو میں بھی دیوانہ ہو جاؤں اور لڑکے مجھے پتھر ماریں۔اِس لیے میں نے پتھر نہیں مارا۔

5.9 غزل نمبر6

دِل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار ، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم ، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟
جب وہ جمال دِل فروز، صورت مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں مُنھ چھپائے کیوں؟
دِشنۂ غمزدہ جاں ستاں، ناوک ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟
قید حیات وبند غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟
حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بو الہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟
واں وہ غرور عزوناز، یاں یہ حجابِ پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں؟
ہاں ، وہ نہیں وفا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دِل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟
غالبؔ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا؟ کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

5.9.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
سنگ وخشت	پتھر اور ریت، پتھر اور اینٹ	دیر	بت کدہ، مندر، شوالہ
مہر	آفتاب، خورشید، سورج	دشنہ	کٹار، چھری، تیز اوزار
حسن ظن	نیک خیال، اچھی رائے		

5.9.2 غزل (6) کی تشریح

پہلا شعر:۔ لگتا ہے کہ معشوق عاشق کو رونے سے روکتا ہے اور عاشق ضبطِ گریہ نہیں کر پا رہا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ ہمارا دِل کوئی اینٹ پتھر تو نہیں کہ کوئی ستائے جائے اور یہ برداشت کرتا رہے۔ اب ہم سے صبر نہیں ہوتا۔ ہم روئیں گے اور ایک بار نہیں ہزار بار روئیں گے۔ کوئی ہمیں کیوں ستائے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم سرِ راہ بیٹھے ہیں اور ظاہر ہے راستہ کسی کی جاگیر نہیں، ہر شخص اِستعمال کر سکتا ہے۔ یہ بُت خانہ یا کعبہ کا در نہیں کہ کوئی ہمیں وہاں سے نِکال دے۔ نہ ہی کسی کی دہلیز ہے کہ یہاں سے ہمیں اُٹھا دیا جائے۔ لہذا رقیب ہمیں یہاں سے اُٹھ جانے کے لیے کیوں مجبور کرتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ جب محبوب کا جمال دِل فروز دوپہر کے سُورج کی مانند نظارہ سوز ہے کہ اُس کو کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا تو پھر وہ اپنا چہرہ پردے میں کیوں چھپاتا ہے۔ وہ کیوں بے نقاب نہیں ہوتا۔

چوتھا شعر:۔ شاعر محبوب سے مُخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ اے محبوب تیرے ناز کے خنجر جان لینے والے اور تیری اداؤں کے تیر بے پناہ ہیں کہ کسی کو اِن سے امان نہیں مل سکتی۔ اب جب تیرے ناز و ادا کی جانستانی کا یہ عالم ہے تو کس کی مجال جو تیرے سامنے آئے۔ بلکہ جب تیرے ہی رُخ کا عکس تیرے سامنے پڑے گا تو اُس کو بھی گزند پہنچے گی۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ حیات کی قید اور بندِ غم دراصل دونوں ایک ہی ہیں۔ دونوں میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ جو آدمی زندگی کی قید میں ہے وہ ہمیشہ مصائب و آلام میں مُبتلا رہتا ہے اور جو شخص مُشکلوں میں گرفتار ہے وہ بھی رنج وغم میں پھنسا رہتا ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ جب تک انسان زندہ ہے اُس کو غم سے نجات نہیں مل سکتی۔ اور جب موت آئے گی تو غم بھی نہیں رہے گا۔

چھٹا شعر:۔ اِس شعر میں غالب کہتے ہیں کہ ایک تو محبوب بہت حسین ہے اور اُس پر اُسے گُمان، جو دُرست ہے کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرے غمزے کا تیر کبھی خطا نہیں ہوتا۔ اب جب اُس کو ایسا یقین ہے تو وہ رقیب کا امتحان کیوں لے۔ اِس طرح اِس حُسنِ ظن نے رقیب کی لاج رکھ لی ورنہ رقیب کوئی سچا عاشق نہیں۔ اگر محبوب اُس کا امتحان لے لیتا تو حقیقت عیاں ہو جاتی۔

ساتواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب سے ہم راستے میں اِس لیے نہیں ملتے کہ ہم کو اپنی وضع داری کا پاس ہے اور نہ ہی ہماری غیرت اِس بات کی اِجازت دیتی ہے کہ ہم اُس سے سرِ راہ بات کریں۔ اُدھر وہ ہمیں اپنی محفل میں اِس لیے نہیں بُلاتا کہ اُس کے عزّ وناز میں فرق آتا ہے۔ لہذا اِن حالات میں اُس سے مُلاقات کیوں کر ہو سکتی ہے۔

آٹھواں شعر:۔ عاشق کے ہمدرد اُس کو سمجھاتے ہیں کہ تیرا محبوب بے وفا ہے۔ اُس کے عشق سے باز رہ۔ ایسے بے وفا کے لیے اپنے دین و دُنیا خراب مت کر۔ عاشق یہ سُن کر ناراض ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ چلو وہ بے وفا ہی سہی۔ وہ کافر ہی سہی۔ جس کو اپنا دین و دِل پیارا ہے وہ اُس کی گلی میں نہ جائے۔ یعنی تمھیں اپنا دین و دِل عزیز ہے تو اُس سے عشق نہ کرو۔ مگر ہم تو جائیں گے اور اُس سے عشق کرتے رہیں گے۔

نواں شعر:۔ غزل کے آخری شعر میں جیسے غالبؔ مر گئے ہیں۔ احباب غم میں زار زار رو رہے ہیں اور سینے پیٹ کر ہائے ہائے کر رہے ہیں۔ اب اُن احباب کو تسکین دینے کے لیے کہا جاتا ہے کہ غالبؔ کی ذات سے تو کچھ خاص فائدہ نہ تھا اور اُس کے مر جانے سے تمھارے کون سے کام بند ہو جاتے ہیں۔ لہذا تُم اِس طرح ہائے ہائے کر کے زار زار کیوں رو رہے ہو۔

5.10 غزل نمبر 7

منظو رتھی یہ شکل ، تجلی کو نُو ر کی — قسمت کھلی تیرے قدو رُخ سے ظہور کی
اِک خوں چکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
وا عظ ! نہ تُم پیو ، نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تُمہاری شرابِ طہور کی
آ مد بہا ر کی ہے ، جو بُلبُل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام میں ، لیکن نہ اِس قد ر — کی جس سے بات ، اُس نے شکایت ضرور کی

5.10.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
خون چکاں	دردناک، خون ٹپکانا	شراب طہور	جنت کی پاک شراب
طیور	پرندے	کوہ طور	مصر کی جس پہاری پر خدانے جلوہ دکھایا تھا

5.10.2 غزل (7) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ نُو رِ خُدا کو اپنا جلوہ دِکھانے کے لیے تیرے ہی قد و رُخ کا اِنتظار تھا کہ ایسی حسین اور پیاری صورت ملے تو اُس میں ظہور کروں۔ لہذا تیرے قد و رُخ کے سبب گویا ظہور کی قسمت کھل گئی ہے کہ وہ ظاہر ہو سکی ہے۔

دُوسرا شعر:۔ خون ٹپکتے لباس کو دیکھ کر ہر شخص وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن تیرے شہیدوں کے خون چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں اور وہ ایسے بھلے معلُوم ہوتے ہیں کہ حوریں بھی اُنھیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور دِل سے پسند کرتی ہیں۔

تیسرا شعر:۔ اِس شعر میں شاعر واعظ کو مُخاطب کر کے کہتا ہے کہ تمھاری شرابِ طہور، اُس پاکیزہ شراب کی جو جنت میں

ملے گی، کی کیا بات ہے کہ نہ تُم خود اُس کو پی سکتے ہو اور نہ کسی کو پلا سکتے ہو۔ یہ تمھاری شراب محض خیالی ہے کہ جس کی تعریفوں سے تُم اپنا اور دُوسروں کا دِل خوش کر لیا کرتے ہو۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ بُلبُل نغمہ زن ہے۔ اُس کی نغمہ سنجی سے معلُوم ہوتا ہے کہ بہار آنے والی ہے۔ لیکن یہ خبر پرندے کی زبانی ہے اور ہم نے بس اُڑتے اُڑتے سُنی ہے۔ اِس لیے خُدا جانے سچ ہے یا جھوٹ۔

پانچواں شعر:۔ حضرت موسیٰ نے جب خُدا سے ضد کی کہ اپنا جلوہ دِکھایئے تو جواب مِلا کہ تُم نہیں دیکھ سکو گے۔ اب غالبؔ کہتے ہیں کہ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر ایک کو ایک سا جواب ملے۔ یعنی اُسی طرح کا جواب ملے جو حضرت موسیٰ کو ملا تھا۔ ہوسکتا ہے ہماری درخواست منظُور ہو جائے اور خُدا ہمیں اپنا جلوہ دِکھا دے۔ اِس لیے ہمیں کوہِ طور کی سیر کرنی چاہیئے اور اپنی قسمت آزمانی چاہیئے۔

چھٹا شعر:۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ گُفتگُو میں گرمی ہونی چاہیئے مگر اِتنی زیادہ نہیں ہونی چاہیئے کہ جس سے بات کی جائے وہ آپ کی گرمئی کلام کی شکایت زبان پر لائے، یعنی گرمئی کلام کی شکایت کرے۔

5.11 غزل نمبر 8

بس کہ دشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں ، اِنساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگی شوق! کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیراں ہونا
عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنا مت پوچھ — عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم، داغِ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا
عشرت پارۂ دِل ، زخمِ تمنا کھانا — لذت ریش جگر، غرقِ نمک داں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے! اُس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف! اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ! — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

5.11.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
کاشانہ	گھر، آشیاں، مکان، گھونسلا	زود پشیماں	اپنی غلطی پر جلدی شرمندہ ہونے والا
حیف	افسوس، تعجب، حیرت، حسرت		

5.11.2 غزل (8) کی تشریح

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ دُنیا میں ہر کام کا آسان ہونا بہت دُشوار ہے۔ ہر کام آسان نہیں ہوا کرتا۔ اِسی طرح ہر آدمی میں حقیقی صفاتِ اِنسانی نہیں ہوا کرتیں۔ گویا آدمی کو مکمل اِنسان بننا نہایت مُشکل ہے۔

دُوسرا شعر:۔ میری گریہ وزاری کا مُدعا یہ ہے کہ میرا گھر ویران ہوا جائے۔ چنانچہ اِس گریہ زاری کے اثر سے میرے گھر کے درو دیوار سے ویرانی ٹپکتی ہے۔ لہٰذا اب یہ گھر کوئی دِن میں بالکل ویران ہو جائے گا۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ مُجھ کو اپنے عشق کے دیوانے پن پر افسوس ہوتا ہے کہ اِس دیوانے پن کے تقاضے پر میں بار بار اُس کی گلی کی طرف جاتا ہوں اور پھر خود ہی حیران اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا۔ کیوں کہ وہاں کوئی آرزو تو پوری ہونے سے رہی۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ قتل گاہ میں عاشقوں کی مسرت کا حال مت پوچھو کہ وہ قتل گاہ میں محبوب کی تلوار کو عُریاں دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ ایسے خوش ہو گئے ہیں جیسے اُنھوں نے عُریاں شمشیر نہیں بلکہ عید کا چاند دیکھ لیا ہو، جیسے اُن کو عید نظارہ ہو گیا ہو۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ افسوس! ہم دُنیا سے نامُراد گئے اور داغ آرزو قبر میں لے گئے۔ لیکن خُدا کرے کہ تُم ہمیشہ خوش رہو اور باغ کی طرح شاداب رہو اور پھلو پھولو۔

چھٹا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق میں اب ہم اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ محرومی اور ناکامی کا زخم کھانا دِل کے لیے عین راحت ہے اور زخمِ جگر کا نمکدان میں ڈوبنا دِل کے لیے اِنتہائی لذت کا سبب ہے۔ مُراد یہ ہے کہ عاشق ایذا پسند ہوتے ہیں۔

ساتواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ اُس نے مجھے قتل کرنے کے بعد ظُلم سے توبہ کرلی۔ ہائے وہ پشیمان ہونے والا قاتل محبوب کس قدر جلد پشیمان ہوا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر اُس نے میرے قتل سے پہلے توبہ کرلی ہوتی۔ اب توبہ کی مگر کیا فائدہ۔ زود پشیماں کے طنزیہ استعمال نے شعر میں لُطف پیدا کر دیا ہے۔

آٹھواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ افسوس ہے اُس چار گرہ کپڑے کے ٹکڑے پر جو بدبختی سے عاشق کا گریبان بن جاتا ہے۔ افسوس اِس لیے کیا ہے کیوں کہ وہ کپڑا ہمیشہ جنونِ عشق کے ہاتھوں تار تار رہتا ہے۔ کبھی معشوق از راہِ شوخی چاک کر دیتا ہے اور کبھی ہجر میں عاشق خود اُسے پھاڑ دیتا ہے۔

5.12 غزل نمبر 9

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر، تھا جو راز داں اپنا
منظر اِک بُلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے اِدھر ہوتا، کاش کے مکاں اپنا
دردِ دِل لکھوں کب تک، جاؤں اُن کو دِکھلا دُوں — اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا
تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دُشمن کو — دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہُنر میں یکتا تھے — بے سبب ہوا غالبؔ! دُشمن آسماں اپنا

5.12.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
پری وش	پری کی طرح خوبصورت	رقیب	دشمن، مخالف
فگار	عاجز، گھائل، مجروح	غمازی	چغل خوری، جاسوسی، لگائی بجھائی
دانا	عقل مند، عالم، دانش، ہوشیار		

5.12.2 غزل(9) کی تشریح

پہلا شعر:۔ غالبؔ کو اپنے اندازِ بیان پر بجا طور پر فخر ہے۔اِس شعر میں بھی کچھ ایسا ہی کہا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ایک تو ہمارا محبوب حُسنِ مجسم کا پیکر ہے۔اُس پر ہماری رنگین بیانی نے وہ جادُو جگایا کہ ہمارا راز دان ہی ہمارا رقیب بن گیا۔یعنی وہ بھی اُس پر عاشق ہوگیا۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اِس وقت ہمارا مکان عرش پر واقع ہے اور عرش سے زیادہ بُلند کوئی مقام نہیں ہے۔کاش! ہمارا مکان عرش سے کچھ نیچے ہوتا تو ہم عرش کو منظر بنا لیتے اور اُس کی جُستجُو کرتے۔دُوسرے لفظوں میں ہم اور ترقی کرنا چاہتے تھے لیکن ہم چوں کہ پہلے ہی آخری حد کو پہنچ چکُے ہیں،اِس لیے ہماری یہ آرزُو پوری نہیں ہوسکتی۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے دردِ دِل کی داستان کہاں تک لکھتا رہوں کہ اس کو لکھتے لکھتے میری اُنگلیاں زخمی ہوگئی ہیں۔لہٰذا کیوں نہ میں اُن کے پاس جاؤں اور اپنی حالت،اپنی اُنگلیاں اور اپنا خون آلودہ خامہ اُن کو دِکھادُوں۔ شاید وہ میری حالتِ زار کو سمجھ جائیں اور میری آرزُو پُوری ہوجائے۔

چوتھا شعر:۔ اِس خیال کے ڈر سے کہ رقیب میرے محبوب کے پاس جائے گا اور میری چغلی کھائے گا،میں نے محبوب کی شکایت میں اُس کو اپنا ہم زبان بنالیا ہے۔میں نے اِس انداز سے محبوب کی شکایت کی کہ وہ بھی ہاں میں ہاں ملاتا گیا۔ اِس طرح اب وہ میری غمّازی نہیں کرسکتا۔کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اُس پر بھی اِلزام آتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ غزل کے مقطعے میں غالبؔ نے بڑی ہُنر مندی سے اپنی دانائی اور ہُنر مندی ثابت کی ہے۔کہتے ہیں کہ آسمان اُس آدمی کا دُشمن ہوتا ہے جو دانا ہو اور ہُنر مند ہو۔غالبؔ نے آسمان کو اپنا دُشمن بتا کر اپنی دانش مندی اور ہُنر کا ثبوت فراہم کردیا ہے۔

5.13 غزل نمبر 10

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　اِس قدر دُشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

دِل سے مِٹنا تری انگُشت حنائی کا خیال　　ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا

ہے مجھے، ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا　　روتے روتے غمِ فُرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گُل کو ترے کوچے کی ہوس　　کیوں ہے؟ گردِ رہ جولانِ صبا ہو جانا

تا کہ تجھ پہ کھلے اعجازِ ہوائے صیقل　　دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوہٗ گُل ذوقِ تماشا غالبؔ!　　چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

5.13.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
عشرت	خوشی، عیش، نشاط، آرام	قطرہ	پانی کی بوند، بوند، بوند برابر
انگشت حنائی	انگلیاں مہندی سے رنگنا	غم فرقت	جدائی کا غم، دوری کا غم
نکہت	خوشبو، مہک	جولان	بیڑی، زنجیر
اعجاز	معجزہ، کرشمہ		

5.13.2 غزل (10) کی تشریح

پہلا شعر:۔ قطرہ بہ ظاہر فنا ہو جاتا ہے تو حقیقتاً اُس کی موت نہیں ہوتی بلکہ وہ اصل سے جا مِلتا ہے۔ یعنی وہ خود دریا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ اُس کے لیے باعثِ مسرت ہوتا ہے۔ اِسی طرح غالبؔ کہتے ہیں کہ جب درد سے حد گزر جاتا ہے تو اِنسان مر جاتا ہے۔ مر کر اُس کے سب درد و الم ختم ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے معبودِ حقیقی سے جا مِلتا ہے۔ اِس طرح درد کا حد سے گزرنا ہی اُس کے لیے دوا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فنا ہی ہستی مقصود ہے۔

دُوسرا شعر:۔ شاعر محبوب سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ ''اللہ اللہ'' کلمۂ تعجب ہے۔ آپ کو اپنے عشاق سے کس قدر نفرت ہے کہ اب آپ اُن پر جفا کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم پر آپ کرم فرماتے تھے اور اب یہ عالم ہے کہ ہم آپ کی جفاؤں سے بھی محروم ہیں۔

تیسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے دِل سے تمھاری انگشت حنائی کا خیال مِٹنا بہت مُشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ یہ اُتنا ہی مُشکل اور ناممکن ہے کہ جتنا گوشت کا ناخُن سے جُدا ہونا مُشکل و ناممکن ہے۔ مثل مشہور ہے کہ گوشت سے ناخُن کبھی جُدا نہیں ہوتا۔

چوتھا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ غمِ فرقت میں روتے روتے ختم ہو جانا میرے لیے ایک معمولی بات ہے۔ ایسی معمولی بات کہ جیسے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا۔ گویا روتے روتے فنا ہونا باعثِ انبساط ہے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر نگہتِ گُل کو تیرے کوُچے میں جانے کی آرزو نہیں ہے تو پھر وہ کیوں صبا کے راستے کی گرد بننا پسند کرتی ہے۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ وہ بادِ صبا میں شامل ہو جاتی ہے۔ پھولوں کی خوشبو کے ہوا میں شامل ہونے سے عیاں ہے کہ اُسے ہوا کے ساتھ تیرے کوچے میں جانے کی خواہش ہے۔

چھٹا شعر:۔ برسات میں چوں کہ ہوا میں بہت نمی ہوتی ہے لہذا فولادی آئینہ زنگ آلودہ ہو جاتا ہے، جسے آئینے کا سبز ہونا کہتے ہیں۔ غالبؔ نے اِس شعر میں ہوا بہ معنی خواہش اور ہوا دونوں استعمال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ برسات میں فولادی آئینے پر زنگ اِس لیے آجاتا ہے کیوں کہ اُس کو ہوائے صقیل ہے کہ زنگ لگے گا تو اُس کی صفائی ہوگی، اُس میں جلا پیدا ہوگی۔ لہذا خواہش اور شوق وہ چیز ہے کہ فولاد کے اندر بھی موجود ہے اور وہ فولاد پر بھی اثر کرتی ہے۔

اِس کے دُوسرے معنی یہ ہیں کہ آج کل اعجازِ ہوا یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ ہوا (بہ معنی خواہش) میں بھی وہی تاثیر اور اعجاز پیدا ہو گیا ہے جو اصلی ہوا میں ہوتا ہے، جس سے فولادی آئینہ زنگ آلودہ ہو جاتا ہے۔ گویا صرف گلستان و صحرا ہی میں ہوا کا اثر نہیں ہے بلکہ فولاد تک اِس سے متاثر ہے۔

ساتواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے جلوۂ گُل یعنی سیرِ گُل (مطالعہ قُدرت) سے دید کا مذاقِ سلیم پیدا ہوتا ہے۔ اِس لیے اِنسان کی آنکھ کو ہر کیفیت سے لُطف اندوز ہونا چاہیے تا کہ شوقِ مطالعہ کی تربیت ہو سکے۔ مطلب یہ کہ اِنسان کو چاہیے کہ باغِ عالم میں ہر رنگ کا لُطف اُٹھائے تا کہ خُدا کے ہُنر کو پہچان سکے۔

5.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ مرزا غالبؔ کے حالات زندگی قلم بند کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ مرزا غالبؔ کی غزل گوئی پر روشنی ڈالیئے۔

سوال نمبر 3:۔ مرزا غالبؔ کی زندگی کے اہم واقعات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 4:۔ مرزا غالبؔ کی جدت پسندی کے متعلق لکھیئے۔

سوال نمبر 5:۔ مرزا غالبؔ کی غزلیات کی تشریح معہ حوالہ کیجئے۔

5.15 کتابیات

1 غالبؔ اور مطالعہ غالبؔ، از ڈاکٹر عبادر بریلوی، مطبوعہ، سکسینہ ہاؤس، دہلی۔

2 غالبؔ اور عہد غالبؔ، مرتبین، شاہد ماہلی، ڈاکٹر رضا حیدر، مطبوعہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔

3 غالبؔ اور آہنگ غالبؔ، از ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مطبوعہ، غالب اکیڈمی، نئی دہلی۔

4 تفہیم غالبؔ، از شمس الرحمٰن فاروقی، مطبوعہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔

5 تفہیم غالبؔ کے مدارج، از ڈاکٹر شمس بدایونی، مطبوعہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔

6 غالبؔ اور اس کی شاعری، از احمد الدین احمد، مطبوعہ، لٹریری بک سنٹر۔

7 غالبؔ کی تفہیم و تعبیر کے امکانات، از صدیق الرحمٰن قدوائی، مطبوعہ، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، دہلی۔

اکائی نمبر6

حسرتؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح

ساخت:

6.1 سبق کا تعارف
6.2 سبق کا ہدف
6.3 حسرتؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح
6.4 غزل نمبر1
6.4.1 فرہنگ
6.4.2 غزل کی تشریح
6.5 غزل نمبر2
6.5.1 فرہنگ
6.5.2 غزل کی تشریح
6.6 غزل نمبر3
6.6.1 فرہنگ
6.6.2 غزل کی تشریح
6.7 غزل نمبر4
6.7.1 فرہنگ
6.7.2 غزل کی تشریح

6.8 غزل نمبر 6

6.8.1 فرہنگ

6.8.2 غزل کی تشریح

6.9 غزل نمبر 6

6.9.1 فرہنگ

6.9.2 غزل کی تشریح

6.10 غزل نمبر 7

6.10.1 فرہنگ

6.10.2 غزل کی تشریح

6.11 غزل نمبر 8

6.11.1 فرہنگ

6.11.2 غزل کی تشریح

6.12 غزل نمبر 9

6.12.1 فرہنگ

6.12.2 غزل کی تشریح

6.13 غزل نمبر 10

6.13.1 فرہنگ

6.13.2 غزل کی تشریح

6.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

6.15 کتابیات

6.1 سبق کا تعارف

حسرتؔ موہانی اردو غزل گوئی کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کے ارتقاء میں ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ان کے خیال اور انداز بیان دونوں میں شخصی اور روایتی عناصر کی آمیزش ہے۔ حسرت موہانی کو قدیم غزل گو اساتذہ سے بڑا ہی ذہنی و جذباتی لگاؤ تھا۔ اور یہ اسی لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ کلاسیکل شاعروں کا انہوں نے بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اور اپنی طبیعت کے مطابق ان کے مخصوص رنگوں کی تقلید بھی کی۔ قدیم اساتذہ کے یہ مختلف رنگ حسرت کی شاعری میں منعکس دکھائی دیتے ہیں۔ اور خود حسرت کو اس تتبع کا اعتراف بھی ہے۔

حسرتؔ کے اس رجحان پر فراقؔ لکھتے ہیں کہ حسرتؔ کے اشعار بیان حسن وعشق میں صاف مصحفؔی کی یاد دلاتے ہیں۔ معاملہ بندی اور ادابندی میں جرات کی یاد دلاتے ہیں۔ اور داخلی اور نفسیاتی امور کی طرف اشارہ کرنے میں عموماً نئ فارسی ترکیبوں کے ذریعے مومن کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن حسرتؔ کی شاعری محض مصحفؔی، جرات اور مومنؔ کی آواز کی بازگشت نہیں ہے۔ وہ ان تینوں کے اندازِ بیان و وجدان اور ان کے فن شاعری کی انتہا و تکمیل ہیں۔

حسرتؔ کی غزل میں ایک ذہنی گدگدی، ایک داخلی چھیڑ چھاڑ، ایک حسین چہل کی عکاسی نظر آتی ہے۔ حسرتؔ کی شاعری کا میدان ان معنوں میں محدود ہے کہ وہ جذبات حسن وعشق ہی سے سروکار رکھتے ہیں۔ ان کا دل ایک شاعر کا دل ہے اور ان کی شاعری کا محور محبت اور صرف محبت ہے۔

6.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں حسرتؔ موہانی کی حیات اور ان کی غزلیات کی تشریح شامل ہے۔ اس اکائی کا مقصد طلبا کو حسرت کی اصل زندگی کے نشیب وفراز سے واقف کروانا ہے۔ حسرتؔ موہانی کی شاعری کا اصل محور کیا تھا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

6.3 حسرتؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح

حالاتِ زندگی:۔ مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے زبردست مجاہد، مخلص اور کھرے سیاست دان تھے۔ ۱۸۸۱ء میں قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ موہان میں پیدایش کے سبب سے نام کے ساتھ موہانی لگاتے تھے۔ حسرت تخلص تھا اور تخلص سے اس قدر مشہور ہو گئے تھے کہ اصل نام کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ لہٰذا حسرتؔ موہانی ہی اُن کی پہچان ہوگئی ہے۔ اِس بات کا خود انھیں بھی احساس تھا اور اس کا اظہار اُنھوں نے کِیا بھی ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں۔

جب سے کہا ہے عِشق نے حسرت مُجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

ابتدائی تعلیم گھر ہی سے شروع کی۔ مولانا غُلام علی موہانی نے قرآنِ مجید اور اُرْدُو، فارسی کی ابتدائی تعلیم دی۔ مِڈل کامیاب کرنے کے بعد سید ظہورالاسلام، بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے عربی کتابیں پڑھیں۔ فتح پور ہی سے اِنٹر کا امتحان کامیاب کِیا۔ علی گڑھ کالج سے ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔

دورانِ تعلیم علی گڑھ میں اُن کی ملاقات کچھ ایسے ادیبوں اور شاعروں سے ہوئی جن کا ان کی زندگی اور شخصیت پر خاصا اثر پڑا۔ ان ادیبوں میں مولانا نور محمد، حافظ نیاز احمد، مولانا حبیب الدین، امیر خان، سجاد حیدر ملدام، مولانا شوکت علی، خان بہادر، سید ابو محمد وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا سید ظہورالاسلام کا ان کی شخصیت پر بڑا اثر ہے۔

حسرتؔ دورانِ تعلیم ہی سے سیاست میں حِصّہ لینے لگے تھے۔ لہٰذا یونی ورسٹی حکام سے بھی اکثر ان کی اَن بَن رہتی تھی۔ اور اکثر انتظامیہ کے عذاب کا شِکار بھی ہوتے۔ حسرتؔ کی شادی ہوئی تو وہ لگ بھگ اٹھارہ برس کے تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی حسرتؔ کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حسرتؔ خالص غزل گو تھے۔ ان سے پہلے بھی بڑے جیّد غزل گو گزرے ہیں۔ معاصر غزل گو بھی اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔ پھر بھی حسرتؔ کی غزل گوئی ممتاز اور منفرد ہے۔ اس لیے کہ حسرتؔ غزل کا سہارا غزل ہی سے لیتے ہیں کسی اور سے نہیں۔ غزل گوئی کوئی کرے معیار حسرتؔ ہی ہوں گے۔''

کلام کی خصوصیات:۔ حسرتؔ کا دور وہ دور ہے جب غزل کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوگئیں تھیں۔ سرسیّد کی تحریک کے زیرِ اثر حالؔی نے صنفِ غزل کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ بے وقت کی راگنی ہے۔ حالؔی کے غزل کے بارے میں اِن خیالات اور نظم کی وکالت سے ایسی فضا پیدا ہوگئی کہ غزل کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ ایسے وقت میں بھی حسرتؔ موہانی نے غزل کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ پورے جوش وخروش سے اس صنف کو برتا۔ ابتدائی زمانے میں انھوں نے غزل کے علاوہ دیگر شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی لیکن پھر صرف صنفِ غزل میں ہی طبع آزمائی کرنے لگے۔ چنانچہ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں:

لکھتا ہوں مرثیہ، نہ قصیدہ، نہ مثنوی
حسرتؔ غزل ہے صرف میری جانِ عاشقاں

حسرتؔ مومنؔ اور نسیمؔ کے اندازِ شاعری سے متاثر تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

حسرتؔ میرے کلام میں مومنؔ کا رنگ ہے
ملکِ سخن میں مجھ سا کوئی دوسرا نہیں

اور

حسرتؔ تری شگفتہ کلامی پہ آفریں
یاد آگئیں نسیمؔ کی رنگیں نگاریاں

حسرتؔ حسن پرست تھےاور نوعمری سے عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔شاعری پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ شاعری میں کامیاب مصوری ضروری ہےاور مصوری اس وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب اس میں جذباتِ اِنسانی کی ہو بہوتصویراُتاردی گئی ہو۔عشق اِنسانی جذبات میں سب سےقوی جذبہ ہے۔جنسی جذبات کی پیش کش بھی شاعری کاایک لازمی حِصّہ ہےاوراسے عیب قرار دینا ناانصافی ہے۔یہ جذبہ سیدھے سادےلفظوں میں اِظہار چاہتا تھا اورحسرتؔ بھی یہ فریضہ نبھانے کے لیے بیتاب تھے۔

حسرتؔ کاعشق تصنع سے عاری ہے۔یہ اُس کی سادگی اور معصومیت ہی تو ہے کہ وہ پردوں میں مستور رہنا نہیں چاہتااوراس کااعتراف بھی کرتا ہے ؎

دِل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا
ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کر دیا

☆☆☆☆☆☆

دِلوں کو فکرِ دوعالم سے کردیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

حسرتؔ کے کلام میں عشق ومحبت کی ساری وارداتیں اپنی تمام دل کشی کے ساتھ سمٹ آئی ہیں۔اُن کی غزل کا موضوع عشق ہےاوروہ اِس موضوع کو ہرزاویے سے پیش کرتے ہیں۔اس کے سارے امکانات بروئے کارلاتے ہیں،اس کی تمام کیفیتوں اوراس کے تمام نشیب وفراز کی تصویرکشی کرتے ہیں اور تقاضائے فطرت کے مطابق اس میں تھوڑی سی ہوسناکی بھی شامل ہوجاتی ہے جس پروہ شرماتے نہیں ہیں۔فحاشی اورعریانی سے وہ بہرحال اپنادامن بچائے رکھتے ہیں۔ حسرتؔ کی عشقیہ شاعری کے نمونے دیکھئے:

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا میرا خیال تو شرما کے رہ گئے

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

....

وصل کی رات چلی ایک نہ شوخی ان کی
کچھ نہ بن آئی تو چپکے سے کہا مان گئے

....

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

....

نِگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

....

حسرتؔ حسن پرست تھے لیکن محض اچھی صورت ہی انھیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی تھی، شیریں الفاظ، دلکش تراکیب اور مترنم بحروں کو بھی وہ ایک عاشق کی نظر سے دیکھتے تھے اور انھیں اپنا لینے کی کوشش کرتے تھے۔ مومنؔ وتسیمؔ کے گرویدہ تھے تو اِس لیے کہ ان کی شیریں کلامی اور رنگین بیانی انھیں بہت بھاتی تھی۔

6.4 غزل نمبر1

دِ ل کو خیا لِ یا ر نے مخمو ر کر د یا ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کردیا

ما نوس ہو چلا تھا تسلی سے حا لِ دِ ل پھر تو نے یاد آکے، بہ دستور کر دیا

بے تابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دِل آخر حضورِ یار بھی مذکور کر دیا

اہلِ نظر کو بھی نظر آ یا نہ ر و ے یا ر یاں تک حجابِ یار نے مستور کر دیا

حسرتؔ ! بہت ہے مرتبۂ عا شقی بُلند تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

6.4.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
مخمور	نشے میں چور، مست، مگن، صاحب خمار	ساغر	پیالہ، شراب کا پیالہ، جام
مانوس	جانا پہچانا، جس سے انس ہو، آشنا، شیر وشکر	مستور	پوشیدہ، چھپا ہوا، مخفی، خفیہ

6.4.2 غزل(1) کی تشریح

دِ ل کو خیا لِ یا ر نے مخمو ر کر د یا ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کردیا

محبوب کا وصل یا دیدار ہونا تو خیر بڑی چیز ہے، اُس کا خیال بھی عاشق کے دِل کو تسکین بخشتا ہے۔ غزل کے مطلع میں شاعر نے کچھ ایسا ہی خیال پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے دِل کو محبوب کے خیال نے مخمور کر دیا ہے۔ اِس میں مستی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ جس طرح پیالے کو شراب کا رنگ پُر نور بنا دیتا ہے اُسی طرح محبوب کا خیال دِل کو نور اور مستی کی کیفیت عطا کر دیتا ہے۔

مانوس ہو چلا تھا تسلّی سے حالِ دِل　　　　پھر تو نے یاد آکے، بہ دستور کر دیا

شاعر محبوب سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ تمھاری جُدائی سے دِل کی بے قراری کی اِنتہا ہوگئی تھی۔ میں اس کو تسلیاں دیے جارہا تھا۔ اُس کا کچھ کچھ اثر بھی ہونے لگا تھا۔ وہ اِن تسلیوں سے مانوس ہونے لگا تھا۔ انھیں پسند کرنے لگا تھا۔ لیکن اے میرے محبوب تو پھر اِسے یاد آ گیا اور اس کی حالت پہلے جیسی ہی خراب ہوگئی۔

بے تابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دِل　　　　آخر حضورِ یار بھی مذکور کر دیا

عاشقی کی پہلی شرط ضبط ہے۔ لیکن شاعر کہتا ہے ہمارے دِل کی بے قراریاں اس حد کو پہنچ چکی ہیں کہ ضبط کا کام تمام ہوگیا ہے۔ اِن بے قراریوں نے دِل کی بات کو دِل میں نہیں رہنے دیا۔ اور دُوسروں کی بات تو خیر کیا ہے انھوں نے آخر محبوب کے سامنے بھی دِل کی حالت بیان کر کے ہمیں ہلکا کر دیا۔

اہلِ نظر کو بھی نظر آیا نہ روئے یار　　　　یاں تک حجابِ یار نے مستور کر دیا

شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ صاحبِ نظر ہیں یعنی عشاق کو بھی میرے محبوب کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ میرے یار کے پردے نے اُن کو ایسا مست کر دیا کہ وہ اس کے آگے دیکھ ہی نہیں پائے۔

حسرتؔ ! بہت ہے مرتبۂ عاشقی بُلند　　　　تجھ کو تو مفت لوگوں نے مشہور کر دیا

غزل کے مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے حسرتؔ عاشقی کا مرتبہ بہت بُلند ہے۔ اس مرتبے کو پہنچنا بہت دشوار ہے۔ تجھے تو لوگوں نے ویسے ہی مشہور کر دیا ہے۔ ورنہ تو اُس مرتبے کو کہاں پہنچتا ہے۔

6.5 غزل نمبر2

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہیٰ ترکِ اُلفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں
نہ چھیڑ اے ہم نشیں، کیفیت صہبا کے افسانے
شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں
رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں ، اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
حقیقت کھل گئی حسرتؔ ! ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

6.5.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
ترک	چھوڑنا، دست برداری کرنا	کیفیت صہبا	شراب کا نشہ، شراب کا خمار

6.5.2 غزل نمبر(2) کی تشریح

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہیٰ ترکِ اُلفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ محبت میں کچھ ایسی پریشانیاں اُٹھائی ہیں کہ اب اس سے توبہ کیے بیٹھے ہیں۔ لہذا ہم محبوب کو بھُلانا چاہتے ہیں اور اُس کو بھلانے کی لاکھ سعی بھی کرتے ہیں مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ وہ برابر یاد آتا

ہے۔ یا خدا ہماری ترکِ محبت پر وہ کیوں بار بار یاد آتے ہیں۔ شاید یہ وہ آگ ہے جو لگائے لگتی نہیں اور بجھائے بنتی نہیں۔

نہ چھیڑ اے ہم نشیں، کیفیت صہبا کے افسانے

شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے ہم نشین صہبا یعنی سُرخ شراب کی کیفیت، اس کے سرور کے قصّے مت چھیڑ۔ کیوں کہ جب تو وہ افسانے چھیڑتا ہے تو مجھے محبوب کی مد بھری آنکھیں یاد آ جاتی ہیں۔ اور جب اُن کی چشمِ نرگس کے ساغر یاد آتے تو میری حالت ایک بے خود انسان کی سی ہو جاتی ہے۔ گویا میں خودی میں نہیں رہتا۔

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں ، اے وائے ناکامی

وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

عاشق کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بے خود رہتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ ہم ہوش کی قید میں رہتے ہیں یعنی ہوش میں رہتے ہیں اور ظاہر ہے ناکامی کی صورت ہے۔ لہذا شاعر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جو ہم پر خود فراموشی کا عالم طاری ہوا کرتا تھا اور اُس بے خودی میں جو ہم جنگل جنگل چکر لگاتے تھے یاد آ رہے ہیں۔

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اِس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہمیں محبوب کی اکثر یاد آتی رہتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُن کی یاد مہینوں نہ آئے۔ مگر جب پھر اُن کی یاد آتی ہے تو بہت شدت سے آتی ہے۔

حقیقت کھل گئی حسرتؔ ! ترے ترکِ محبت کی

تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

غزل کے مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے حسرتؔ تو جو کہتا ہے کہ تم نے محبت کو چھوڑ دیا ہے، ترک کر دیا ہے۔ سب غلط ہے۔ اس کی حقیقت اب عیاں ہو گئی ہے کیوں کہ اب تمھیں وہ پہلے سے بھی زیادہ یاد آ رہا ہے۔ لہذا تیری ترکِ محبت کا دعویٰ درست نہیں ہے۔

6.6 غزل نمبر 3

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اِظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم تو سمجھے تھے کہ اب دِل کو شکیبا کر دیا

پڑھ کے تیرا خط، مرے دِل کی عجب حالت ہوئی
اِضطرابِ شوق نے اِک حشر برپا کر دیا

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز
تجھ کو آخر آشنائے نازِ بے جا کر دیا

اب نہیں دِل کو کسی صورت ، کسی پہلو قرار
اُس نِگاہ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا جنوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا ، قطروں کو دریا کر دیا

تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اِشارہ کر دیا

سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دِل اس نے تو حسرتؔ اور دُونا کر دیا

6.6.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
شکیبا	صبر و ضبط، تحمل سے کام لینا	سحر	جادو، منتر، اثر، کشش
دونا	دگنا، دو چند، دوہرا		

6.6.2 غزل(3) کی تشریح

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب اپنے حسن سے بے خبر و بے پروا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بننے سنورنے پر بھی دھیان نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں نے اپنی آرزو، اپنی تمنّا کا اِظہار اُس سے جب سے کیا یعنی میں نے جب اُس سے کہا کہ میں تمھارا عاشق ہوں تو وہ مغرور ہو گیا۔ وہ اپنے حسن سے باخبر ہو گیا اور زیادہ دھیان بننے سنورنے پر دینے لگا۔ اب شاعر کہتا ہے کہ یہ غلطی میں نے کیوں کر کی۔ کیوں اُس سے اپنی تمنّا کا اِظہار کیا اور اُس میں ادائے محبوبانہ پیدا کر دی۔

بڑھ گئیں تم سے مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم تو سمجھے تھے کہ اب دِل کو شکیبا کر دیا

اِس شعر میں شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے محبوب تم سے ملنے کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ ہماری بے قراری دُور ہو جائے گی۔ مگر ہوا اس کے برعکس تم سے ملنے کے بعد ہماری بے قراریاں مزید بڑھ گئیں۔ یہ خیال ہمارا غلط تھا کہ تم سے مِل کر دِل کو قرار مِل جائے گا۔

پڑھ کے تیرا خط، مرے دِل کی عجب حالت ہوئی
اِضطرابِ شوق نے اِک حشر برپا کر دیا

محبوب عاشق سے بے پروا ہوتا ہے۔ وہ کبھی اُس پر کرم نہیں کرتا۔ مگر اِس شعر میں اِس صورت کے برعکس محبوب نے اپنے عاشق کو خط لکھا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تمھارا خط پڑھ کر میرے دِل کی جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ شوق کی بے قراری نے میرے دِل میں حشر ہی برپا کر دیا۔ گویا تمھیں پانے کی خواہش نے بے قراری کی اِنتہا کر دی۔

اب نہیں دِل کو کسی صورت ، کسی پہلو قرار
اُس نِگاہ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

اِس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ نہ جانے محبوب کی ناز بھری نِگاہ نے ایسا کون سا جادو کر دیا ہے کہ ہمارے دِل کی حالت دگرگوں ہوگئی ہے۔ اب دِل کو کسی بھی صورت، کسی بھی پہلو چین نہیں ہے۔

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا جنوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا ، قطروں کو دریا کر دیا

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تیرے عشق کے سبب سے عاشقوں کے مرتبے بُلند ہو گئے ہیں۔ کہ جو ذرّے تھے وہ مرتبے میں چمکتے سورج کی برابری کرنے لگے ہیں اور جو محض قطرے تھے یعنی جن کی حیثیت کچھ نہیں تھی وہ سمندر کی طرح وسعت پذیر ہو گئے ہیں۔ جس میں بھی جنون کی حد تک منزل کو پانے کی دُھن ہوتی ہے وہ بلآخر شادو کامراں ہوتے ہیں۔

تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اِشارہ کر دیا

شاعر محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے محبوب رقیب کی یہ مجال تھی کہ وہ مجھے تیری محفل سے اُٹھا باہر نِکال دیتا۔ اُس میں یہ ہمت کہاں تھی۔ ہم تو خود تیری محفل چھوڑ کر چلے آئے۔ کیوں کہ ہم نے دیکھا کہ تم بھی ہماری موجودگی نہیں چاہتے ہو۔ تم نے بھی آنکھ کے اِشارے سے نکل جانے کو کہہ دیا اور ہم چلے گئے ورنہ رقیب میں یہ حوصلہ کہاں تھا۔

سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دِل اس نے تو حسرتؔ اور دُونا کر دیا

غزل کے آخری شعر میں شاعر کہتا ہے کہ یہ جو سب کہتے ہیں کہ اگر محبوب لطف و کرم کا شیوہ اختیار کر لے تو عاشق کے دِل کو سکون ملے گا۔ یہ غلط ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ صورت اِس کے برعکس ہوتی ہے۔ کیوں کہ اے حسرتؔ محبوب کے لطف و کرم نے ہمارے دردِ دل کو پہلے سے بڑھا دیا ہے۔ بلکہ دوگنا کر دیا ہے۔

6.7 غزل نمبر 4

نِگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دِلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سِلسِلہ دراز کرے
خِرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خِرد — جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے
ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی — مجھے تو شامل اربابِ امتیاز کرے
غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش — وہ اُن کے دردِ محبت سے ساز باز کرے
اُمیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ — تری نِگاہ کو اللہ دِل نواز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ — اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

6.7.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
آشنائے راز	راز سے آگاہ کرنا، باخبر	خرد	دانائی، عقل، سمجھ

6.7.2 غزل (4) کی تشریح

نِگا ہِ ناز جسے آ شنائے راز کرے   وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی ناز بھری نِگا ہیں جسے محبت کے راز سے آشنا کریں، واقف کریں اُسے اپنی قسمت کی یاوری پر ناز کرنا بجا ہے۔ دراصل محبوب کبھی عاشق کو دِل کی بات سے آ گاہ نہیں کرتا اور ہمیشہ اُس سے تغافل برتتا ہے۔ اب اگر وہ محبوب اُسے محبت کے رازوں سے آ گاہ کرتا ہے تو عاشق کی قسمت بُلند تو ہوئی۔

دِلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد   ترے جنوں کا خدا سِلسِلہ دراز کرے

اِس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تیرے عشق میں ہم پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہم دُنیاوی باتوں سے بالکل بے فکر ہو گئے۔ نہ ہمیں اس دُنیا کی فکر رہی اور نہ دُوسری دُنیا کی۔ گویا دونوں جہانوں سے ہم سرخرو ہو گئے۔ لہٰذا وہ دُعا کرتا ہے کہ تیرے جنوں کے سلسلے کو خدا اور بڑھائے، دراز کرے تا کہ ہم دین و دُنیا کی فکر سے آزاد رہیں۔

خِرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خِرد   جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

شاعر محبوب سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ آپ کا حُسن کرشمے کرنے والا ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے۔ یہ بھی اس کا کرشمہ ہے، کھیل ہے کہ یہاں ادراک کا نام دیوانگی اور دیوانگی کا نام سمجھ پڑ گیا ہے۔ گویا عاشق دیوانہ نہیں فرزانہ ہے اور اُسے دیوانہ کہنے والا خود دیوانہ ہے۔ پروفیسر عابؔد پیشاوری کہتے ہیں:

وہ معراجِ محبت کے لیے خود کو بھلا بیٹھا
یہ دیوانے ہیں جو مجنوں کو دیوانہ سمجھتے ہیں

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی   مجھے تو شامل اربابِ امتیاز کرے

شاعر محبوب سے مخاطب ہے کہ اے محبوب میں تیرے ظلم وستم پر خفا نہیں ہوں بلکہ بہت خوش ہوں اور اس کا

سبب یہ بتایا ہے کہ چلیے اِسی بہانے تم نے ہمیں اُن لوگوں میں تو شامل کیا جن کے ساتھ اِمتیاز کیا جاتا ہے۔ دراصل محبوب کی بے تعلقی عاشق کے لیے ناگوار ہوتی ہے۔ تعلق کسی قسم کا ہو، چاہے دوستی کی صورت میں ہو یا دُشمنی کی صورت میں، عاشق کے لیے گوارا ہوتا ہے۔ غالبؔ نے ایک جگہ کہا ہے:

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
گر نہیں کچھ تو عداوت ہی سہی

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش وہ اُن کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

شاعر کہتا ہے کہ جس کسی کو دُنیا کے دُکھوں اور غموں سے نجات حاصل کرنے کی آرزُو ہو اُسے چاہیے کہ وہ عشق و محبت کی دُنیا میں قدم رکھے۔ محبوب کے دردِ محبت سے تعلق پیدا کرے۔ کیوں کہ محبت کا درد ایسا درد ہے جو دُنیا کے تمام دُوسرے غموں سے نجات کا باعث ہوتا ہے کہ محبت کے غم کے بعد دُنیا کے تمام غم کوئی معنی نہیں رکھتے۔

اُمیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ تری نِگاہ کو اللہ دِل نواز کرے

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے دیدار کی ایک جھلک پانے کے لیے ہر طرف عاشقوں کے گروہ کھڑے ہیں لیکن محبوب کی ایک جھلک اُن کو نصیب نہیں ہوتی۔ وہ مزید کہتا ہے کہ تمھاری نظر کو خدا دِل نواز کرے۔ عاشقوں کو تسلی دینے والی کرے۔ کہ تو انھیں ایک نظر دیکھے اور اُن کے دِل کو سکون ملے۔

ترے کرم کا سزا وار تو نہیں حسرتؔ اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

غزل کے مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب حسرتؔ تیرے کرم، تیری مہربانی کے لائق نہیں ہے۔ وہ اِس لائق نہیں کہ تو اُس پر کرم کرے۔ اب اگر تو اُس پر کرم کرتا ہے، اُسے یہ عزت بخشتا ہے تو تیری خوشی۔ ورنہ تیرے کرم کا وہ حقدار نہیں ہے۔

6.8 غزل نمبر 5

دِل آرزوئے شوق کا اِظہار نہ کر دے	ڈرتا ہے، مگر یہ کہ وہ اِنکار نہ کر دے
ہشیار! کہ اس پرسشِ پیہم کی نوازش	عشاق ستم کش کو ہوس کار نہ کر دے
ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا	یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے
ہوتا ہے برا لذتِ آزار کا لپکا	مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دُشوار نہ کر دے
کچھ حد بھی ہے اس سوزشِ خاموش کی حسرت	یہ کش مکشِ غم تجھے بے کار نہ کر دے

6.8.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
عشاق	عشق کرنے والے، عاشق	جور	ظلم، جفا، ستم، تعدی
آزار	غم، دکھ، رنج، تکلیف	لپکا	دوڑ کر، لپک کر، تیزی کے ساتھ
سوزش	جلن، کھولن، سوختگی	کش مکش	لڑائی، تکرار، مصیبت، الجھاؤ

6.8.2 غزل (5) کی تشریح

دِل آرزوئے شوق کا اِظہار نہ کر دے ڈرتا ہے، مگر یہ کہ وہ اِنکار نہ کر دے

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ دِل میں محبت کی آرزو ہے اور دِل کی اِس خواہش کا وہ محبوب سے اظہار بھی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اس لیے اِظہار نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ محبوب کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اُس کو ڈر ہے کہ کہیں محبوب ہماری درخواست ٹھکرا نہ دے۔ وہ اِنکار نہ کر دے۔ خواہ مخواہ دِل ٹوٹ نہ جائے۔

ہشیار! کہ اس پرسشِ پیہم کی نوازش   عشاق ستم کش کو ہوس کار نہ کر دے

معشوق عاشق پر نوازش نہیں کرتا لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ وہ لگاتار عشاق کی خبر گیری کر رہا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ خبردار یہ محبوب کی نوازشیں، لگاتار عاشقوں کی خبر گیری کرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ عشاق جو ستم برداشت کرنے میں لذّت پاتے ہیں انھیں محبوب کی یہ نوازشیں جھوٹا عاشق بنادیں، لالچی نہ کردیں۔

ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا   یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے

اِس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہم تو ظلم وستم کی پرسش کرنے والے ہیں یعنی برداشت کرنے والے ہیں اور تجھ کو یہ گُمان، یہ وہم کہ ہم نے وفا ترک کردی ہے۔ تمھارا یہ وہم کہیں تمھیں گناہ گار نہ بنادے۔ کہ تو یہ خیال کر کے تغافل کرتا ہے کہ ہم نے محبت ترک کردی ہے اور ہم برداشت کرتے کرتے مٹ جائیں اور خون تمھارے سر لگ جائے۔

ہوتا ہے برا لذتِ آزار کا لپکا   مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دُشوار نہ کر دے

بہت اچھا شعر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تکلیف میں لذّت پانے کا چسکا کچھ اچھا نہیں ہوتا، بلکہ بُرا ہوتا ہے۔ کیوں کہ درد حد سے بڑھتا ہے تو آدمی مرتا ہے۔ لیکن جب درد سے لذّت ہوگی تو جیسے جیسے یہ بڑھے گا زیادہ مزہ آئے گا۔ اس طرح شاعر کہتا ہے کہ یہ چسکا کہیں ایسا نہ ہو کہ مرنا ہی مُشکل بنادے۔

کچھ حد بھی ہے اس سوزشِ خاموش کی حسرتؔ   یہ کش مکشِ غم تجھے بے کار نہ کر دے

غزل کے مقطعے میں شاعر کہتا ہے کہ اے حسرتؔ تم جو اندر ہی اندر جل رہے ہو، یہ جلن یہ درد جو تمھارے سینے میں لاوے کی طرح دھک رہا ہے اس کی کوئی حد بھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ غم کی کش مکش تمھیں بے کار ہی کردے۔ کسی کام کا ہی نہ رہنے دے۔

6.9 غزل نمبر 6

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں
سیرِ گلشن و ہ کریں شوق سے ، تنہا نہ کریں

اب تو آتا ہے یہی جی میں ، کہ اے محوِ جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں

میں ہوں بیمار تو بیمار کی پرسش ہے ضرور
وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھا نہ کریں

دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں
آپ اس کام کا زنہار اِرادہ نہ کریں

شکوۂ جور، تقاضائے کرم، عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو ، تو کیا کیا نہ کریں

حال کھل جائے گا بے تابیِ دِل کا حسرتؔ
بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

6.9.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی
پرسش	پوچھنا، دریافت کرنا، استفسار

6.9.2 غزل(6) کی تشریح

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں
سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے ، تنہا نہ کریں

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب سب سے پردہ کرتا ہے، سب سے چھپتا ہے اور یہ ٹھیک بھی ہے یعنی چھپنا بھی چاہیے۔لیکن عاشق سے کیسا پردہ۔ہم سے تو پردہ کرنا واجب نہیں ہے۔لہذا اگر وہ گلشن کی سیر کا شوق رکھتے ہیں تو ضرور جائیں لیکن یوں تنہا جانا مناسب نہیں ہے۔ہمیں ساتھ رکھیں۔

اب تو آتا ہے یہی جی میں ، کہ اے محوِ جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں

شاعر محبوب سے مخاطب ہے۔کہتا ہے کہ اے ہر وقت ظلم کرنے میں مصروف رہنے والے محبوب تمھارے اِن مظالم سے میں اِس قدر تنگ آ گیا ہوں کہ اب جی میں یہی آ رہا ہے کہ چاہے جو بھی ہو جائے مگر دِل میں تمھاری محبت یا تمھیں پانے کی خواہش نہ آنے دوں۔

میں ہوں بیمار تو بیمار کی پرسش ہے ضرور
وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھا نہ کریں

شاعر کہتا ہے کہ میں (عاشق) مجبور ہوں کہ ناتوانی کے سبب سے کہیں آ جا نہیں سکتا ہوں تو کیا معشوق کے لیے مجبور کی خبر گیری، پرسش ضروری نہیں ہے؟ اور اگر وہ (محبوب) مسیحا ہے، معجزے کر سکتا ہے یعنی مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے تو پھر اُسے اس بیمار کو اچھا نہیں کرنا چاہیے؟

دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں
آپ اس کام کا زنہار اِرادہ نہ کریں

شاعر اِس شعر میں محبوب سے مخاطب ہے جو درد کے مارے غمزدہ عاشق کو تسلیاں دینے کی سوچ رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی اِس تسلی سے عاشق کے دِل کو درد اور بڑھ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو مشکل ہو جائے گی ۔لہذا آپ ہرگز اُسے تسلیاں دینے کا اِرداہ نہ کریں۔

شکوۂ جور، تقاضائے کرم، عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو ، تو کیا کیا نہ کریں

شاعر کہتا ہے کہ خدا کرے تم کہیں ہمیں مل جاؤ کہ ہم کو تم سے نہ جانے کیا کیا باتیں کرنی ہیں۔ تم نے جو ستم ہم پر روا رکھے ہیں اُن کی تم سے شکایت کرنی ہے۔ تم سے مہربانی کا تقاضا کرنا ہے اور یہ عرض کرنا ہے کہ ہم سے وفا کرو۔ گویا کہیں ملاقات ہو تو یہ ساری باتیں ہوں۔

حال کھل جائے گا بے تابیِ دِل کا حسرتؔ
بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

غزل کے مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے حسرتؔ تو جو محبت میں ہر وقت بے قرار رہتا ہے اور بار بار محبت بھری نِگاہوں سے اُسے دیکھتا رہتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے دِل کی بے تابی کا راز اُس پر کھل جائے۔ لہذا یوں محبت بھری نِگاہوں سے بار بار اُسے دیکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ گویا مت دیکھا کیجیے۔

6.10 غزل نمبر 7

یاد کر وہ دِن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حسن، تو آگاہ رعنائی نہ تھا

عشق روز افزوں پہ اپنے کوئی حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جب کہ تیرا حسن، سرگرمِ خود آرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دِن؟ کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں، گو ربطِ شناسائی نہ تھا

تو نے حسرتؔ! کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شان رسوائی نہ تھا

6.10.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
روزافزوں	دن رات ترقی کرنا، تیزی سے ترقی کرنا	یکتائی	واحد، فرد، بے مثال، بے نظیر

6.10.2 غزل(7) کی تشریح

یاد کر ہو دِن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا

باوجودِ حسن، تو آگاہ رعنائی نہ تھا

یہ غزل، غزلِ مُسلسل کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ پہلے شعر میں شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ وہ دِن تمھیں یاد ہیں۔ اور اگر نہیں ہیں تو یاد کر کہ تمہارا کوئی عاشق نہیں تھا۔ کوئی تمھارا دیوانہ نہیں تھا۔ اِس کے باوجود کہ تو حسین تھا لیکن تو اپنے حسن و جمال سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ بھی کیا خوب دِن تھے۔

عشق روز افزوں پہ اپنے کوئی حیرانی نہ تھی

جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

کہ ہمیں بھی اپنے روز بروز بڑھتے ہوئے عشق پر کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی اور تو بھی وہ رنگین جلواہ رکھتا تھا جو بے نظیر تھا۔ مگر تجھے اس بے نظیر جلوے پر گھمنڈ نہیں تھا۔

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی

جب کہ تیرا حسن، سرگرمِ خود آرائی نہ تھا

اے محبوب جب تیرا حسنِ خود آرائی میں اس طرح سرگرم نہیں تھا۔ ہر وقت بننے سنورنے میں محو نہیں رہتا تھا۔ میرا عشق آسانی سے اپنی حسرت پوری کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں سوچا۔ لہذا اُس کی سادگی بھی اُس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔

کیا ہوئے وہ دِن؟ کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق

ربط تھا دونوں میں، گو ربطِ شناسائی نہ تھا

شاعر محبوب کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے کہ بتاؤ وہ دِن کہاں گئے۔ اُن دِنوں کا کیا ہوا کہ جب حسن اور عشق

دونوں ایک دُوسرے کی آرزو میں محو تھے۔آرزو میں کھوئے رہتے تھے۔دونوں میں ایک ربط تھا،تعلق تھا کہ دونوں ایک دُوسرے کی آرزو رکھتے تھےلیکن وہ تعلق ایسا تعلق تھا جس کی پہچان نہیں تھی۔کہ جس کو جانتے نہیں تھے۔

تو نے حسرتؔ! کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی

اس سے پہلے اعتبارِ شان رسوائی نہ تھا

اے حسرتؔ تو نے عاشقی کی شان بڑھائی ہے۔عاشقی کی رسمِ شائستگی تجھ سے عیاں ہوئی ہے،ظاہر ہوئی ہے۔ تمھارے سبب سے عاشق جو بدنامِ زمانہ ہوتا ہے کا رُتبہ بُلند ہوگیا ہے۔اُس کی شان بڑھ گئی ہے۔تم سے پہلے عشق کی بدنامی کا یہ مرتبہ نہیں تھا۔اس کی شان کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔

6.11 غزل نمبر 8

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم — گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم زباں سے ہم

کچھ ایسی دُور بھی تو نہیں منزلِ مُراد — لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

اے یادِ یار! دیکھ کہ با وصف رنجِ ہجر — مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم

اے زہدِ خشک! تیری ہدایت کے واسطے — سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم

بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو — آخر بچے نہ اس نگہ ناتواں سے ہم

ہے اِنتہائے یاس بھی اِک اِبتدائے شوق — پھر آگئے وہیں، چلے تھے جہاں سے ہم

حسرتؔ! بھی اور جاکے کریں کس کی بندگی — اچھا، جو سر اُٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

6.11.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
خلش	رنج ،فکر،چبھن، رنجش	سوغات	ہدیہ،تحفہ
یاس	مایوسی، ناامیدی		

6.11.2 غزل(8) کی تشریح

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم　　　گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم زباں سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ ہمارے اندر جو محبت کا جذبہ موجزن ہے ایسا جذبہ، ایسا شوق ہم اوروں میں کیسے پیدا کریں! نہیں کر سکتے۔ لہذا ہم اپنے ہم زبان، اپنے محبوب کی بے دِلی، سرد مہری سے گھبرا گئے ہیں کہ وہ ہمارے شوق کے برعکس بے دِلی سے کام لے رہا ہے۔

کچھ ایسی دُور بھی تو نہیں منزلِ مُراد　　　لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ محبت کی منزل کچھ آسان نہیں ہوتی۔ بہت دُشوار ہوتی ہے۔ لیکن ایسی بات بھی نہیں ہے کہ اُس منزل تک پہنچا نہ جا سکے۔ لیکن یہ جبھی ممکن ہے جب ہم کارواں سے چھٹکارہ پا کر، الگ ہو کر اُس کی جُستجُو کریں، تلاش کریں۔

اے یادِ یار! دیکھ کہ باوصف رنجِ ہجر　　　مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم

عاشق جُدائی کے غم سے دوچار ہے۔ ایسے موقعوں پر محبوب کی یاد بڑی کارگر ہوتی ہے۔ دِل لگا رہتا ہے۔ اب شاعر محبوب کی یاد ہی سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ دیکھ اس کے باوجود کہ ہجر کے رنج سے دوچار ہیں لیکن تمھاری ہلکی ہلکی خلش یعنی یاد کی ہلکی ہلکی چُبھن سے ہم کتنے خوش ہیں۔

اے زہدِ خشک ! تیری ہدایت کے واسطے　　　　سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ اے روکھے، پھیکے پرہیزگار تمھاری رہبری کے لیے ہم کیا سوغات لائے ہیں۔ہم بتوں کے کوچے سے عشق کی سوغات لائے ہیں۔یعنی تو اگر عشق اختیار کرے گا تو تیری پرہیزگاری یوں روکھی پھیکی نہیں رہے گی۔ عشقِ مجازی ہی دراصل حقیقی معبود تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

بے تابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو　　　　آخر بچے نہ اس نگہ ناتواں سے ہم

جب تک محبوب کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کوئی اُس پر عاشق ہے تو وہ اپنے ادائے محبوبانہ سے نہیں دیکھتا۔لیکن جب اُسے یہ پتا چل جاتا ہے تو وہ اُس کی ادائے محبوبانہ سے بسمل ہو جاتا ہے۔اب شاعر کہتا ہے ہماری بے قراریوں سے ہمارے دِل کی آرزو محبوب سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔لہذا ہماری لاکھ کوشش کے باوجود آخر اُس کی نِگاہ ناتوں اپنا کام کر گئی۔ہم اُس نظر سے اپنے دِل کو نہیں بچا سکے۔

حسرتؔ! بھی اور جا کے کریں کس کی بندگی　　　　اچھا، جو سر اُٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

غزل کے آخری شعر یعنی مقطع میں شاعر محبوب کی چوکھٹ کی قدر و قیمت بیان کرتا ہوا کہتا ہے کہ چلئے اُس کے آستانے،اُس کی چوکھٹ سے ہم اپنا سر اُٹھا بھی لیں تو اے حسرتؔ اس سے بڑھ کر یا اُس کی برابری کا دُوسرا کون ہے جس کی ہم بندگی کریں۔اُسے جا کر سجدہ کریں۔گویا کوئی نہیں ہے۔یہ شعر محبوبِ حقیقی کی طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔

6.12 غزل نمبر 9

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام	دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود	رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
حیرت غرورِ حسن سے، شوخی سے اضطراب	دِل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام
دیکھو تو چشمِ یار کی جادُو نگاہیاں	بے ہوش اِک نظر میں ہوئی انجمن تمام
شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میرؔ	حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

6.12.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
دہکا	روشن، جگمگاہٹ	اضطراب	بے چینی، بے قراری، گھبراہٹ
سوز و گداز	جلنے اور پگھلنے کی کیفیت، رقت		

6.12.2 غزل (9) کی تشریح

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام　　　　دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے جلوے سے تمام کی تمام محفل روشن ہو اُٹھی ہے۔ شاعر نے محبوب کو گُل اور بزم کو چمن قرار دیا ہے۔ کہتا ہے اُس گُل کی آگ سے تمام چمن دہک رہا ہے۔ روشن ہو گیا ہے۔

اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود　　　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

اچھا لباس زیب تن کرنا خوب صورتی کو بڑھاتا ہے۔ لیکن شاعر اِس شعر میں ایک دُوسرا پہلو نِکال رہا ہے۔ وہ

بڑے تعجب خیز انداز میں کہتا ہے کہ میرے محبوب کی خوب صورتی کا یہ عالم ہے کہ لباس اُس تن پر آ کر خود حسین ہو جاتا ہے۔ محبوب کا حسن لباس کی خوب صورتی کو بڑھاتا ہے۔

حیرت غرورِ حسن سے، شوخی سے اِضطراب　　　دِل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

شاعر کہتا ہے کہ میرے دِل نے محبوب کے تمام چلن، شیوے سیکھ لیے ہیں حسن کے غرور سے اُس نے حیرت اور اُس کی شوخی سے بے قراری سیکھ لی ہے۔ عاشق کی خصوصیت ہے کہ وہ بے قرار و حیران رہتا ہے۔

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں　　　بے ہوش اِک نظر میں ہوئی انجمن تمام

شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کی جادو بھری نظریں دیکھیے کہ اُس کی اِک نظر میں تمام کی تمام بزم اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ بے ہوش ہوگئی ہے۔

شیرینیٔ نسیمؔ ہے سوز و گداز میرؔ　　　حسرتؔ ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

غزل کے مقطع میں حسرتؔ خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے حسرتؔ تمھارے کلام میں نسیمؔ کی سی مٹھاس ہے۔ نسیمؔ (دیا شنکر نسیمؔ اُردو کا ایک زبردست مثنوی نِگار ہو گزرا ہے) اور میرؔ سا سوز و گداز (میر تقی میرؔ اُردو کا بہت بڑا غزل گو ہے) اور جس کے کلام میں یہ دونوں خصوصیات ہوں اُس کا کیا کہنا۔ اس طرح شاعری کی خوبی تیرے سخن پر تمام ہوتی ہے۔ اُس کے آگے کچھ نہیں ہے۔

6.13 غزل نمبر 10

شبِ فرقت میں یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی
بھلانا ہم نے بھی چاہا، مگر بے اِختیار آئی
تری محفل سے ہم آئے، مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی
جواُن کے حسن سے بھی بڑھ گئی ہے بے قراری میں
تڑپ ایسی کہاں سے حسن میں پروردگار آئی
یہ کیا اندھیر ہے اے دُشمنِ اہلِ وفا تجھ سے
ہوس نے کام جاں پایا، محبت شرمسار آئی
الٰہی! رنگ یہ کب تک رہے گا؟ ہجرِ جاناں کا
کہ روزِ بے دلی گزرا تو شامِ اِنتظار آئی
بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی مگر حسرتؔ!
جو پھر بھی دِل نوازی پر وہ چشمِ سحر کار آئی

6.13.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی
شب فرقت	جدائی کی رات،شب فراق

6.13.2 غزل (10) کی تشریح

شبِ فرقت میں یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی
بھلانا ہم نے بھی چاہا، مگر بے اِختیار آئی

محبوب عاشق سے تغافل برتتا ہے۔ اُس سے بے خبر رہتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ جدائی کی رات میں اُس بے خبر محبوب کی یاد بڑی شدت سے آتی ہے۔ ہم نے اُسے لاکھ بھُلانے کی کوشش کی مگر اُس کی یاد پر ہمارا کوئی اِختیار نہیں چلا اور وہ شدت کے ساتھ آئی۔

تری محفل سے ہم آئے، مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

شاعر محبوب سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ تیری بزم سے ہم آئے مگر کچھ آسودہ حال نہیں بلکہ بُری حالت ہے۔ تماشا تو کامیاب ہوا کہ دید تو نصیب ہوئی مگر آرزو پوری نہیں ہوئی۔ گویا تمنّا بے قراری کی حالت لیے ہوئے لوٹی۔

جو اُن کے حسن سے بھی بڑھ گئی ہے بے قراری میں
تڑپ ایسی کہاں سے حسن میں پروردگار آئی

شاعر کہتا ہے کہ یا خدا محبوب کے حسن میں یہ تڑپ اضطرابی کہاں سے آگئی ہے جو بے قراری میں خود حسن سے بھی دو قدم آگے بڑھتی ہوئی لگتی ہے۔

یہ کیا اندھیر ہے اے دُشمنِ اہلِ وفا تجھ سے
ہوس نے کام جاں پایا، محبت شرمسار آئی

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ وفا کرنے والوں کے دُشمن محبوب یہ کیسا سِتم ہے، یہ کیسی نا اِنصافی ہے کہ اہلِ ہوس کی آرزو تو یہاں پوری ہو جاتی ہے اور اہلِ محبت ناکام و شرمسار آتے ہیں۔

الٰہی! رنگ یہ کب تک رہے گا؟ ہجرِ جاناں کا
کہ روزِ بے دلی گزرا تو شامِ اِنتظار آئی

شاعر کہتا ہے کہ یا خدا محبوب کی جُدائی کا یہ رنگ آخر کب تک رہے گا کہ دِن تو بے دِلی میں گذرتا ہے اور ہر شام اِنتظار کے ساتھ آتی ہے۔ گویا نہ دِن کو راحت ہے اور نہ شب کو سکون ہے۔

بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی مگر حسرتؔ!
جو پھر بھی دِل نوازی پر وہ چشمِ سحر کار آئی

غزل کے مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے حسرتؔ محبت میں جو دُشواریاں اور ناکامیاں ہوئی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے اس کو ترک کرنے کی کوششیں بجا ہیں، درست ہیں لیکن خدانخواستہ اگر وہ جادو کرنے والی محبوب کی آنکھ اگر دِل نوازی پر آئی تو کیا ہوگا۔ کیا پھر یہ کوششیں کامیاب ہوں گی۔

6.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ حسرتؔ کے حالات زندگی کے اہم واقعات کی نشاندہی کیجئے۔

سوال نمبر:2۔ حسرتؔ کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات واکیجئے۔

سوال نمبر:3۔ حسرتؔ کس دبستان شاعری سے تعلق رکھتے تھے؟ کی وضاحت کیجئے۔

سوال نمبر:4۔ اردو شاعری میں حسرتؔ کے کلام کے مقام کا تعین کیجئے۔

سوال نمبر 5:۔ حسرتؔ کی غزلیات کی تشریح معہ حوالہ کیجئے۔

6.15 کتابیات

1 کلیات حسرتؔ موہانی، از مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی، مطبوعہ، فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی

2 مولانا حسرتؔ نوہانی مجاہد آزادی کامل، از پروفیسر سید شفقت رضوی، مطبوعہ، افکار و تحریکات ملی پاکستان

3 مولانا حسرتؔ موہانی، از ڈاکٹر اسلم فرخی، مطبوعہ مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

4 حسرتؔ موہانی، مرتبہ، پروفیسر ثریا حسین، مطبوعہ، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

اکائی نمبر7

فراؔق کی حیات اور غزلیات کی شرح

ساخت:

7.1 سبق کا تعارف

7.2 سبق کا ہدف

7.3 فراؔق کی حیات اور غزلیات کی شرح

7.4 غزل نمبر1

7.4.1 فرہنگ

7.4.2 غزل کی تشریح

7.5 غزل نمبر2

7.5.1 فرہنگ

7.5.2 غزل کی تشریح

7.6 غزل نمبر3

7.6.1 فرہنگ

7.6.2 غزل کی تشریح

7.7 غزل نمبر4

7.7.1 فرہنگ

7.7.2 غزل کی تشریح

7.8 غزل نمبر 5

7.8.1 فرہنگ

7.8.2 غزل کی تشریح

7.9 غزل نمبر 6

7.9.1 فرہنگ

7.9.2 غزل کی تشریح

7.10 غزل نمبر 7

7.10.1 فرہنگ

7.10.2 غزل کی تشریح

7.11 غزل نمبر 8

7.11.1 فرہنگ

7.11.2 غزل کی تشریح

7.12 غزل نمبر 9

7.12.1 فرہنگ

7.12.2 غزل کی تشریح

7.13 غزل نمبر 10

7.13.1 فرہنگ

7.13.2 غزل کی تشریح

7.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

7.15 کتابیات

7.1 سبق کا تعارف

بیسویں صدی کو ادب داں طبقہ تحریکات ورجحانات کی صدی سے تعبیر کرتا اور جانتا ہے انیسویں صدی میں ادب کی فضا بالکل مختلف تھی ،مگر جوں ہی اس کا اختتام ہوا اور عقلیت پسندی کا رجحان بڑھنے لگا خود بخود نئی نئی تحریکیں معرض وجود میں آنے لگیں ،ان تحریکات کا اثر ادب کے تمام ہی اصناف پر ہوا خواہ شاعری ہو یا نثر ،اسی دور میں غزل کی کوکھ سے جدید غزل کی پیدائش ہوئی اور اہل علم کے طبقہ نے ہر چیز میں جدت وندرت تلاش کرنے میں مصروف رکھنے کو ہی قابلیت اور مہارت کا معراج سمجھنا شروع کیا ،اسی انیسویں صدی کے اختتام سے چند سالوں قبل گھورکھ پر سادعبرت کے لکشمی منزل میں رگھوپتی سہائے فراق نے آنکھیں کھولیں ،فراق کی زندگی گلہائے رنگا رنگ سے مزین رہی ہے، اگر ہم فراق کا جائزہ لیں تو ان کی زندگی ہر سطح اور ہر باب میں منفرد دکھائی دیتی ہے۔خواہ ان کی شاعری کا مطالعہ کریں یا ان کی نثر کا جائزہ لیں ،ان کی داخلی زندگی کو دیکھیں یا ان کے خارجی معاملات کو ان کی انفرادیت ہر جگہ مسلم نظر آتی ہے،فراق کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی شاعری میں کئی زبانوں ،کئی تہذیبوں اور کئی تحریکات کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے اور ان سب کے حسین امتزاج سے ان کی شاعری کی جو دنیا آباد ہوتی ہے وہ انہیں بالکل مختلف اور منفرد مقام پر کھڑا کر دیتی ہے،فراق کی شاعری کا بنیادی رنگ اور موضوع حسن وعشق ہے مگر جہاں ان کی شاعری میں خاص طور پر غزل گوئی میں حسن پرستی اور انسان دوستی کے اعلیٰ نمونے اور قدریں ملتی ہیں تو وہیں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی پرچھائیں بھی باہیں دراز کیے ہوئے استقبال کرتی نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جدید غزل گو شعرا میں فراقؔ کا نام کافی اہمیت سے لیا جاتا ہے۔’نغمہ ساز‘ ’غزلستان‘ ’شعرستان‘ ’شبنمستان‘ ’روح کائنات‘ ’گل نغمہ‘ ’روپ‘ ،اور ’گلبانگ‘ کے نام سے کئی شعری مجموعے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

7.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں فراؔق کی غزل گوئی اوران کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ فراؔق کی غزلیات کی تشریح شامل ہے۔اس اکائی کا مقصد طلباء کوفراق کے کلام اوران کی زندگی سے آگاہی کروانا ہے۔فراؔق اپنی جمالیات کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔

7.3 فراؔق کی حیات اورغزلیات کی شرح

حالات زندگی:۔ رگھو پتی سہائے نام اور فراؔق تخلص۔ ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔عُمر کا پیشتر حصہ الہ آباد میں گذارا۔ اِن کے والد عبرؔت بھی اُردو کے اچھے شاعر تھے۔اِس لیے شعری ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ جواہر لال نہرو کے اصرار پر قومی تحریک میں حِصّہ لے چکے تھے اور اِس سِلسِلے میں ایک سال کی قید بھی کاٹی تھی۔سول سروسز کا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈپٹی کلکٹر بھی رہے لیکن قومی تحریک پر مُلازمت کو قربان کردیا۔انگریزی میں ایم.اے کرنے کے بعد انھوں نے انگریزی ادب کی تدریس کو مستقل پیشے کے طور پر اِختیار کیا اور الہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی کے شعبے سے وابستہ رہے۔ ہندو دیو مالا ان کے خون میں رچی بسی تھی۔ ہندوفلسفۂ حیات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ہندی اور سنسکرت ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

فراؔق نے جب شاعری شروع کی تو امیؔر مینائی اور داؔغ کا بول بالا تھا۔فراؔق،امیؔر مینائی سے متاثر ہوئے۔مگر جب اُنھوں نے اُردو شاعروں کا بغور مطالعہ کیا تو اُن کے طرز میں تغیر ہوا اوران کا ایک ایسا طرز بن گیا جو اپنے آپ میں خصوصیتیں اور جدت رکھتی ہے۔محمد حسن عسکری نے اس حقیقت کا اعتراف اِن الفاظ میں کیا ہے:

> ''دس سال کے عرصے میں فراؔق کی شاعری اور تنقید نے اُردو پڑھنے والوں کے ذوق بلکہ طرزِ احساس کو بدل کے رکھ دیا ہے اور ایسے چپکے چپکے کہ خود اپنی طبعیت کو پتا نہیں چلنے پایا۔ اب جو غزلیں لکھی جارہی ہیں اُن میں فراؔق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے،فراؔق کے محاورے سنائی دیتے ہیں،فراؔق کی آواز لرزتی ہے...... بالکل اُسی طرح جیسے غزل گوشعراء

کے یہاں میرؔ اور غالبؔ کا احساس اور محاورہ جا بجا لپک اُٹھتا ہے۔ پچھلے تین چار سال میں جو اُردو غزل کا احیا ہوا وہ پچھتر فیصد فراقؔ کا مرہونِ منت ہے۔ فراقؔ کی شاعری نے اُردو میں ایک اِدارے کی حیثیت اِختیار کر لی ہے۔ شاعر تو شاعر عام پڑھنے والوں کے شعور میں فراقؔ کی شاعری رچتی چلی جا رہی ہے۔"

اُردو غزل جو فارسی اور ایرانی تمدن کی پروردہ تھی، فراقؔ کی تخلیقی اپج کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ فراقؔ کی تخلیقی اپج ایسی زبان اور ایسے لہجے کی تلاش میں سرگرداں رہی جو اسے سہارا دے سکے۔ اس تلاش میں فراقؔ نے بہت خاک چھانی۔ کبھی وہ مصحفیؔ، ذوقؔ، ناسخؔ اور داغؔ کو پہنچے، کبھی کلامِ میرؔ کا لطف لیتے رہے۔ یہ تلاش صرف اُردو شاعری تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ کالی داس، ٹیگور، سورداس، بہاری اور کبیر بھی ان کی توجہ کے مرکز رہے اور انگریزی ادب کے شیلی، کیٹس اور ورڈز ورتھ بھی۔

اِبتدا میں فراقؔ نے جو لہجہ اختیار کیا وہ اُردو غزل کے لیے عجیب تھا جسے دیکھ کر اہلِ ادب حضرات نے فتوی صادر کر دیا کہ اُردو کے ایوانِ غزل میں اِسے جگہ نہیں دی جا سکتی۔ مگر فراقؔ نے ہمت نہیں ہاری اور پھر قارئین اس لہجے کے عادی ہوتے گئے۔ بات بننے لگی اور غزل کی دُنیا میں فراقؔ کا سکہ چلنے لگا۔

کلام کی خصوصیات:۔ فراقؔ کے کلام کی خصوصیات اور خامیوں کو سمجھنا ایک دشوار کام ہے۔ وہ ایک زود گو اور پُر گو شاعر ہیں۔ وہ مصحفیؔ کے انداز کے قائل ہیں۔ فراقؔ کی نکتہ رس طبعیت، ان کے ذہن کی براقی، ان کا وسیع تجربہ، مطالعہ اور مشاہدہ وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے فراقؔ کی غزل کو زریں اور بیش قیمت شعری تجربات سے مالا مال کر دیا ہے۔ اپنے عہد کی پیچیدہ زندگی کے مسائل کو فراقؔ نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے، اپنے احساس کو جزو بنایا ہے اور اشعار کے قالب میں ڈھال دیا ہے ؎

عالم، ازل سے تا بہ ابد بے کراں سکوت
لیکن نکل ہی جاتی ہے کچھ آہ آہ بھی

اور

ہمیں ہیں گل، ہمیں بلبل، ہمیں ہوائے چمن
فراؔق! خواب یہ دیکھا ہے قید خانے میں

فراؔق کی غزل اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائی ہے۔ان کی غزل کا لب ولہجہ سکون،نرمی اور ٹھنڈک سے صاف پہچان لیا جاتا ہے۔ ہندو دیو مالا سے انھوں نے اپنی غزل کو ایک خاص دل کشی بخشی ہے۔ اِس سلسلے میں وہ ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ بھی بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔

پلکیں بند، السائی زُلفیں، نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پر اِک موجِ تبسم، سوؤ ہو یا جاگو ہو

غزلِ فراق کا محبوب عورت ہے اوراس کے جسم کے پیچ وخم کو وہ بہت لطف لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ان کا عشق بھی روشِ عام سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔غزلِ فراؔق کا عاشق بہت تیکھے مزاج کا واقع ہوا ہے۔محبوب کو اس کا احساس ہے۔اس لیے وہ اپنے قدر دان کی ناز برداری کرنے سے نہیں چوکتا۔عشق کو مختلف رنگوں میں انھوں نے کس طرح سے پیش کیا ہے، دیکھیے:

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے
اِک شرح حیات ہو گئی ہے

....

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر؟ پھر بھی
یہ حسن وعشق کا دھوکا ہے سب مگر پھر بھی
افسردگی عشق کو مدت ہوئی مگر
شعلہ سا کچھ دِلوں سے لپکتا ہے آج بھی
توڑا ہے لا مکاں کی حدوں کو بھی عشق نے
زندانِ عقل! تیری تو کیا کائنات ہے

7.4 غزل نمبر 1

نِگاہ ناز نے پردے اُٹھائے ہیں کیا کیا
حجاب اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا؟

جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی
چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا؟

نثار نرگسِ مے گوں کہ آج پیمانے
لبوں تک آتے آتے تھرتھرائے ہیں کیا کیا؟

کہیں چراغ، کہیں گل، کہیں دِلِ برباد
خرام ناز نے فتنے اُٹھائے ہیں کیا کیا؟

دو چار برق تجلّی سے رہنے والوں نے
فریب نرم نِگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا؟

بہ قدرِ ذوق نظر دید حسن کیا ہو؟ مگر
نِگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا؟

پیامِ حسن، پیامِ جنوں، پیامِ وفا
تری نگہ نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا؟

نظر بچا کے ترے عشوہ ہائے پنہاں نے
دِلوں میں دردِ محبت اُٹھائے ہیں کیا کیا؟

وہ اِک ذرا سی جھلک برقِ کم نِگاہی کی
جگر کے زخمِ نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا؟

فراقؔ! راہِ وفا میں سبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا؟

7.4.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
حجاب	پردہ، نقاب، اوٹ، آڑ، حیا، شرم	جھلملائے	لرزے، جگمگائے، لہرائے
نثار	صدقہ، نچھاور، قربان	نرگس	آنکھ اور پیالہ سے مشابہ پھول
خرام ناز	ناز و انداز والی چال، خوش رفتار	عشوہ	ناز و ادا، غمزہ، کرشمہ
پنہاں	پوشیدہ، چھپا ہوا، خفیہ	زخم نہاں	اندرونی چوٹ، اندرونی جلن

7.4.2 غزل(1) کی تشریح

نِگاہ ناز نے پردے اُٹھائے ہیں کیا کیا　　حجاب اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا؟

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی ناز بھری نِگاہیں جو کبھی اُٹھنا گوارا نہیں کرتیں آج ایسے ایسے راز و نیاز کے پردے اُٹھا گئیں ہیں کہ اہلِ محبت یعنی عشاق کو بھی حجاب آ گیا ہے۔محبوب نے محبت سے جس طرح پردے اُٹھائے ہیں اُنھیں دیکھ کر اہلِ محبت تک کو حیا آ گئی ہے۔

جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلووں کی　　چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا؟

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ دُنیا میں محض یہ افواہ تھی کہ تو جلواہ دِکھائے گا۔تو نے جلواہ دِکھایا نہیں تھا۔محض ایک اُڑتی سی خبر تھی کہ تیرا جلواہ دِکھائی دے گا۔اِس خوشی میں کیسے کیسے دیر و حرم یعنی مندر و مسجد کے چراغ جھلملا اُٹھے ہیں۔شاعر نے صنعت حسنِ تعلیل سے کام لیا ہے کہ مندر و مسجد میں چراغ تو ویسے ہی جلتے ہیں لیکن شاعر نے ایک دُوسرا شاعرانہ سبب بتایا ہے کہ محبوب کے جلواہ دِکھانے کی خبر سے خوشی کے چراغ جل اُٹھے ہیں۔

نثار نرگسِ مے گوں کہ آج پیمانے　　لبوں تک آتے آتے تھرتھرائے ہیں کیا کیا؟

اِس شعر میں شاعر نرگسِ مے گوں اِستعارتاً محبوب کی سُرخ آنکھوں کے لیے کہتا ہے۔چونکہ محبوب کی آنکھیں شراب کے رنگ یعنی سرخ اور نرگسی ہیں اِس لیے شاعر نے اُن کو نرگسِ مے گوں کہا ہے۔وہ کہتا ہے کہ ایسی خوب صورت،مست اور جادو بھری آنکھوں کے قُربان جاؤں کہ آج لبوں تک آتے آتے پیالے بھی تھرتھرا گئے ہیں گویا کانپ اُٹھے ہیں۔

کہیں چراغ،کہیں گل،کہیں دِلِ برباد　　خرام ناز نے فتنے اُٹھائے ہیں کیا کیا؟

اِس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی ناز بھری،مست اور جادو بھری چال نے نہ جانے کیسے کیسے فتنے اور فساد اُٹھا رکھے ہیں کہ کہیں چراغ،پروانے کو جلانے کا سبب بنتا ہے تو کہیں گُل کے ہاتھوں بُلبُل آہ و فغاں کر رہا ہے۔کہیں اِسی

چال نے اپنے عشاق کی حالت خراب کی ہے اور وہ دلِ برباد تڑپ رہے ہیں اور آہیں بھر رہے ہیں۔اور یہ سب اُن کی ناز پرور چال کے سبب سے ہے۔

دو چار برقِ تجلی سے رہنے والوں نے　　　　فریب نرم نِگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا؟

شاعر نے محبوب کی نِگاہ کے لیے استعارتاً برقِ تجلی کا لفظ اِستعمال کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ برقِ تجلی سے یعنی محبوب کی نِگاہوں سے دو چار رہنے والوں نے اُن مست آنکھوں سے نہ جانے کیسے کیسے فریب کھائے ہیں کہ اُن کے دھوکے میں آ کر اُنھوں نے خود کو اُن کا دیوانہ بنالیا اور اپنی حالت قابلِ رحم بنالی ہے۔

پیامِ حسن ، پیامِ جنوں ، پیامِ وفا　　　　تری نگہ نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا؟

شاعر کہتا ہے اے محبوب تیری نِگاہیں کیسے کیسے فسانے سُناتی ہیں اور کیا کیا درس دیتی ہیں کہ کہیں حسن پرستی کا پیام ملتا ہے تو کہیں دیوانگی کا سبق اور یہی آنکھیں وفا پرستی کا درس بھی دیے جارہی ہیں۔

وہ اِک ذرا سی جھلک برقِ کم نِگاہی کی　　　　جگر کے زخمِ نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا؟

محبوب کی نِگاہ کو برق سے تشبیہہ دیتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ وہ نیم وا برق سی نِگاہ کی اِک ذرا جھلک نے ہی دل اور جگر کے نہاں زخموں کو ہرا کر دیا ہے۔زخموں کا مسکرانا زخموں کا تازہ ہونا ہوتا ہے۔گویا زخم تازہ ہو اُٹھے ہیں اور درد میں شدت پیدا ہوگئی ہے۔

فراؔق ! راہِ وفا میں سبک روی تیری　　　　بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا؟

شاعر کہتا ہے وفا کی راہ کچھ ایسی آسان نہیں ہے کہ ہر کوئی اس پر چل سکے۔یہ بہت مشکل راہ ہوتی ہے۔یہاں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔لیکن اے فراؔق تم اس وفا کی راہ میں ثابت قدم رہے اور تمھاری اس سبک روی نے وفا کی اِس پُر خطر راہ کو طے کرلیا ہے۔ورنہ اِس راہ میں بڑے بڑوں کے حوصلے جواب دے چُکے ہیں۔بڑے بڑوں کے قدم لڑکھڑا گئے ہیں۔

7.5 غزل نمبر 2

آج بھی قافلہ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہان گزراں ہے کہ جو تھا
ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا
جو بھی کر جور وستم جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست! وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا
جان دے بیٹھے تھے اِک بار ہوس والے بھی
پھر وہی مسئلہ سود و زیاں ہے کہ جو تھا
دیکھ سکنے کی الگ بات، مگر حسن ترا
دولتِ دیدۂ صاحبِ نظراں ہے کہ جو تھا
تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ
آستینوں میں لیے کون و مکاں ہے کہ جو تھا

7.5.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
جور وستم	ظلم وستم، تعدی، جفا	سود وزیاں	فائدہ اور نقصان
تیرہ بختی	بدنصیبی، بدقسمتی، منحوس	دلِ سوزاں	جلتا ہوا دل
آستین	کرتے یا شیروانی وغیرہ کا وہ حصہ جس میں بانہہ رہتی ہیں		

7.5.2 غزل(2) کی تشریح

آج بھی قافلہ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ عشق کا کارواں کوئی نیا نہیں ہے۔ یہ صدیوں پُرانا ہے اور یہ پہلے کی ہی طرح آج بھی رواں دواں ہے۔ وہی اس کی منزل ہے اور وہی راستہ کہ مُدتیں گزرنے پر بھی اِس کے کاروبار اور فعل و عمل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا

شاعر کہتا ہے کہ محبت کے ہاتھ ہمیشہ ناکامی لگتی ہے۔ اندھیرے اُجالے میں اِسے کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔ اِس کے مقدر میں ہمیشہ ہی سے ایک دھندلکے کا عالم رہا ہے۔ نور کے تڑکے کا کہ جس میں سب صاف صاف نہیں دِکھائی دیتا ہے۔

جو بھی کر جور وستم جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست! وہی وہم وگماں ہے کہ جو تھا

شاعر محبوب سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ اے محبوب تو چاہے عاشق پر ظلم وستم روا رکھ یا پھر لطف وعنایت کر مگر تجھ پر جو وہم وگمان پہلے رہا کہ تو بے وفا ہے، عاشق پر ستم روا رکھتا ہے۔ وہ وہم وگُمان ہرگز جانے کا نہیں ہے۔

جان دے بیٹھے تھے اِک بار ہوس والے بھی
پھر وہی مسئلہ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

عشق ومحبت میں بڑی کشش ہے۔ یہ بڑی دِلفریب چیز ہے اور حسن کی دِلفریبی کا تو یہ عالم ہے کہ کوئی بھی اِس کے دھوکے میں آجائے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ ایک بار تو حسن کے فریب میں اہلِ ہوس یعنی حرص وہوس کے بندے بھی

آ گئے اور اس کے دھوکے میں اپنی جان پر کھیل گئے مگر بلآ خر وہ سنبھل گئے اور وہی نفع نقصان کا معاملہ جو ہمیشہ اُن کے پیشِ نظر رہا ہے سامنے آ گیا ہے۔

دیکھ سکنے کی الگ بات، مگر حسن ترا

دولتِ دیدۂ صاحبِ نظراں ہے کہ جو تھا

شاعر کہتا ہے کہ کوئی اِسے دیکھ سکے یا نہیں یہ دُوسری بات ہے مگر اے محبوب تیرا حسن صاحبِ نظر لوگوں یعنی عشاق کی نِگاہوں کی دولت ہے اور یہ صورت جب بھی تھی اور اب بھی ہے۔

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراقؔ

آستینوں میں لیے کون و مکاں ہے کہ جو تھا

شاعر کہتا ہے کہ اے فراقؔ دِل جلوں کی سیاہ بختی کبھی نہیں جاتی۔ سیاہ بختی گویا عشاق کا مقدر ہوگئی ہے۔ آستینوں میں اگرچہ یہ کائنات لیے ہوئے ہے۔

7.6 غزل نمبر3

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر؟ پھر بھی ۔۔۔ یہ حسن وعشق کا دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے ۔۔۔ نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

خوشا اشارہ پیہم! زہے سکوت نظر! ۔۔۔ دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن پلٹنا تھا ۔۔۔ وہ کوچہ روکش جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

تری نِگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے ۔۔۔ اُتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

اگرچہ بے خودی عشق کو زمانہ ہوا ۔۔۔ فراقؔ کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

7.6.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
پیہم	لگاتار، متواتر، مسلسل، تابڑتوڑ، پے درپے	زہے	شاباش، واہ واہ، آفریں
روکش	مقابل، حریف		

7.6.2 غزل (3) کی تشریح

یہ حسن و عشق کا دھوکا ہے سب مگر پھر بھی　　کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر؟ پھر بھی

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ ویسے تو کوئی کسی کا عمر بھر کے لیے نہیں ہوتا۔ راستے ہی میں ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ مگر پھر بھی لوگ محبت بھی کرتے ہیں، ساتھ بھی نبھاتے ہیں۔ اِسی طرح یہ حُسن و عشق کیا ہے۔ محض ایک دھوکہ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں پھر بھی اِس دھوکے میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ یہ دھوکہ دلکش و حسین لگتا ہے۔

نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی　　ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے

شاعر کہتا ہے کہ ایک دو بار نہیں بلکہ ہزاروں بار اہلِ زمانہ اس طرف سے گزر چکے ہیں مگر نہ جانے تمہاری اِس راہ گزر میں وہ کون سی بات ہے کہ جتنی بار اِدھر سے گذرتے ہیں اُتنی بار یہ نئی سی لگتی ہے۔ کہ اِس کو بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔

دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی　　خوشا اشارہ پیہم! زہے سکوت نظر!

شاعر کہتا ہے کہ واہ کیا خوب پیہم اِشارہ ہے اور مرحبا ہے اُس نظر کے سکوت پر، جو خاموشی میں باتیں کرتی ہے۔ گویا دراز ہوتے ہوئے بھی یہ قصّہ، یہ فسانہ بہت مختصر ہے۔ یعنی محبوب کے برابر اِشارے اور نظر کی خاموشی درپردہ طویل فسانے سے کم نہیں ہے مگر یہ خاموشی قصّے کو نہایت مختصر بنا دیتی ہے۔

وہ کوچہ روکش جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی　　پلٹ رہے ہیں غریب الوطن پلٹنا تھا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے کوچے میں بہت کشش ہوتی ہے۔ محبت کے جنوں میں بہت سے دیوانے وہاں پڑے رہتے ہیں۔ مگر وہ اجنبی وہاں کتنی دیر پڑے رہیں گے۔ گھر بلآخر گھر ہے، لوٹ آئیں گے۔ کیوں کہ وہ گلی کوچہ بہت

حسین و دِل کش سہی، روکشِ جنت ہی کیوں نہ ہو مگر پھر بھی گھر کا بدل وہ کوچہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا غریب الوطن یعنی اجنبی لوگ وہاں سے پلٹ رہے ہیں اور اُن کو پلٹنا ہی تھا۔

تری نِگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے　　　　اُتر گیا رگِ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی نگاہوں کا تیر کچھ ایسا نہیں جس سے بچا جا سکے۔ ہم نے اپنی تمام تر زندگی اِس کوشش میں صرف کر دی کہ اے محبوب تمہاری اِن نگاہوں کے تیر سے بچے رہیں مگر پھر بھی وہ تیر ہمارے رگِ وجاں میں اُتر ہی گیا۔ گویا ہم خود کو تمہاری نگاہوں سے نہیں بچا سکے۔

اگر چہ بے خودیِ عشق کو زمانہ ہوا　　　　فراؔق کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

غزل کے مقطعے میں فراؔق کہتے ہیں کہ اے فراؔق اگر چہ ایک زمانے سے ہم عشق میں بے خود ہو گئے ہیں۔ نہ ہمیں اپنا ہوش ہے نہ کسی دوسرے کا مگر پھر بھی محبوب کی وہ شوخ اور جادو بھری نظر اپنا کام کرتی رہی اور ہمیں مزید بے خود کرتی رہی۔

7.7 غزل نمبر 4

سر میں سودا بھی نہیں، دِل میں تمنا بھی نہیں　　　　لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

دِل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں　　　　لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست　　　　آہ! اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں　　　　اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

آہ! یہ مجمعِ احباب، یہ بزمِ خاموش　　　　آج محفل میں فراؔق سخن آرا بھی نہیں

7.7.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
سودا	جنون، دیوانگی، خبط	یگانوں	جاننے والے، قرابت، سگارت، یگانگت
رنجش بے جا	بلاوجہ کی کشیدگی، خفگی	مجمع احباب	دوستوں کی محفل، دوستوں کی مجلس
سخن آرا	شریں بیانی		

7.7.2 غزل(4) کی تشریح

سر میں سودا بھی نہیں، دِل میں تمنا بھی نہیں   لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

غزل کے مطلعے میں فراقؔ کہتے ہیں کہ محبت میں کچھ ایسے زخم کھائے ہیں کہ اب اِس محبت کا بھوت سر سے اُتر گیا ہے۔اب سر میں عشق کی دیوانگی باقی نہیں رہی ہے اور دِل میں اب عشق کی چاہ بھی نہیں۔اب یہ آرزو بھی دِل میں باقی نہیں رہی۔ تاہم ہم کو اپنی محبّت ترک کرنے کا کچھ اعتبار بھی نہیں ہے۔اب ترک کی ہے کب پھر شروع کر دیں، کچھ بھروسا نہیں۔

دِل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں   لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

شاعر کہتا ہے کہ عجب معاملہ ہے کہ ہمارے دِل کو ہمارا محبوب نہ دوستوں میں گنتا ہے اور دُشمنوں میں۔یعنی وہ نہ ہم کو دُشمنوں میں سمجھتا ہے اور نہ دوستوں میں۔ایک طرح کی عجیب بے التفاتی روا رکھی جاتی ہے۔مگر نہ جانے کیوں ہمارا دِل ہے کہ اُس کی جلوہ گاہ سے ہٹنا بھی نہیں چاہتا۔وہ اُس کے در سے اُٹھنا نہیں چاہتا۔

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست   آہ! اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

شاعر کہتا ہے کہ کسی کی حالتِ زار پر رحم کر کے اُس سے کچھ مہربانی کر دینا ایک بات ہے اور محبت دوسری بات۔

اب وہ اپنے محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے محبوب میری قابلِ رحم حالت پر تم نے جو کرم روا رکھا ہے، وہ میں جانتا ہوں کہ وہ محبت نہیں ۔ مجھے تو تیرا وہ مجھ سے بے وجہ ناراض رہنا گوارہ تھا مگر افسوس کہ اب وہ تمہارا بے جا غصّہ بھی ہم پہ باقی نہیں رہا ہے۔ گویا رحم محبت کی علامت نہیں بلکہ غصّہ، شکایتیں وغیرہ محبت میں جائز ہیں۔

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں   اور ہم بھول گئے ہوں تجھے، ایسا بھی نہیں

شاعر کہتا ہے کہ ایک زمانے سے تیری چاہ ہمارے دِل میں پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ تمہاری یاد تک ہمارے دِل میں نہیں آئی مگر اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم تمھیں بھول گئے ہوں۔ ہم اب بھی تیرے چاہنے والے ہیں:

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

آہ! یہ مجمعِ احباب، یہ بزمِ خاموش   آج محفل میں فراقؔ سخن آرا بھی نہیں

مقطعے میں شاعر کہتا ہے کہ افسوس! یہ دوستوں کا مجمع اور محفل میں چھائی یہ خاموشی اور یہ اِس لیے ہے کہ محفل کو گل وگلزار بنانے والا، سخن کو سنوارنے والا فراقؔ آج محفل میں موجود نہیں ہے۔ گویا بزمِ شعر و سخن اُس کے دم سے تھی۔ وہ نہیں رہا تو اِس بزم پر خاموشی طاری ہوگئی ہے۔

7.8 غزل نمبر5

دل کشتہ فریبِ تمنا ہے آج بھی
اُس کی نگاہ اِک نئی دُنیا ہے آج بھی

افسردگیِ عشق کو مدت ہوئی مگر
شعلہ سا کچھ دلوں سے لپکتا ہے آج بھی

گو بے حسیِ دِل کو زمانہ گزر گیا
رہ رہ کے خارِ عشق کھٹکتا ہے آج بھی

نومیدیوں کی مدتِ دیرینہ پر نہ جا
اے چشمِ یار ! تیرا بھروسا ہے آج بھی

اب بھی اُچھل رہا ہے لہو سا فضا میں کچھ
دارورسن پہ عشق کا قبضہ ہے آج بھی

اِس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوصِ سراپا ہے آج بھی

بدلے نگارخانۂ ہستی نے لاکھ رنگ
اندازِ حسنِ یار نرالا ہے آج بھی

گو ہو چکا ہے خاتمہ گفت وشنید کا
دل بے قرار شکوہِ بے جا ہے آج بھی

اب وہ متاعِ درد ہو یا کیف یا نشاط
اُس بزم میں خزانہ سا لٹتا ہے آج بھی

یوں تو فنا بقا کے منازل گزر چکے
دل ذکرِ عاشقی سے جھجکتا ہے آج بھی

سچ جھوٹ کی خبر تو کسے، لیکن اے فراقؔ !
کوئی بیانِ درد سناتا ہے آج بھی

7.8.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
دل کشتہ	جل کر راکھ ہوا دل	افسردگی	بجھا ہوا، ٹھنڈا، سرد، دھیما، پژمردہ
خار	سخت اور باریک کانٹا	دارورسن	سولی، پھانسی
نگارخانہ	تصویرخانہ، تصویرگھر	گفت وشنید	بات چیت، کہنا اور سننا، سوال وجواب
متاع	دولت، مال واسباب	کیف	مستی، سرور، نشہ

7.8.2 غزل(5) کی تشریح

دل کشتہ فریبِ تمنا ہے آج بھی　　اُس کی نگاہ اِک نئی دُنیا ہے آج بھی

شاعر کہتا ہے کہ میرا دِل ہمیشہ آرزو کے فریب میں آجاتا ہے اور نہ جانے کیسے کیسے مصائب سے دوچار اِسے ہونا پڑا ہے۔ آج بھی یہ تمنّا کے فریب ہی کا مارا ہوا ہے۔ اِس کی نظر میں ہمیشہ نئی دُنیا رہی ہے اور آج بھی ہے۔

افسردگی عشق کو مدت ہوئی مگر　　شعلہ سا کچھ دلوں سے لپکتا ہے آج بھی

شاعر کہتا ہے کہ عشق کی آگ کو بجھے ایک زمانہ ہوگیا ہے مگر اب بھی دِلوں سے آتشِ عشق کا شعلہ بھڑک اُٹھتا ہے۔ گویا اِس آگ کی راکھ میں ابھی گرمی باقی ہے۔

گو بے حسی دِل کو زمانہ گزر گیا　　رہ رہ کے خارِ عشق کھٹکتا ہے آج بھی

اگرچہ دِل بے حس ہوگیا ہے اور اِس کی بے حسی کو ایک مُدت بھی گزر چکی ہے تاہم اب بھی رہ رہ کے دِل میں عشق کا کانٹا چبھ جاتا ہے۔

نومیدیوں کی مدتِ دیرینہ پر نہ جا　　اے چشم یار ! تیرا بھروسا ہے آج بھی

شاعر کہتا ہے کہ گو ہمارا دِل محبوب کی جانب سے نا اُمید ہو چکا ہے اور ایک مُدت سے مایوس ہے لیکن اے محبوب اس کی اس دیرینہ نا اُمیدی پر مت جا۔ اس کی نا اُمیدی کو مت دیکھ کہ اے محبوب اب بھی اِسے تیری چشمِ کرم کا بھروسا ہے۔ اِسے یقین ہے کہ ایک دِن یہ نِگاہ ہم پر بھی کرم کرے گی۔

گو ہو چکا ہے خاتمہ گفت وشنید کا　　دل بے قرار شکوہِ بے جا ہے آج بھی

شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ محبوب سے بات چیت کا سِلسلہ ختم ہو چکا ہے لیکن آج بھی اُس سے بے جا شکوے کے لیے دِل بے قرار رہتا ہے۔

اب وہ متاعِ درد ہو یا کیف یا نشاط　　اُس بزم میں خزانہ سا لٹتا ہے آج بھی

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی محفل میں آج بھی ڈھیروں دولت لُٹتی ہے۔ چاہے دُکھ درد کی دولت ہو یا پھر سرور اور خوشی کی دولت۔ وہاں کسی کو سرور حاصل ہے تو کسی کو دُکھ تکلیف۔

7.9 غزل نمبر 6

ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے
حیرت سرائے عشق میں دِن ہے نہ رات ہے

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے
زندانِ عقل! تیری تو کیا کائنات ہے

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا
یہ فرق مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے

یہ موشگافیاں ہیں گراں طبع عشق پر
کس کو دماغِ کاوش ذات و صفات ہے

عنوان غفلتوں کے ہیں، فرصت ہو یا وصال
بس فرصتِ حیات فراق ایک رات ہے

7.9.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
سرائے	مسافر خانہ	سرائے عشق	عشق کے راستے کا مسافر خانہ
مرگ وزیست	موت اور زندگی، اجل اور حیات	موشگافیاں	باریک بینی، نکتہ چینی

7.9.2 غزل(6) کی تشریح

ہر کائنات سے یہ الگ کائنات ہے
حیرت سرائے عشق میں دِن ہے نہ رات ہے

شاعر کہتا ہے کہ محبت کی دُنیا باقی دُنیا سے بالکل الگ ہے۔ یہ ایک حیرت سرا ہے اور عشق کی اس حیرت سرائے یعنی حیرت زدہ دُنیا میں نہ کوئی وقت کا مسئلہ ہے اور نہ کوئی دِن اور رات کا تعین ہے۔ گویا شب و روز برابر ہے۔

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

کوئی بھی تکلیف ہو رات کو شدت اِختیار کرتی ہے اور پھر ہجر کا درد تو اور بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ رات کاٹے نہیں کٹتی۔ بہت لمبی ہوتی دِکھائی دیتی ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ اس جُدائی کے درد نے وہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ نہ آسمان کی گردش کا کچھ احساس ہو پا رہا ہے اور نہ کوئی زندگی کی علامت نظر آ رہی ہے۔ لہٰذا کتنی رات گزر چکی ہے اور کتنی باقی ہے، اندازہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ شاعر ہجر کے درد ہی سے پوچھ رہا ہے کہ تو ہی بتا دے کہ کس قدر رات باقی رہ گئی ہے۔

توڑا ہے لامکاں کی حدوں کو بھی عشق نے
زندانِ عقل! تیری تو کیا کائنات ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے عقل کے قیدی، اے اہلِ دانش و عقل تیری دُنیا ہی کتنی کہ کوئی جس کو نہ پا سکے۔ عشق نے تو ایک جست میں یہ دُنیا چھوڑ دُوسری دُنیا کی حدوں کو لانگ دیا ہے۔ پھر تیری دُنیا کی کیا حیثیت ہے۔

ہستی کو تیرے درد نے کچھ اور کر دیا
یہ فرق مرگ و زیست تو کہنے کی بات ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تیرے دردِ محبت نے میری اِس ہستی کو وہ رونق اور وہ چیز عطا کر دی ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ یہ زندگی موت تو ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ ان میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ زندگی کا کوئی لطف نہیں ہے اور موت کا کوئی رنج نہیں ہے۔

عنوان غفلتوں کے ہیں، فرصت ہو یا وصال
بس فرصتِ حیات فراقؔ ایک رات ہے

شاعر کہتا ہے کہ ''فرقت'' بہ معنی جُدائی یا ''وصل'' بہ معنی ملاپ دراصل بے خبری کے سبب سے دیے گئے عنوانات ہیں۔ ورنہ اے فراقؔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی مہلت ہی بہت قلیل ہے۔ محض ایک رات کی زندگی ہے تو پھر اس میں فرقت کی کیا حیثیت اور وصال کی کیا بساط۔

7.10 غزل نمبر 7

جن کو اتنا یاد کرو ہو ، چلتے پھرتے سائے تھے
اُن کو مٹے تو مدت گزری، نام و نشاں کیا پوچھو ہو؟
جانے بھی دو نام کسی کا آ گیا باتوں باتوں میں
ایسی بھی کیا چپ لگ جانا، کچھ تو کہو، کیا سوچو ہو؟
پہروں پہروں تک یہ دُنیا بھولا سپنا بن جائے ہے
میں تو سراسر کھو جاؤں ہوں، یاد اِتنا کیوں آؤ ہو؟
اتنی وحشت ، اتنی وحشت ، صدقے اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو، میں نہ شکاری، دُور اتنا کیوں بھاگو ہو؟
پلکیں بند، السائی زلفیں، نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پر اک موجِ تبسم، سوؤ ہو یا جاگو ہو؟
اکثر گہری سوچ میں اُن کو کھویا کھویا پاویں ہیں
اب ہے فراقؔ کا کچھ روزوں سے جو عالم کیا پوچھو ہو؟

7.10.1 فرہنگ

مشکل الفاظ **معنی**

تبسم مسکرانا، ایسی ہنسی جس میں آواز نہ ہو

7.10.2 غزل (7) کی تشریح

جن کو اتنا یاد کرو ہو ، چلتے پھرتے سائے تھے

اُن کو مٹے تو مدت گزری، نام و نشاں کیا پوچھو ہو؟

شاعر کہتا ہے کہ تم جن لوگوں کو یعنی عُشاق کو اتنا یاد کر رہے ہو اور ڈھونڈ رہے ہو وہ لوگ کیا تھے؟ چلتے پھرتے سائے کی طرح تھے جو کبھی ایک جگہ قیام نہیں کر سکتے اور بلآ خر تاریکی ہونے پر مٹ جاتا ہے۔ٹھیک اسی طرح سے وہ بھی ایک زمانے سے مٹ گئے۔اب اُن کا نام ونشاں کیا پوچھتے ہو؟ وہ تمھیں کہاں ملیں گے۔میؔر نے کہا ہے ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نِشاں

مُشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

جانے بھی دو نام کسی کا آ گیا باتوں میں

ایسی بھی کیا چپ لگ جانا، کچھ تو کہو، کیا سوچو ہو؟

موقعہ یہ ہے کہ معشوق اور عاشق آمنے سامنے محوِ گُفتگو ہیں۔وہیں غیر کا تذکرہ ہو جاتا ہے تو عاشق خاموش ہو جاتا ہے اور محبوب صفائی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یقین مانو میں نے غیر کا نام جان بوجھ کر نہیں لیا۔یوں ہی باتوں باتوں میں اُس کا نام آ گیا ہے لہذا درگزر کرو۔ایسی بھی کیا خاموشی اِختیار کر لینا۔ارے کچھ تو بتاؤ آخر کیا سوچ رہے ہو؟

پہروں پہروں تک یہ دُنیا بھولا سپنا بن جائے ہے

میں تو سراسر کھو جاؤں ہوں، یاد اِتنا کیوں آؤ ہو؟

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب کبھی کبھی تم اِتنے یاد آتے ہو اور میں اُس یاد میں اِس قدر کھو جاتا ہوں کہ پہروں اس دُنیا سے بے خبر ہو جاتا ہوں۔ یہ دُنیا دیر تک میرے لیے ایک بھُولے سپنے کی مانند ہو جاتی ہے۔ آخر تم اِتنا یاد کیوں آتے ہو؟

اتنی وحشت ، اتنی وحشت ، صدقے اچھی آنکھوں کے

تم نہ ہرن ہو، میں نہ شکاری، دُور اتنا کیوں بھاگو ہو؟

ہرن کی آنکھیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں اور وحشت زدہ بھی۔ اب شاعر کہتا ہے کہ تمھاری اِن آنکھوں کے قُربان جاؤں کہ یہ بہت حسین ہیں لیکن اِن میں اِتنا ڈر کیوں ہے؟ خوف کیوں ہے؟ نہ ہی تم ہرن اور نہ ہی میں شکاری کہ تم کو شکار کر لوں گا۔ لہذا مجھ سے اِتنا دُور دُور کیوں بھاگتے ہو؟

پلکیں بند، السائی زلفیں، نرم سیج پر بکھری ہوئی

ہونٹوں پر اک موجِ تبسم، سوؤ ہو یا جاگو ہو؟

اِس شعر میں شاعر نے لفظوں سے ایک تصویر کھینچ دی ہے۔ ایک منظر دِکھا رہا ہے کہ محبوب کی پلکیں بند ہیں، اُلجھی ہوئی زلفیں نرم نرم بستر پر بکھری ہوئی ہیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ رہی ہے۔ ایسے عالم میں وہ اُس بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ اب شاعر اُس سے دریافت کر رہا ہے کہ تم اِتنا بتا دو کہ اس وقت تم سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟

اکثر گہری سوچ میں اُن کو کھویا کھویا پاویں ہیں

اب ہے فراؔق کا کچھ روزوں سے جو عالم کیا پوچھو ہو؟

غزل کے مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ کچھ دِنوں سے فراؔق کا جو عالم ہے مت پوچھیے کہ ان کو اکثر ہم نے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پایا ہے۔ آج کل نہ جانے وہ کس سوچ میں گھرے رہتے ہیں کہ اُن کو خود کا بھی ہوش نہیں ہوتا۔

7.11 غزل نمبر 8

آنکھوں میں جو بات ہوگئی ہے — اِک شرحِ حیات ہو گئی ہے
کیا جانئے؟ موت کیا تھی پہلے؟ — اب میری حیات ہو گئی ہے
اِس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے
جس چیز کو چھو دیا ہے تو نے — اِک برگِ نبات ہو گئی ہے
ایک ایک صفت فراقؔ! اُس کی — دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

7.11.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی
برگ بنات	گھاس کی پتی، سبزہ

7.11.2 غزل (8) کی تشریح

آنکھوں میں جو بات ہوگئی ہے — اِک شرحِ حیات ہو گئی ہے

شاعر کہتا ہے کہ محبوب نے جو آنکھوں آنکھوں میں بات کر دی ہے وہ کوئی ایسی ویسی معمولی بات نہیں ہے بلکہ اُس نے آنکھوں آنکھوں ہی سے گویا زندگی کی شرح کر دی ہے۔

کیا جانئے؟ موت کیا تھی پہلے؟ — اب میری حیات ہو گئی ہے

شاعر کہتا ہے کہ محبت کرنے سے پہلے ہم کو معلوم نہیں تھا کہ موت کیا چیز ہوتی ہے۔ لیکن اب جب سے محبت کی ہے اور اس کی تکالیف سے دوچار ہوئے ہیں تو لگتا ہے کہ یہی موت جیسے ہماری حیات ہوگئی ہے۔ یعنی ع

اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فر پہ دم نکلے

اِس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے

بیمار کی رات بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ تکلیف شدت اِختیار کر لیتی ہے۔ چوں کہ اس دور میں اِنسان بھی کچھ کم مشکلات و تکالیف سے دوچار نہیں ہے لہذا شاعر کہتا ہے کہ اس دور میں اِنسان کی زندگی بیمار کی رات کی طرح ہو گئی ہے۔ گویا بہت تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ بہت ہی خوب صورت شعر ہے۔

جس چیز کو چھو دیا ہے تو نے　　　　اِک برگِ نبات ہو گئی ہے

معشوق، عاشق کو ایک نظر بھر دیکھ لیتا ہے تو عاشق جی اُٹھتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ اُس کا یہ جادو صرف اِنسانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ جس کسی چیز کو بھی ہاتھ لگا دیتا ہے، چُھو دیتا ہے اُس میں تازگی آ جاتی ہے۔ وہ ایک ہرے بھرے پتے کی طرح سرسبز ہو جاتی ہے۔

ایک ایک صفت فراقؔ! اُس کی　　　　دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اُس کی یعنی محبوب کی ایک ایک ادا، ایک ایک خصوصیت کو جب غور سے دیکھا تو اُس میں حقیقت ہی کا عکس دِکھائی دیا ہے۔ گویا وہ حقیقت ہو گئی ہے۔

7.12 غزل نمبر9

ہیں نغمہ و نشاط بھی، فریاد و آہ بھی
ماتم کدہ بھی دل ہے تری جلوہ گاہ بھی

خاطر میں ایسے ویسوں کو لائی نہ آج تک
اونچی ہے کس قدر، تری نیچی نگاہ بھی

اے شیخ! کاش تیری سمجھ میں یہ راز آئے
ہیں کچھ بُرے ثواب، کچھ اچھے گناہ بھی

عالم، ازل سے تابہ ابد بے کراں سکوت
لیکن نکل ہی جاتی ہے کچھ آہ آہ بھی

محو خطاب، ناصح مشفق ہوں اے فراقؔ!
کچھ مجھ سے کہہ رہی ہے وہ چشمِ سیاہ بھی

7.12.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
نغمہ	راگ، گیت، ترانا، سریلی آواز	نشاط	خوشی، انبساط، خرمی، عیش
ماتم کدہ	ماتم سرا، ماتم خانہ	ازل	ابتدا، آغاز
ابد	دوام، ہمیشگی، غیر متناہی زمانہ	ناصح مشفق	نصیحت کرنے والا، ناصح محترم

7.12.2 غزل(9) کی تشریح

ہیں نغمہ و نشاط بھی، فریاد و آہ بھی
ماتم کدہ بھی دل ہے تری جلوہ گاہ بھی

شاعر کہتا ہے کہ عشق میں اِس دِل کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ اِس میں نغمہ ونشاط یعنی راگ وشادمانی کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے اور آہ وفریاد بھی اِس میں موجود ہے۔ گویا یہ دِل تمھاری تماشا گاہ بھی ہے اور یہی دِل ماتم خانہ بھی بن گیا ہے۔

خاطر میں ایسے ویسوں کو لائی نہ آج تک
اونچی ہے کس قدر، تری نیچی نگاہ بھی

محبوب کبھی نظر اُٹھا کر عشاق کو دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اب شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تمھاری یہ نیچی نظریں بھی کس قدر بُلند ہیں کہ یہ کسی ایرے غیرے کو آج تک خاطر میں نہیں لائی ہیں۔

اے شیخ! کاش تیری سمجھ میں یہ راز آئے
ہیں کچھ بُرے ثواب، کچھ اچھے گناہ بھی

شاعر کہتا ہے کہ اے شیخ تو جو ہر وقت اچھے بُرے، گناہ وثواب کی بات کرتا ہے۔ کاش اِتنی سی بات تیری سمجھ میں آجاتی کہ کچھ گناہ بھی گناہ نہیں ہوتے بلکہ ثواب ہوجاتے ہیں اور کچھ ثواب بھی حقیقت میں ثواب نہیں ہوتے بلکہ گناہ ہوجاتے ہیں۔

عالم، ازل سے تابہ ابد بے کراں سکوت
لیکن نکل ہی جاتی ہے کچھ آہ آہ بھی

شاعر کہتا ہے کہ گو عالم میں ازل سے لے کر ابد تک یعنی اِبتدا سے اِنتہا تک ایک ایسی خاموشی ہے جس کی کوئی حد ہی نہیں ہے پھر بھی اِس دِل سے کبھی کبھی آہ نکل ہی جاتی ہے۔

محو خطاب، ناصح مشفق ہوں اے فراقؔ!
کچھ مجھ سے کہہ رہی ہے وہ چشمِ سیاہ بھی

شاعر کہتا ہے کہ گو ناصح مشفق یعنی نصیحت کرنے والے مہربان خطاب کر رہے ہیں، واعظ و نصیحت کر رہے ہیں لیکن اے فراقؔ محبوب کی سیاہ آنکھیں بھی ہم سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ گویا وہ بھی اپنا جادو جگا رہی ہیں۔

7.13 غزل نمبر 10

یہ کہہ کے کوئی کل بے اختیار روتا تھا	وہ اِک نگاہ سہی کیوں کسی کو دیکھا تھا
کسی کے ہاتھ نہ آیا سوائے غفلتِ ہوش	ہر اک کہ اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا
کچھ ایسی بات نہ تھی تجھ سے دُور ہو جانا	یہ بات الگ ہے کہ رہ رہ کے درد ہوتا تھا
نہ پوچھو سود و زیاں کاروبارِ اُلفت کا	وگرنہ یوں تو نہ کھونا تھا کچھ نہ پانا تھا
لگاوٹیں وہ ترے حسنِ بے نیاز کی آہ!	میں تیری بزم سے جب نا امید اُٹھا تھا
ہر ایک سانس ہے تجدید یاد ایامے	گزر گیا وہ زمانہ ، جسے گزرنا تھا
کہاں پہ چوک ہوئی تیرے بے قراروں سے	زمانہ دوسری کروٹ بدلنے والا تھا
نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی اُمید	مگر ہمیں تو ترا اِنتظار کرنا تھا

7.13.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
سود و زیاں	فائدہ اور نقصان	تجدید	نیا کرنے کا عمل، نیا

7.13.2 غزل(10) کی تشریح

یہ کہہ کے کوئی کل بے اختیار روتا تھا　　　　وہ اِک نگاہ سہی کیوں کسی کو دیکھا تھا

شاعر کہتا ہے کہ کل کوئی نامُراد عاشق سے ہے کہ جو اپنی دِل کی حالت کو لے کے روئے جارہا تھا کہہ رہا تھا کہ وہ ایک نظر ہی سہی مگر میں نے اُس محبوب کو کیوں دیکھا تھا کہ جس کو دیکھنے سے ہمارا دِل بے قرار ہو گیا اور اس کی یہ حالتِ زار ہو گئی۔

کسی کے ہاتھ نہ آیا سوائے غفلتِ ہوش　　　　ہر اک کہ اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا

اِس محبت میں کسی کے ہاتھ ہوش سے بیگانہ ہونے کے سِوا کچھ نہیں آتا۔ کوئی تمنّا پوری نہیں ہوتی۔ یہ وہ چیز ہے کہ ہر کسی بلکہ خود اپنے سے بھی بیگانہ ہو کر جینا پڑتا ہے۔

کچھ ایسی بات نہ تھی تجھ سے دُور ہو جانا　　　　یہ بات الگ ہے کہ رہ رہ کے درد ہوتا تھا

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تجھ سے دُور ہو جانا یعنی تیری جُدائی میں کچھ ایسی بات بھی نہیں تھی کہ جسے کوئی برداشت نہ کر سکے۔ یہ دُوسری بات ہے کہ رہ رہ کر دِل میں ایک ٹیس سی اُٹھتی تھی۔ درد ہوتا تھا۔

نہ پوچھو سود وزیاں کاروبارِ اُلفت کا　　　　وگرنہ یوں تو نہ کھونا تھا کچھ نہ پانا تھا

شاعر کہتا ہے کہ محبت کی تجارت میں نفع ونقصان کی بات مت کرو۔ اِس میں سود وزیاں کو نہیں دیکھتے۔ اِس میں فائدہ یا نقصان کچھ تو ہو گا۔ ورنہ اگر محبت نہ کرتے تو نہ کچھ کھونے کو تھا نہ پانے کو۔

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی اُمید　　　　مگر ہمیں تو ترا اِنتظار کرنا تھا

غزل کے مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب گر تم نے نہ ہی کوئی وصل کا وعدہ کیا ہے نہ ہمیں یقین ہی ہے کہ تو آئے گا بلکہ اُمید بھی نہیں ہے۔ لیکن تیرا اِنتظار کہ بہ ہر صورت ہمیں کرنا تھا سو کر رہے ہیں۔

7.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ فراقؔ کے حالات زندگی قلم بند کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ فراقؔ کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات پر بحث کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ فراقؔ کی جمالیات پر اظہار خیال کیجئے۔

سوال نمبر 4:۔ فراقؔ کی غزلیات کی معہ حوالہ تشریح کیجئے۔

7.15 کتابیات

1 فراق گورکھپوری، شاعر، نقاد، دانشور، از ترتیب وتہذیب، گوپی چند نارنگ، مطبوعہ، ساہیتہ اکادمی، دہلی

2 فراق کی جمالیات، از شکیل الرحمٰن، مطبوعہ، نرالی دنیا پبلیکیشنز، دریا گنج، دہلی

3 انتخاب کلام فراق گورکھپوری، مقدمہ وانتخاب از ابوالکلام قاسمی، مطبوعہ، ساہیتہ اکادمی، دہلی

4 شاعر، دانشور فراق گورکھپوری، از علی احمد فاطمی، مطبوعہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی۔

5 فراقؔ شاعر اور شخص، از ترتیب وانتخاب، شمیم حنفی، مطبوعہ، بک ٹریڈرز، لاہور۔

6 فراقؔ کی شاعری، از ڈاکٹر افغان اللہ خاں، مطبوعہ، آفسٹ پریس عسکر گنج، گورکھپور۔

7 فراقؔ گورکھپوری، از ڈاکٹر سیدہ جعفر، مطبوعہ، ساہیتہ اکادمی، دہلی۔

اکائی نمبر 8

مومنؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح

ساخت:

8.1 سبق کا تعارف

8.2 سبق کا ہدف

8.3 مومنؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح

8.4 غزل نمبر 1

8.4.1 فرہنگ

8.4.2 غزل کی تشریح

8.5 غزل نمبر 2

8.5.1 فرہنگ

8.5.2 غزل کی تشریح

8.6 غزل نمبر 3

8.6.1 فرہنگ

8.6.2 غزل کی تشریح

8.7 غزل نمبر 4

8.7.1 فرہنگ

8.7.2 غزل کی تشریح

8.8 غزل نمبر 5

8.8.1 فرہنگ

8.8.2 غزل کی تشریح

8.9 غزل نمبر 6

8.9.1 فرہنگ

8.9.2 غزل کی تشریح

8.10 غزل نمبر 7

8.10.1 فرہنگ

8.10.2 غزل کی تشریح

8.11 غزل نمبر 8

8.11.1 فرہنگ

8.11.2 غزل کی تشریح

8.12 غزل نمبر 9

8.12.1 فرہنگ

8.12.2 غزل کی تشریح

8.13 غزل نمبر 10

8.13.1 فرہنگ

8.13.2 غزل کی تشریح

8.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

8.15 کتابیات

8.1 سبق کا تعارف

اردو شاعری میں جس طرح اقبالؔ و غالبؔ آفتاب و ماہتاب سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح مومن خاں مومنؔ بھی وہ نیرِ تاباں تھے، جس کی روشنی سے اردو شاعری آج بھی روشن و منور ہے، ان کی رباعی، واسوخت، غزل اور مثنویات میں ایک الگ طرح کی روشنی پھوٹتی تھی۔ مومنؔ کو جو دور ملا، وہ ہندوستان میں سیاسی طور پر ہنگامہ آرائیوں کا دور تھا، ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی و اجتماعی بساط بھی بتدریج پلٹ رہی تھی، لیکن خیر سے اسی زمانے میں اردو زبان اور اردو شاعری کو بلندی و کمال کے نئے آفاق سے روشناسی حاصل ہو رہی تھی، انیسویں صدی کا آغاز ہو رہا تھا اور دہلی اربابِ ادب و شعر کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، غالبؔ، ذوقؔ، داغؔ وغیرہ اپنے اپنے نتائجِ فکر سے نئے شعری و ادبی رویوں کو تشکیل دے رہے تھے، ایسے ماحول میں مومن خاں مومنؔ کو شاعرانہ کمال حاصل کرنے کا خوب موقع ملا اور انھوں نے اردو شاعری میں تغزل کو ایک خاص، منفرد اور دلچسپ سمت عطا کیا۔

8.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں مومنؔ کے حالات زندگی، غزل گوئی اور ان کی غزلیات کی تشریح شامل ہے۔ مومنؔ کا جو دور تھا وہ دور سیاسی اتھل پتھل کا دور تھا تو ایسے ماحول میں مومنؔ کی زندگی کے حالات کیا رہے اور ان حالات میں مومنؔ نے کس نوعیت کی شاعری کہی، کا آسان اور عام زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

8.3 مومنؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح

حالات زندگی:۔ محمد مومن خان نام اور مومنؔ تخلص تھا۔ مومنؔ کوچۂ چیلان دہلی میں ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ خان حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا حکیم نامدار خاں جو کشمیر سے تھے سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں آکر پادشاہی

طبقوں میں شامل ہوگئے اور شاہ عالم کے زمانے میں چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ مومنؔ نے دستورِ زمانہ کے مطابق عربی کی تعلیم شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ علم طب اپنے چچا اور والد سے سیکھا۔ انھوں نے بہت سی پیشن گوئیاں بھی کیئں جو تقریباً سب درست نکلیں۔ اپنے مرنے کی تاریخ اور وقت بھی بتایا تھا جو صحیح ثابت ہوا۔ نجوم میں اِس قدر مہارت حاصل کر لی کہ بڑے بڑے نجومی دنگ رہ گئے۔

مومنؔ کا خاندانی پیشہ طباعت تھا، لیکن مومنؔ کو طب کے علاوہ دوسرے بہت سے علوم وفنون مثلاً منطق، ہئیت، نجوم، ریاضی اور شطرنج میں بھی بہت مہارت حاصل تھی۔ مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو انھوں نے ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ بچپن سے ہی شعر کہنے کی استعداد ان میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست تھا۔ جو بات سنتے تھے فوراً یاد ہو جاتی تھی۔ اِبتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دِکھاتے تھے مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور اپنی ذہانت اور طباعی پر بھروسہ کیا۔ جب مرزا غالبؔ نے ۱۸۴۲ء میں دلی کالج کی Persian پروفیسری قبول کرنے سے اِنکار کیا تھا تو ٹامسن صاحب نے یہی جگہ اسی روپیہ ماہوار پر مومنؔ کو دینا چاہی مگر انھوں نے بھی اِنکار کر دیا۔ انگریزی سرکار کی حکومت میں اُن کی پینشن مقرر ہوگئی۔ وہ نہایت آزادمزاج، قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی دربارداری اور خوشامد سے اُن کو سخت نفرت اور عار تھی۔ یہی اُن کے کریکٹر کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

مومنؔ نے ۱۸۵۳ء میں دہلی میں وفات پائی۔ کوٹھے سے گرنے کے پانچ ماہ بعد اِنتقال کیا۔ کوٹھے سے گرنے کی تاریخ بھی انھوں نے خود کہی تھی۔ ''دست و بازو بشکست = ۱۲۶۸ ہجری۔

تصانیف میں ایک دیوان جس میں چھ مثنویاں ہیں یادگار چھوڑا۔ دیوان کی ترتیب اُن کے شاگرد مصطفٰی خاں شیفتہ نے کی تھی اور ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم الدین صاحب مولف تذکرۂ شعرائے ہند نے اس کو شائع کیا۔

خصوصیاتِ کلام: مومنؔ شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ نہ صرف اپنی ہانت اور طباعی اور دلفریب شاعری کی وجہ سے یا اِس لیے کہ اُن کے معاصرین، اُن کی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اِس لیے کہ وہ ایک صاحبِ طرز ہیں جن کے پیرو نسیمؔ دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیمؔ اور حسرتؔ موہانی وغیرہ ایسے نام ور لوگ ہیں۔

اکثر کہا گیا ہے کہ مومنؔ کی شاعری کا دائرہ تنگ ہے اور وہ حسن وعشق کے حصار سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ یہ کسی حد تک درست بھی ہے لیکن حسن وعشق کا موضوع کوئی معمولی موضوع نہیں بلکہ اِس کائنات کی طرح لامحدود ہے۔ مومنؔ نے یہ کیا کہ حسن وعشق سے متعلق جتنے معاملات ممکن تھے، عاشق کو جتنے واقعات پیش آسکتے تھے اور اس کے دِل پر جتنی بھی کیفیات گزر سکتی تھیں، ان سب کو اپنی غزل میں سمیٹ لیا۔ اُنھوں نے حسن وعشق کے اِس تنگ دائرے میں بھی کیسے کیسے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے اور اِس تنگی کو کیسی گہرائی اور کیسی وسعت سے ہم کنار کر دیا ہے۔ ہجر، وصال، روٹھنا، منانا، کبھی اپنی جاں نثاری پر فخر کرنا کبھی پچھتانا......عشق ومحبت کی کون سی کیفیت ہے جو مومنؔ کے اشعار میں موجود نہ ہو۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

....

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے لاچار جی سے ہم

....

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

کلامِ مومنؔ کی اہم خصوصیات نازک خیالی اور مضمون آفرینی بھی ہے۔ وہ اِس طرح بات سے بات پیدا کرتے ہیں کہ ہمارے لیے اصل مفہوم تک رسائی عام طور پر دشوار ہو جاتی ہے۔ مثلاً

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

مطلب یہ ہماری تباہ حالی کو دیکھ کر ہمارے رقیب کو اندازہ ہو گیا کہ ہم کو عشق ہو گیا ہے۔ گویا ہماری تباہ حالت نے ہمارے رقیب کو نجومی بنا دیا۔

الفاظ کے اِنتخاب اور ان کی ترتیب کا مومنؔ خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ بحروں کا اِنتخاب بھی انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اِس لیے اِن کی زیادہ تر غزلیں بہت مترنم ہیں۔ مثال دیکھئے:

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اِسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دِل بھی میری طرح

اور

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نبھاہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

غرض یہ کہ مومنؔ کا کلام نہایت دل کش ہے اور ان کا شُمار ہماری زبان کے بہت مقبول شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ کلام کا نمونہ دیکھئے:

حالِ دِل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دِل سے جدا نہیں ہوتا

....

کچھ قفس میں اِن دِنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ
بدنامی عشاق کا اعزاز تو دیکھو

8.4 غزل نمبر 1

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا	رنج راحت فزا نہیں ہوتا
ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم	حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے	تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
اُس نے نہ جانے کیا کِیا لے کر	دِل کسی کام کا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے	ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا
حالِ دِل یار کو لکھوں کیوں کر	ہاتھ دِل سے جُدا نہیں ہوتا
چارۂ دِل سِوائے صبر نہیں	سو تمہارے سِوا نہیں ہوتا
کیوں سُنے عرضِ مضطر؟ اے مومن	صنم آخر خدا نہیں ہوتا

8.4.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
اغیار	عدو، دشمن، رقیب	مضطر	بے چین، بے تاب، پریشان

8.4.2 غزل (1) کی تشریح

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا　　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا

غزل کے مطلع میں شاعر محبوب کے حوالے سے کہتا ہے کہ وہ پے در پے ظلم کر رہا ہے اور ہم فریاد کیے جا رہے

ہیں۔لیکن ہماری فریاد کا اُس پر مطلق کوئی اثر ہوتا ہی نہیں ہے۔ وہ برابر رنج والم دیے جا رہا ہے۔کاش! اُسے معلوم ہوتا کہ رنج کبھی مسرت افزا نہیں ہوتا اور وہ رنج دینا بند کر دیتا۔

ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم — حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا

اِس شعر میں شاعر نے کہا ہے کہ ناصح جو نصیحت کرتا تھا کہ بُتوں سے دُور رہو کہ یہ ہمیشہ تکلیف پہنچاتے ہیں اور دین و دُنیا کو غارت کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں تو ہم کو ناگوار گزرتا تھا۔مگر آج جب ہمارے محبوب نے ہماری موجودگی میں ہمارے رقیب کا محبت بھرے لہجے کے ساتھ تذکرہ کیا تو ہمیں بہت تکلیف پہنچی اور احساس ہوا ناصح جو کہتا تھا وہ غلط نہیں تھا۔

بے وفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

محبوب وعدہ کر کے مکر جاتا ہے۔ بے وفائی گویا اُس کا شیوہ ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ ہم سے شکایت ہے کہ ہم اُس کو بے وفا کیوں کہتے ہیں۔اب چاہئے یہ کہ وہ اپنا شیوہ بدل لے۔ نہ ہم اُس کو بے وفا کہیں اور نہ شکایت ہو۔لیکن نہ وہ اپنا چلن بدلتا ہے اور نہ کبھی وعدہ وفا کرتا ہے۔

اُس نے نہ جانے کیا کِیا لے کر — دِل کسی کام کا نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ ہمارا دِل بڑے کام کا تھا لیکن جب یہ محبوب پر آ گیا تو یہ ہمارے قابو میں نہیں رہا۔اب معلوم نہیں کہ ہمارے محبوب نے ہمارا دِل لے کر ایسا کر دیا ہے کہ یہ کسی کام کا ہی نہیں رہا ہے۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ہم نے تم کو پانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے ہیں۔ ہر طرح کی کوشش کی ہے لیکن تو کِسی طرح بھی ہمارا نہیں ہوسکا۔ورنہ اِس مستحکم اِرادے اور کوشش سے دُنیا کا کون سا ایسا کام ہے جو ہو نہیں سکتا۔گویا سب کچھ ممکن ہے لیکن تم کو اپنا بنانا ممکن نہیں ہے۔

حالِ دِل یار کو لکھوں کیوں کر — ہاتھ دِل سے جُدا نہیں ہوتا

یہ فطری ہے کہ جہاں کہیں درد ہوگا اِنسان وہاں ہاتھ رکھ دے گا۔ اب محبوب کے ظلم وستم سے دِل کی حالت خراب ہوگئی ہے۔ دِل ایک پھوڑے کی طرح پک گیا ہے۔ لہذا ہاتھ اُس سے ہٹتا ہی نہیں ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے یار، اپنے محبوب کو خط میں اپنے دِل کی حالت لکھتا اور شاید وہ کچھ رحم کرتا مگر کیا کروں کی درد کی شدت ہے اور ہاتھ اُس کے ساتھ ایسا لگا ہے کہ ہٹتا ہی نہیں۔

چارۂ دِل سِوائے صبر نہیں　　　　سو تمہارے سِوا نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ ہمارے اِس دِل کا علاج صبر کے سِوا اور کچھ نہیں ہے اور پھر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تمہاری جُدائی میں اِس دِل کو صبر کیوں کر میسّر ہوسکتا ہے۔ لہذا اِس کا علاج کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟

کیوں سُنے عرضِ مضطر؟ اے مومن　　　　صنم آخر خدا نہیں ہوتا

غزل کے مقطعے میں شاعر نے نہایت عُمدہ بات کہہ دی ہے۔ خُدا کی خصوصیات میں ایک یہ ہے کہ وہ رحیم ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ اے مومنؔ محبوب بے قرار عاشق کی درخواست کیوں سُنے؟ کہ اُس کا شیوہ تو ظلم کرنا ہے اور پھر محبوب آخر محبوب ہی تو ہے۔ وہ کوئی خدا تو نہیں جو سب کی سُنتا ہے۔

8.5 غزل نمبر2

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا ‎ ‎ ‎ ‎ تم سے دُشمن کی مبارک باد کیا
کچھ قفس میں اِن دِنوں لگتا ہے جی ‎ ‎ ‎ ‎ آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
ہیں اسیر اُس کے جو ہے اپنا اسیر ‎ ‎ ‎ ‎ ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا
نشہ اُلفت میں بھولے یار کو ‎ ‎ ‎ ‎ سچ ہے ایسی بے خودی میں یاد کیا
جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو ‎ ‎ ‎ ‎ بے وفا پر حاصِل بیداد کیا
کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر ‎ ‎ ‎ ‎ ولولہ کیا، نالہ کیا، فریاد کیا
ان نصیبوں پر کِیا اختر شناس ‎ ‎ ‎ ‎ آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا
گر بہائے خون عاشق ہے وصال ‎ ‎ ‎ ‎ انتقامِ رحمت جلاد کیا
بت کدہ جنت ہے، چلیے بے ہراس ‎ ‎ ‎ ‎ لب پہ مومنؔ پرچہ بادباد کیا

8.5.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
وصلت	ملاقات، وصل	قفس	پنجرہ، کابک
اسیر	قیدی، محبوس، گرفتار	صید	شکار کا پیشہ، پھنسا ہوا، قیدی
جلاد	پھانسی دینے والا، قاتل، سنگ دل	ہراس	اندیشہ

8.5.2 غزل (2) کی تشریح

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا ‎ ‎ ‎ ‎ تم سے دُشمن کی مبارک باد کیا

محبوب نے وصل کا وعدہ کیا ہے۔ اب شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تمھارے اِس وصل کے وعدے سے دِل

کیوں کر خوش ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ دِل اچھی طرح جانتا ہے کہ تم کبھی وعدہ وفا نہیں کرتے ہو۔ تم تو ہمیشہ رنج ہی دیتے ہو۔ لہٰذا تم ایسے دُشمن کی خوش خبری پر دِل کیوں کر بھروسا کر سکتا ہے۔

کچھ قفس میں اِن دِنوں لگتا ہے جی　　　آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

گھر سے باہر جی کم ہی لگتا ہے۔ لیکن جب گھر ہی اُجڑ جائے تو کہیں بھی جی کو لگانا پڑتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ پہلے قفس میں ہمارا دِل لگتا نہیں تھا۔ ہر وقت آہ وفریاد کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان دنوں صورت برعکس ہے کہ قید میں جی لگنے لگا ہے۔ تو کیا ہمارا آشیاں یعنی گھر برباد ہوگیا ہے جو اِس طرح قید میں دِل لگنے لگا ہے۔

نشہ اُلفت میں بھولے یار کو　　　سچ ہے ایسی بے خودی میں یاد کیا

محبت کا نشہ بھی عجب سرور رکھتا ہے۔ آدمی ایسا بےخود ہوجاتا ہے کہ سِوائے محبوب کے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ لیکن یہاں معاملہ دُوسرا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اُلفت کے نشے میں ایسے بےخود ہوئے کہ خود کو بھولے ہی تھے، محبوب کو بھی بھول بیٹھے۔ یہ سچ ہے کہ ایسی بےخودی میں کب کچھ یاد رہتا ہے۔ یعنی عشق میں اُس مقام کو پہنچ گئے کہ کچھ بھی یاد نہیں رہا۔

کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر　　　ولولہ کیا، نالہ کیا، فریاد کیا

محبوب برابر ظلم وستم کر رہا ہے۔ عاشق کی حالت قابلِ رحم ہوگئی۔ وہ تڑپ رہا ہے۔ فریاد کر رہا ہے۔ لیکن محبوب پر کوئی اثر ہوتا دِکھائی نہیں دیتا۔ اب شاعر کہتا ہے کہ یا خُدا میں کیا کروں۔ کون سی تدبیر کروں کہ مجھے اِس رنج والم سے نجات مِلے کیوں کہ میرا نالہ، میری فریاد تو سب کچھ بےاثر ہوگئی ہے۔

بت کدہ جنت ہے، چلیے بے ہراس　　　لب پہ مومنؔ پرچہ باد باد کیا

عاشق کے نزدیک دین دُنیا سب کچھ محبوب ہوتا ہے۔ لہٰذا بُت کدہ اُس کے لیے جنت کے برابر ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ اے مومنؔ دو دِلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بُت کدہ جنت ہے۔ بےخوف اور نِڈر ہو کے چلیے۔ لبوں پر اِس طرح کے جُملے کیوں کر آئیں کہ جو ہو سو ہو دیکھا جائے گا۔ آپ سوئے جنت جا رہے ہیں لہٰذا بےہراس چلیے۔

8.6 غزل نمبر 3

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اُڑتے ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا
دُشنام یار، طبع حزیں پر گراں نہیں اے ہم نفس! نزاکتِ آواز دیکھنا
دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا
میری نِگاہ خیرہ دِکھاتے ہیں غیر کو بے طاقتی پہ سرزشِ ناز دیکھنا
کشتہ ہوں اُس کی چشمِ فسوں گر کا اے مسیح کرنا سمجھ کے دعویٰ اعجاز دیکھنا
ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحم سے مومنؔ غم مسال کا آغاز دیکھنا

8.6.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
غمزہ غماز	ابرو یا آنکھ کے اشارے سے، نازونخرے سے	دشنام	برا بھلا، گالی
طالع	قسمت، نصیب، مقدر	جحم	ضخامت۔ جسامت

8.6.2 غزل (3) کی تشریح

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

شاعر محبوب سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ دیکھنا کہیں غیروں پہ ہماری محبت کا راز افشا نہ ہو جائے۔ لہٰذا اگر بزم میں میری جانب دیکھنا ہو تو اے اشارہ کرنے والے محض اِشارے ہی سے دیکھ لینا کہ کسی کو خبر تک نہ ہو۔

اُڑتے ہی رنگِ رُخ مرا نظروں سے تھا نہاں   اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

چہرے کا رنگ اُڑنا گویا ایک رنگ آنا ایک جانا۔ اُڑتا چہرے کا رنگ تو دِکھائی نہیں دیتا اور اُڑنے کی مناسبت سے شاعر نے مُرغ اور پرواز کے لفظ اِستعمال۔ کہتا ہے کہ چہرے کا رنگ اُڑا اور اُڑتے ہی نظروں سے اوجھل تھا۔ اِس ٹوٹے پر کے پرندے یعنی رنگ کی پرواز کو تو دیکھو کہ ایک لمحے میں نظروں سے غائب ہو گیا۔

دُشنام یار، طبع حزیں پر گراں نہیں   اے ہم نفس! نزاکتِ آواز دیکھنا

شاعر محبوب کی آواز کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے محبوب کی آواز کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ اُس کی گالیاں بھی اِس رنجیدہ طبعیت پر ناگوار نہیں گزرتیں۔ حالانکہ نہ ہی گالیاں گوارا ہوتی ہیں اور نہ ہی گالیاں دینے والا۔ مگر اُس کی آواز کی نزاکت اِس ناگوار کو گوارا بنا دیتی ہے۔

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب   تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

شاعر کہتا ہے کہ عشق میں ہمارا حال تباہ ہو گیا۔ ہمارے اس بُرے حال کو دیکھ کر ہمارے رقیب کو اندازہ ہو گیا کہ ہم کو عشق ہو گیا ہے۔ گویا ہماری تباہ حالت نے ہمارے دُشمن کو نجومی بنا دیا۔ اب شاعر کہتا ہے کہ ہمارے اِس سازگار یعنی موافق مقدر کہ ہم کو عشق ہوا کی ناسازی یعنی مخالفت دیکھیے کہ سب کو ہمارے عشق کی راز داری کا پتا چل گیا۔

میری نِگاہ خیرہ دِکھاتے ہیں غیر کو   بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

شاعر کہتا ہے کہ میں نے محبوب کی جانب دیکھا تو میری نِگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ محبوب میری حیران آنکھیں دِکھاتے ہوئے جیسے رقیب کو کہہ رہا ہے کہ اِس کی حالت تو ملاحظہ فرمائیے۔ اب شاعر کہہ رہا ہے کہ میری اس ناطاقتی پر میرے ناز و انداز والے محبوب کی پھٹکار دیکھیے کہ کیسے مجھے غیر کے سامنے ذلیل کر رہا ہے۔

کشتہ ہوں اُس کی چشمِ فسوں گر کا اے مسیح   کرنا سمجھ کے دعویٰ اعجاز دیکھنا

شاعر کہتا ہے کہ میں محبوب کی جادُو کرنے والی نِگاہوں کا قتل کیا ہوا ہوں۔ اِس لیے میرا زندہ ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا اے حضرتِ مسیح آپ اعجاز کا دعویٰ ذرا سوچ سمجھ کر کیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا اعجاز کام نہ آئے اور آپ کو شرمندگی اُٹھانا پڑے۔

8.7 غزل نمبر 4

ڈ رتو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — ہر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم — بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اے چارہ گرو قابلِ درماں نہیں یہ درد — ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ہر وقت ہے دُشنام ہر اِک بات میں طعنہ — پھر اس بھی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو — سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
مومن بخدا سحرِ بیانی کا جبھی تک — ہر ایک کو دعوی ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

8.7.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
افشا	ظاہر کرنا، کھولنا، فاش کرنا، آشکار کرنا	درماں	علاج، معالجہ، چارہ گری
دشنام	گالی، بُرا بھلا	سحر بیانی	پرتاثیر تقریر یا بات

8.7.2 غزل (4) کی تشریح

ڈ رتو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — ہر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

شاعر کہتا ہے کہ اگر میں شکایت میں کچھ نہیں کہتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی سے ڈرتا ہوں۔ مگر ہاں میری یہ طبعیت جگ ظاہر ہے یعنی سب جانتے ہیں کہ میں کچھ زیادہ بولتا نہیں ہوں۔

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم — بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

شاعر کہتا ہے کہ اے ظالم محبوب مجھ سے یہ مت پوچھ کہ میں کیوں چُپ ہو گیا ہوں ۔ یہ چُپ کیوں لگ گئی ہے ۔ اب میں تمھیں کیا بتاؤں کہ وہ کون سی بات ہے جو میں چُپ ہو گیا ہوں اور کچھ بات نہیں کرر ہا ہوں ۔

اے چارہ گر و قابلِ درماں نہیں یہ درد　　　ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے علاج کرنے والو میرا درد، محبت کا درد ہے اور یہ کچھ ایسا نہیں ہوتا جس کا علاج ہو سکے ۔ اگر دردِ محبت علاج کے قابل ہوتا تو میں کیا پھر دیوانہ ہوں، مجھ پر دیوانگی کا عالم ہے جو اِس کے علاج کے لیے نہیں کہتا ۔

ہر وقت ہے دُشنام ہر اِک بات میں طعنہ　　　پھر اس بھی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

شاعر کہتا ہے کہ میرا محبوب ہر وقت دُشنام طرازی کرتا ہے یعنی گالیاں دیتا ہے ۔ اور بات بات پر مجھے طعنے دینا گویا اس کا شیوہ ہو گیا ہے ۔ اِس پر لُطف یہ ہے کہ مجھ سے کہتا ہے کہ میں کچھ بولتا نہیں ۔ اب کوئی بتائے کہ میں کہوں تو کیا کہوں اور کیوں کر کہوں ۔

کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو　　　سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

شاعر محبوب سے مخاطب ہے ۔ کہتا ہے کہ میں نے جو کچھ تمھاری زبان سے سُنا ہے وہ زیادہ گوارا نہیں ہے سو میں چُپ ہو گیا ہوں ۔ اب تم اصرار کرر ہے ہو کہ کچھ بات کرو، کچھ بولو ۔ اب جو تھوڑا کہا ہے اِسے سمجھ سکتے ہو تو سمجھ لو کہ میں زیادہ کچھ کہتا نہیں ہوں ۔

مومنؔ بخدا سحرِ بیانی کا جبھی تک　　　ہر ایک کو دعوی ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

غزل کے مقطعے میں شاعر نے تعلّی سے کام لیا ہے ۔ اپنے ہمعصر شعراء پر چوٹ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اے مومنؔ ہر شاعر کو جو اپنی جادُو بیانی کا دعویٰ ہے وہ قسم خدا کی جبھی تک ہے جب تک میں شعر نہیں کہتا ۔ جب میں نے کہنا شروع کیا تو ان سب کے دعوے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے ۔

8.8 غزل نمبر5

اِظہارِ شوق شکوہ اثر اُس سے تھا عبث	یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث
میں ایک سخت جان ہوں گردوں سے پوچھ لو	تم کو خیال ہے مرے آزار کا عبث
امیدِ وعدہ بھی تو نہیں روزِ ہجر میں	ہم سے وفائے زندگی بے وفا عبث
اس ضعف میں تو سینے سے آتا ہے لب تلک	کہتے ہیں اپنے نالے کو ہم نارسا عبث
اے روزِ حشر کچھ شبِ ہجراں بھی کم نہیں	بدنام ہو جہان میں تری بلا عبث
ہرگز نہ رام وہ صنمِ سنگ دِل ہوا	مومنؔ ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

8.8.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
عبث	بے بار، بے وجہ، ناحق، بے فائدہ	گردوں	آسمان، فلک، چرخ

8.8.2 غزل (5) کی تشریح

اِظہارِ شوق شکوہ اثر اُس سے تھا عبث — یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث

شاعر کہتا ہے کہ میرا محبوب بڑا بے درد اور بے مروت ہے۔ اُس سے کوئی خاک محبت کا اِظہار کرے۔ محبت کا اِظہار اور تاثیر کا شکوہ اُس سے کرنا فضول ہے۔ میں نے جب اُس سے کہا کہ ہم تم پر مرتے ہیں یعنی تم پر عاشق ہیں اور تمھارے عشق میں جان پر کھیل گئے ہیں تو اُس نے کہا سب فضول ہے، بکواس ہے۔

میں ایک سخت جان ہوں گردوں سے پوچھ لو — تم کو خیال ہے مرے آزار کا عبث

شاعر محبوب سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ میں بڑا سخت جان ہوں۔ اگر چاہو تو آسمان سے دریافت کر لو کہ اُس نے لاکھ ستم ڈھائے ہیں مگر میں سلامت ہوں۔ لہذا تم کو میری محبت کی تکالیف سے ناحق پریشانی ہے۔ تم میری تکلیف میرے درد سے متعلق مت سوچو۔

امیدِ وعدہ بھی تو نہیں روزِ ہجر میں　　　　ہم سے وفائے زندگی بے وفا عبث

شاعر کہتا ہے کہ محبوب سے وصل کی بات تو خیر چھوڑیے۔ کہ جُدائی کے روز وہ وعدہ وفا تو کیا کرے گا۔ اُس سے وعدے کی بھی اُمید نہیں ہے۔ اِس لیے یہ بے وفا زندگی ہم سے وفا بھی کرتی ہے تو فضول ہے۔ یعنی کاہے کو جیں گے۔

اس ضعف میں تو سینے سے آتا ہے لب تلک　　　　کہتے ہیں اپنے نالے کو ہم نارسا عبث

شاعر کہتا ہے کہ اِس ناتوانی کے عالم میں بھی ہمارا نالہ، ہماری فُغاں سینے سے لبوں تک آ رہی ہے۔ گویا لبوں تک اِس کی رسائی ہے۔ ہم فضول میں اپنے نالے کو نارسا کہتے ہیں جب کہ اس عالم میں بھی اس کی لبوں تک رسائی ہے۔

اے روزِ حشر کچھ شبِ ہجراں بھی کم نہیں　　　　بدنام ہو جہان میں تری بلا عبث

شاعر قیامت سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ اے قیامت تیری بلائیں زمانے بھر میں مشہور ہیں۔ تو بلاؤں اور تکالیف کے لیے بدنام ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تیری بلاؤں سے تو تنہائی اور جُدائی کی رات بھی کچھ کم نہیں ہے بلکہ زیادہ ہے۔ تیری بلائیں تو فضول میں بدنام ہیں۔

ہرگز نہ رام وہ صنمِ سنگ دِل ہوا　　　　مومنؔ ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

غزل کے مقطعے میں مومنؔ کہتے ہیں کہ وہ سنگ دِل محبوب جس کو پانے کے لیے ہم نے لاکھ جتن کیے۔ دین و دُنیا کی پرواہ نہیں کی، رام نہیں ہو سکا۔ ہم اُس کو قابو نہیں کر سکے اور ہزار افسوس کہ اس سعی میں ہم نے فضول میں اپنا ایمان بھی کھو دیا۔

8.9 غزل نمبر 6

ٹھانی تھی دِل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں، کسی کو کسی سے ہم
منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی! کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا دِل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دِل سے نِکال دیں
مومنؔ نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

8.9.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
ناچار	بے بس، مجبور، بے یارومددگار	بندگی	غلامی، خدمت، نوکری
ربط	دوستی، محبت، لگاؤ، وابستگی	بدعتی	رافضی، فسادی، ظالم

8.9.2 غزل(6) کی تشریح

ٹھانی تھی دِل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ محبت میں جو ہم کو سختیاں اُٹھانی پڑی ہیں اُن سے عاجز آ کر ہم نے اپنے دِل میں اِرادہ کرلیا تھا کہ اب محبوب سے نہیں ملیں گے کہ وہی ہماری تباہی اور بربادی کا سبب ہے لیکن کیا کریں، اِس دِل کو کیسے سمجھائیں۔یعنی اِس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر وہیں جارہے ہیں۔

ہنستے جو دیکھتے ہیں، کسی کو کسی سے ہم
منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ محبت میں ہم نے جو غم اُٹھائے ہیں اُن کے سبب سے ہنسی ہمارے لبوں سے غائب ہوگئی ہے۔ کبھی کوئی ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہوئی جو ہنسی کا سبب بنے اور اب تو یہ عالم ہوگیا ہے کہ کہیں کسی کو کسی سے بات کرتے اور ہنستے دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور دیر تک ہم اُن کو کھِلکھِلاتے چہروں کو دیکھ کر روتے رہتے ہیں۔دُوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمیں تو محبت میں ہمیشہ ناکامیاں اُٹھانی پڑی ہیں۔کبھی وصل کی صورت پیدا نہیں ہوسکی۔لہٰذا جب ہم کسی عاشق کو معشوق کے ساتھ ہنستے یا بات کرتے دیکھتے ہیں تو ہم کو اپنی ناکامیاں یاد آجاتی ہیں اور دیر تک اُن کے منھ کو دیکھ دیکھ کر ہم روتے رہتے ہیں۔

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی! کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ ہمارے دوست، ہمارے ہمدم نے اِس نیاز مند کو آزاد کردیا ہے۔اپنی خدمت سے الگ کردیا ہے۔لیجئے ہماری بندگی، ہماری خدمت دیکھئے کہ ہم بندگی سے بھی چھوٹ گئے ہیں۔یعنی عبادت سے چھوٹ گئے ہیں۔

کیا دِل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ آج کل ہم اپنے جی کو اجنبی یعنی ناواقف سے لگنے لگے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا دِل ہمارا نہ رہا ہو۔ اس کو کوئی ایسا جان پہچان والا لے گیا ہو جو یگانہ نہیں بے گانہ ہو کہ اگر یگانہ ہوتا تو پھر یہ صورت نہ ہوتی۔

لے نام آرزو کا تو دِل سے نِکال دیں
مومؔن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

شاعر کہتا ہے کہ ہم مومؔن ہیں، ایمان والے ہیں۔ اِس کے سِوا ہمارے دِل میں کسی آرزو کا کیا کام ہے۔ اگر دِل آرزو کا نام بھی لے تو ہم اُس کو دل سے نکال باہر کر دیں۔ کہ یہی ایمان ہے۔ اِس سے الگ کسی بری رسم کو چلائیں یا اس سے تعلق رکھیں تو پھر ہم مومن تو نہیں ہوئے۔ شاعر نے اپنے تخلص سے کیا خوب معنی پیدا کیے ہیں۔

8.10 غزل نمبر 7

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح — اٹکا کہیں جو آپ کا دِل بھی مری طرح
خو رنج رشک غیر کی بھی ہم کو ہوگئی — اب اور کچھ نکالیے آزار کی طرح
دل میں ہوائے بُت کدہ ظاہر میں کیا حصول — رہنا حرم میں مومؔن مکار کی طرح
نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں — کمبخت دِل کو چین نہیں ہے کسی طرح
پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے — آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح
نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے — کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح
ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے — کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومؔن اسی طرح

8.10.2 غزل (7) کی تشریح

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح — اٹکا کہیں جو آپ کا دِل بھی مری طرح

شاعر کہتا ہے ہم جو آپ سے دِل لگائے بیٹھے ہیں اور آپ کی بے پروائی کے سبب سے اکثر روتے رہتے

ہیں۔ کچھ مضائقہ نہیں کہ اگر کہیں آپ کا دِل بھی کسی سے اٹکا یعنی اُلجھا تو پھر دیکھنا کہ آپ بھی ہماری ہی طرح پہروں رویا کریں گے۔

خو رنج رشک غیر کی بھی ہم کو ہو گئی   اب اور کچھ نکالیے آزار کی طرح

محبوب عاشق کو آزار دینے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتا ہے۔ عاشق سے بے رُخی اور غیر سے میل جول بڑھانا بھی اُنھی میں سے ایک ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب رقیب سے آپ کے میل جول سے جو ہمیں تکلیف ہوتی تھی اُس کی اب ہمیں عادت سی ہو گئی ہے۔ یعنی اُس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اِس لیے اب ہمیں تکلیف دینے کی کوئی اور صورت نکالیے کہ اِس صورت سے ہمیں رنج نہیں پہنچتا۔

دِل میں ہوائے بُت کدہ ظاہر میں کیا حصول   رہنا حرم میں مومؔن مکار کی طرح

شاعر کہتا ہے کہ دِل سے کوئی بات ہو تو ہو ورنہ محض دِکھاوا لاحاصل ہے۔ اب دِل میں بُت کدے کی ہوس، خواہش ہو اور ظاہر اُفریبی مومؔن کی طرح کعبے میں رہنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔

نے تابِ ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں   کمبخت دِل کو چین نہیں ہے کسی طرح

شاعر کہتا ہے کہ عشق میں اِس دِل کو نہ ہی جدائی کی برداشت ہے اور نہ ہی وصل میں آرام ہے۔ یعنی اِس بدنصیب دِل کو کسی طرح بھی چین نہیں ہے، سکون نہیں ہے۔

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے   آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

کہ ہم محض آسمان کے ظلم وسِتم سے کہاں برباد ہوتے۔ گویا ایک طرف سے رنج والم ہوتے تو برداشت کر لیتے۔ لیکن ہماری جان پر کئی طرح کی آفتیں آئی ہیں۔ تب ہماری یہ حالت ہوئی۔

نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے   کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

شاعر کہتا ہے کہ عشق میں ہم اُس مقام کو پہنچ چکے ہیں کہ نہ ہی محبوب کے پاس جائے بغیر اِس دِل کو چین مِلتا ہے اور نہ ہی وہاں جائے ہی بنتا ہے۔ اب ہم کیا کریں۔ ہمیں تو ہر صورت مشکل ہے۔

8.11 غزل نمبر8

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نبھاہ کا ، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر، وہ کرم کہ تھا میرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گِلے وہ شکایتیں ، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ رُوٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب ہیں جو روبہ رو، تو اشارتوں ہی میں گُفتگُو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اِتفاق سے گر بہم، تو وفا جتانے کو دم بدم
گلہ ملامتِ اقربا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بُری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں بھی تم بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا آپ نے ایک وعدہ تھا
سو نِباہنے کا تو ذکر کیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گِنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

8.11.2 غزل(8) کی تشریح

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی یعنی وعدہ نبھاہ کا ، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب اب تم چاہے ستم کرو یا ہمیں رنج دو تمھاری مرضی۔ مگر ایک زمانے میں ہم دونوں میں آشنائی تھی۔ ایک دِن تم میں اور ہم میں ایک عہد ہوا تھا یعنی یہ وعدہ ہوا تھا کہ ہم زندگی بھر نبھائیں گے۔ تمھیں چاہے یاد ہو یا نہ ہو مگر یہ حقیقت ہے۔

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر، وہ کرم کہ تھا میرے حال پر

مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اے محبوب بہت پہلے جو مجھ پر تمھارے لطف وعنایت تھے، وہ مہربانیاں جو میرے حال پر تمھاری تھیں، میں اُنھیں کہاں بھولا ہوں۔ تمھیں وہ یاد ہو کہ نہ ہو لیکن مجھے وہ سب یاد ہے۔

وہ نئے گِلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں

وہ ہر ایک بات پہ رُوٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اے محبوب وہ ہم دونوں میں شکوے شکایتیں، وہ مزے دار باتیں اور پھر وہ بات بات پر تمھارا رُوٹھ جانا اور میرا منانا تمھیں چاہے یاد ہو یا نہ ہو مگر مجھے سب یاد ہے۔

کبھی بیٹھے سب ہیں جو روبہ رو، تو اشارتوں ہی میں گُفتگُو

وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اے محبوب تمھیں یاد ہے کہ جب سب چھوٹے بڑے سامنے بیٹھے ہوتے تھے تو اِس ڈر سے کہ کہیں ہماری محبت کا راز کسی پر فاش نہ ہو جائے ہم اِشاروں ہی میں گُفتگُو کرتے تھے اور اُن اِشاروں اِشاروں میں سب کے سامنے محبت کا

بیان کر دیتے تھے۔ تمھیں پتا نہیں یاد بھی ہے کہ نہیں۔

ہوئے اِتفاق سے گر بہم، تو وفا جتانے کو دم بدم

گلہ ملامتِ اقربا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اگر کہیں اِتفاق سے ہم دونوں ایک جگہ اِکٹھے ہو جاتے تھے تو دونوں ایک دُوسرے سے ہر گھڑی وفا جتانے کے لیے بے قرار رہتے تھے اور اپنے رِشتے داروں کی دانٹ ڈپٹ کا گلا کرتے تھے۔ ہمیں تو سب یاد ہے، تمھیں چاہے یاد ہو یا نہ ہو۔

جسے آپ گِنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا

میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

غزل کے مقطعے میں شاعر محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے محبوب آپ کو یاد ہو چاہے نہ ہو مگر میں مومنؔ وہی آپ کا عاشق ہوں جسے کبھی آپ اپنا آشنا کہتے تھے اور باوفا خیال کرتے تھے۔

8.12 غزل نمبر 9

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ — دم ہی نِکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

آتی ہے بوئے داغ شبِ تارِ ہجر سے — سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش، یہ خبر نہ تھی — ہے اپنی زندگانی اُسی بے وفا کے ساتھ

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو — کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

یادِ ہوائے یار نے کیا کیا نہ گل کھلائے — آئی چمن سے نکہتِ گل جب صبا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی — آخر تو دُشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ

یارب! وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی — نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بت چھوڑ کر — مومنؔ چلا ہے کعبے کو اِک پارسا کے ساتھ

8.12.2 غزل کی تشریح

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

شاعر کہتا ہے کہ محبوب ظلم وستم کرتا ہے۔ ہمارا حق بنتا ہے کہ ہم شکوہ کریں کہ تم ہم پر ظُلم کرتے ہو۔ لیکن اِس کے برعکس وہ ہم سے شکوے کرتا ہے اور اپنے ستم کے عذر میں الٹا ہمیں کو بے طاقتی کے طعنے دیتا ہے کہ تم اِتنا بھی رنج والم سہنے کی تاب نہیں رکھتے ہو۔

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ — دم ہی نِکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

شاعر کہتا ہے کہ محبوب ہماری مزاج پُرسی کے لیے آئے لیکن اِس طرح آئے کہ قضا کو بھی ساتھ لیتے آئے۔ کہ اُس کی آواز جیسے ہی میرے کانوں میں پڑی، مارے خوشی کے میرا دم ہی نِکل گیا۔

تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش، یہ خبر نہ تھی ہے اپنی زندگانی اُسی بے وفا کے ساتھ

شاعر کہتا ہے کہ ہم اپنے محبوب کے اِس وعدے سے بہت مسرور تھے، خوش تھے کہ وہ پھر آئے گا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہماری تو زندگی ہی اُس بے وفا محبوب کے ساتھ ہے کہ یہ مسرت افزا وعدہ کر کے وہ جیسے ہی گیا ہماری زندگی بھی چلی گئی۔

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

شاعر کہتا ہے کہ شاید وہ پھول ایسا چہرہ رکھنے والا محبوب باغ میں سیر کے لیے گیا ہے کہ خوشبو کے ساتھ ساتھ ہوا میں اُس کی پیشانی اور پاؤں لگی مہندی کا رنگ بھی شامل ہو گیا ہے۔

یادِ ہوائے یار نے کیا کیا نہ گل کھلائے آئی چمن سے نکہتِ گل جب صبا کے ساتھ

شاعر کہتا ہے کہ جب گُلوں کی خوشبو لیے چمن سے ہوا آتی ہے تو اِس دِل میں کیسے کیسے طوفان برپا کر دیتی ہے۔ محبوب کی خواہش، جو کبھی تھی، تاد آ جاتی ہے اور اس کے دِل کو تڑپا جاتی ہے۔ دراصل جب بہار آتی ہے تو عاشق کی دیوانگی میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر نے اِس نکتے کی طرف اِشارہ کیا ہے۔

مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجرِ یار کی آخر تو دُشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ

اِس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اب سے ہم محبوب سے جُدائی کی دُعا مانگا کریں گے اور وہ اس لیے کہ ہماری دُعا اُلٹا اثر رکھتی ہے۔ گویا اثر کو ہماری دُعا کے ساتھ دُشمنی ہے۔ اِس لیے جو دُعا ہم مانگیں گے اُس کا اُلٹا اثر ہوگا اور ہم اگر ہجر کی دُعا مانگیں گے تو وصل ہوگا۔ آتش نے اِسی انداز کا ایک شعر کہا ہے ؎

نہ پوچھ عالمِ برگشتۂ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

8.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ مومن خان مومنؔ کے حالات زندگی ان کے عہد کے تناظر میں قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر 2:۔ مومن خان مومنؔ کے کلام کی اہم خصوصیات کو بیان کیجیے۔

سوال نمبر 3:۔ مومن خان مومنؔ کے دور کے پس منظر میں ان کے کلام کی اہمیت کا تعین پیش کیجیے۔

سوال نمبر 4:۔ مومن خان مومنؔ کس دبستان شاعری سے تعلق رکھتے تھے؟ اس دبستان کا تعارف پیش کیجیے۔

سوال نمبر 5:۔ نصاب میں شامل مومن خان مومنؔ کی غزلیات کی تشریح معہ حوالہ کیجیے۔

8.15 کتابیات

1 کلیات مومن، مقدمہ از ڈاکٹر عبادت بریلوی، مطبوعہ، کتابی دنیا، کراچی لاہور۔

2 مومنؔ شخصیت اور فن، از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، مطبع، یونین پرنٹنگ پریس جامع مسجد، دہلی۔

3 مومن، حیات و شاعری، از احسان دانش، عبدالرحمٰن اصلاحی، مطبع، مکتبہ قیصر اردو، اردو بازار دہلی۔

4 انتخاب، دیوان مومن (مع شرح)، مرتبہ ظہیر احمد صدیقی بدایونی، ناشر، سرسید بک ڈپو پوسٹ نمبر ۲، علی گڑھ۔

5 مومن خان مومنؔ، ایک مطالعہ، ترتیب شاہد ماہلی، مطبع، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔

6 مومن خان مومنؔ، حیات اور مطالعاتی ترجیحات، از معید رشیدی، مطبع، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔

اکائی نمبر 9

ذوقؔ کی حیات اور غزلیات کی شرح

ساخت:

9.1 سبق کا تعارف

9.2 سبق کا ہدف

9.3 ذوقؔ کی حیات، غزل گوئی اور غزلیات کی شرح

9.4 غزل نمبر 1

9.4.1 فرہنگ

9.4.2 غزل کی تشریح

9.5 غزل نمبر 2

9.5.1 فرہنگ

9.5.2 غزل کی تشریح

9.6 غزل نمبر 3

9.6.1 فرہنگ

9.6.2 غزل کی تشریح

9.7 غزل نمبر 4

9.7.1 فرہنگ

9.7.2 غزل کی تشریح

9.8 غزل نمبر 5
9.8.1 فرہنگ
9.8.2 غزل کی تشریح
9.9 غزل نمبر 6
9.9.1 فرہنگ
9.9.2 غزل کی تشریح
9.10 غزل نمبر 7
9.10.1 فرہنگ
9.10.2 غزل کی تشریح
9.11 غزل نمبر 8
9.11.1 فرہنگ
9.11.2 غزل کی تشریح
9.12 غزل نمبر 9
9.12.1 فرہنگ
9.12.2 غزل کی تشریح
9.13 غزل نمبر 10
9.13.1 فرہنگ
9.13.2 غزل کی تشریح
9.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات
9.15 کتابیات

9.3 ذوقؔ کی حیات،غزل گوئی اورغزلیات کی شرح

حالات زندگی:۔ شیخ محمد ابراہیم نام اور ذوقؔ تخلص تھا۔ ۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ویسے اِس بارے میں اِختلافات پائے جاتے ہیں۔شیخ ابراہیم ذوقؔ ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھےجن کونواب لطف علی خان رئیس دہلی کی حرم سرا کے کاروبار کی خدمت سپرد تھی۔ وہ کسی بڑے خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھےلیکن اپنے ذاتی جوہراور فنّی قابلیت سے عالی خاندانوں سے بڑھ کرمشہور ہوئے۔ان کی اِبتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جو شاعربھی تھے اوراکثر مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ ذوقؔ بھی نوعمری میں ہی اُن کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے۔ جہاں لوگوں کے اشعارسُن کراُن کوایک روحانی لذت حاصل ہوتی اورشعر کہنے کا شوق دِل میں پیدا ہوتا تھا۔اِبتدامیں حافظ صاحب سے ہی اصلاح لی اور پھر وہ شاہ نصیر کے شاگرد ہوگئے۔ذوقؔ کی طباعی اورغیر معمولی ذہانت سے تجربہ کاراستادکو یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاگرداستاد سے بڑھ جائے۔ اِسی خیال کی وجہ سے وہ ذوقؔ کی غزلوں کی اصلاح ٹھیک ڈھنگ سےنہیں کرتے اورکبھی یہ کہہ دیتے کہ یہ بہت معمولی قسم کی شاعری ہے۔ذوقؔ نے اُن سے تعلق قطع کرلیا۔وہ خوداپنی اصلاح کرنے لگےاورنتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے کلام نے بہت جلد شہرت حاصل کرلی اوراُن کی غزلیں محفلوں اورمجلسوں حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں گائی جاتی تھیں۔اس زمانہ میں نصیر، ولی عہد ظفرؔ کی غزلوں کی اصلاح کرتے تھےلیکن وہ دہلی سے باہر تھے اِس لیے یہ کام میر کاظم کے سپرد کیا گیا۔اُنھیں بھی دہلی سے باہر کہیں جانا پڑ گیااور اب یہ کام ذوقؔ کے سپرد ہوگیا جس کا صلہ چارروپیہ ماہوار ملنے لگے۔یہیں اُن کی شخصیت میں نکھارآیااور بہت سے شعراء اُن کے شاگرد ہوگئے۔۱۸۵۴ء میں وفات پائی۔

تصانیف:۔ کہتے ہیں کہ غدر کے زمانے میں اُن کا بہت سارا کلام ضائع ہوگیا۔اِس کا ذکرمحمد حسین آزاد نے ”آب حیات“ میں بھی کیا ہے۔ ہاں غزل اورقصیدے کی صورت میں اُن کا کافی کلام دستیاب ہے۔

خصوصیاتِ کلام:۔ ذوقؔ کوشعرگوئی کا شوق اِبتدا ہی سے تھا۔ وہ بہت جلد استادِ کامل بن گئے۔اُنھوں نے کئی

اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی لیکن اُن کی خاص چیز قصیدہ اور پھر اُس کے بعد غزل ہے۔ وہ قصیدے کے بڑے شاعر ہیں اور غزل کے بھی۔ ایسے شعراء بہت ہی کم گزرے ہیں جنھوں نے دونوں اصناف میں نام پیدا کیا ہو۔ ان کی غزلوں میں اختصار اور برجستگی ہے۔ محاورات کا استعمال بھی برمحل ہے۔ کلام میں شوخی ہے۔ سنجیدگی ہے، متانت ہے۔ زبان میں صفائی، شستگی اور سادگی ہے۔ اخلاقیات کا بیان کثرت سے پایا جاتا ہے۔ تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ عام طور پر اُن کا کلام سادہ اور صاف ہے۔ زبان اور محاورات پر انھیں عبور حاصل تھا۔ کلام میں سوز و گداز اور یاس وحسرت پائی جاتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں لطافت کی کمی، مضمون آفرینی اور جذبات کی شدت کی کمی پائی جاتی ہے۔ اُن کے کلام میں شاہ نصیر، سوؔدا، دردؔ، مصحفیؔ اور جرأت سبھی کا رنگ پایا جاتا ہے۔

ذوقؔ قادرالکلام شاعر تھے۔ اُن کا کلام موثر ہے۔ نمونۂ کلام دیکھئے :

تخیل:

آتی ہے صدا جرس ناقہ لیلیٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

اور

نام یوں پستی میں بالا تر ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کنویں کی تہہ میں تارا ہو گیا

تصوف:

دُنیا کا زرومال کیا جمع تو کیا ذوقؔ
کچھ فائدہ، بے دست کرم اُٹھ نہیں سکتا

اور

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

کلام کے چند اور نمونے ملاحظہ ہوں:

لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھے مگر
ایک تیرا نہ مجھے دردِ جدائی دیتا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

....

شکر پردے ہی میں اُس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا ، خدا نے رکھا

....

احسان نا خدا کے اُٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں

9.4 غزل نمبر 1

لکھئے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا　　پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا
بیمار ترا صورتِ تصویرِ نہالی　　کیا اُٹھے سرِ بسترِ غم اُٹھ نہیں سکتا
آتی ہے صدائے جرس ناقہ لیلیٰ　　صد حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا
جوں دانۂ روئیدہ تہ خاک ہمارا　　سر زیرِ گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا
ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے　　جوں حرف سرکاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا
اِتنا ہوں تیری تیغ کا شرمندۂ اجل　　سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا
کیوں اِتنا گراں بار ہے جورختِ سفر بھی　　اے رہرو ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا
دُنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوقؔ　　کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

9.4.2 غزل (1) کی تشریح

لکھئے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا　　پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

محبوب عاشق پر ظلم و ستم کیے جا رہا ہے اور وہ ظلم و ستم عاشق کی برداشت سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ اب شاعر کہتا ہے کہ محبوب کو خط لکھتے کہ اب ہم سے اور ستم اُٹھائے نہیں جاتے۔ کہ شاید وہ ستم کرنا بند کردے۔ مگر کیا کریں کہ کمزوری کے سبب سے اب ہاتھوں میں قلم اُٹھانے کی سکت ہی نہیں رہی ہے۔

بیمار ترا صورتِ تصویرِ نہالی　　کیا اُٹھے سرِ بسترِ غم اُٹھ نہیں سکتا

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تمھارا عاشق ناطاقتی کے سبب سے غالیچے پر نقش و نگار کی مانند ہے۔ وہ غم کے بستر سے کیا اُٹھے گا جو نقش کی مانند ہل نہیں سکتا۔

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ   صد حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

شاعر کہتا ہے کہ لیلیٰ کی اوٹنی کی گھنٹی کی آواز تو آرہی ہے اور مجنوں اُسے سُن بھی رہا ہے، اُس تک پہنچنا کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔ مگر صد افسوس کہ مجنوں کی ٹانگیں پتھر ہو گئیں ہیں۔ پاؤں اُٹھ نہیں سکتے ہیں۔ بقول شاعر ؎

دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست
ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے

جوں دانۂ روئیدہ تہِ خاک ہمارا   سر زیرِ گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

شاعر کہتا ہے کہ جس طرح مٹی کے نیچے دبا ہوا دانہ جب اُگ جاتا ہے تو پھر اُس کا اُٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ اُسی طرح ہمارا سر غموں کے بھاری بوجھ سے دب گیا ہے اور اس کا اُٹھنا محال ہو گیا ہے۔

ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے   جوں حرف سرِ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا

شاعر کہتا ہے کہ میرے اس گناہوں بھرے دامن کے داغ ایسے نہیں ہیں جو دُھل سکیں یا اِن کو اُٹھا کر دامن کو صاف و پاک کیا جا سکے۔ بلکہ اِس دامن کا ہر داغ اُس حرف کی مانند ہے جس کو کاغذ پر سے اُٹھایا نہیں جا سکتا۔

اِتنا ہوں تیری تیغ کا شرمندۂ اجل   سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب میں تیری تلوار، کہ جس نے میرا سر قلم کیا ہے، کا اِس قدر احسان مند ہوں کہ تمھارے سر کی قسم ہے کہ میرا سر اُٹھتا نہیں ہے۔ سر قلم ہو گیا ہے تو اُٹھے گا کیوں کر۔ مگر شاعر نے سر کے نہ اُٹھنے کا ایک دُوسرا شاعرانہ سبب یعنی احسان بتایا ہے۔ گویا حسنِ تعلیل سے کام لیا ہے۔

دُنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوقؔ   کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

کہ اے ذوقؔ دُنیا کی دولت اگر جمع کر بھی لی تو کیا ہے کہ یہ تو کسی کے کام نہیں آتی۔ اُس کے دستِ کرم کے بغیر تو کوئی کچھ اُٹھا نہیں سکتا ہے۔ پھر ناحق اُس کو جمع کرنے میں کوئی اپنی حیات رائیگاں کیوں کرے۔

9.5 غزل نمبر 2

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا — پل بنا، چاہ بنا، مسجدو تالاب بنا

نہ تجھے اشک کے دریا سے مری سوزشِ دل — گرچہ دے شعلہ جوالہ کو گرداب بنا

دلِ بیتاب کو ہم سینے میں ٹھہرا نہ سکے — شعلہ خو دیکھتے ہی تجھ کو سیماب بنا

پوچھیں گر مجھ سے مے عیش ہوئی کب سے تلخ — کہوں جس دِن سے فلک کاسہِ زہرآب بنا

چشمِ مخمور کا ہوں کس کی میں کشتہ یارب — کہ مری خاک سے بھی جام مے ناب بنا

تیری روزی نے مری مہر جہاں تاب کا نور — دیا جس وقت اُڑا کرمکِ شب تاب بنا

ہائے پچھتاتا ہوں کیوں اُس سے کیا میں نے بگاڑ — کہ جواب پھرتا ہوں اس طرح سے بےتاب بنا

آیت سجدہ ہے حق میں مری ہر جوہرِ تیغ — ہے خمِ تیغ فقط کیا خمِ محراب بنا

خالِ عارضی ترا ہندو ہے بلا کا کافر — تیرہ بختوں کی پے ذبح تو قصاب بنا

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ — اپنا آئینہ مرا دیدۂ پر آب بنا

آہ کے ساتھ جو نکلا شررِ آتشِ دل — چرخ پر جا کے وہ خورشید جہاں تاب بنا

جب کیا عشق کے دریا نے تلاطم اے ذوق — تو کہیں موج بنی اور کہیں گرداب بنا

9.5.2 غزل(2) کی تشریح

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا — پل بنا، چاہ بنا، مسجدو تالاب بنا

کہ اگر نام منظور ہو، اگر تو چاہتا ہے کہ تیرے مرنے کے بعد بھی تیرا نام زندہ رہے تو کچھ ایسے کام کر جس سے لوگوں کو فیض پہنچے۔ یعنی اہلِ دُنیا جس سے فیض یاب ہوں۔ نیک اعمال کر۔ اہلِ ہُنر ہے تو کوئی ہُنر کے کام یا پھر کنویں

بنا،مسجدیں بنایاپُل بنا کہ جب تک یہ رہیں گے تمھارا نام زندہ رہے گا۔ ذوقؔ نے ایک دُوسرے شعر میں کہا ہے ؎

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ

اولاد سے تو بس یہی، دو پشت چار پشت

نہ بجھے اشک کے دریا سے مری سوزشِ دل گرچہ دے شعلہ جوالہ کو گرداب بنا

کہ اشکوں کے پانی سے میرے دِل کی آگ بجھنے نہیں سکتی ہے۔ یہ عشق کی آگ پانی سے کب بجھے گی۔ چاہے اِس شعلۂ جوالہ کوبھنور ہی کیوں نہ بنادیا جائے یہ آگ کم نہیں ہوسکتی۔

دلِ بیتاب کو ہم سینے میں ٹھہرا نہ سکے شعلہ خو دیکھتے ہی تجھ کو سیماب بنا

شاعر کہتا ہے کہ ہم اس بے قرار دِل کو سینے میں روک نہیں سکے، اِس کو اپنے سینے میں محفوظ نہیں رکھ سکے۔ کہ جیسے ہی اِس دِل نے اُس گرم مزاج اور شعلہ خومحبوب کو دیکھا تو تڑپ اُٹھا، پارے کی طرح بے قرار ہوگیا اور ہاتھوں سے نکل گیا۔

پوچھیں گر مجھ سے مےعیش ہوئی کب سے تلخ کہوں جس دِن سے فلک کاسۂ زہرآب بنا

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ عیش وعشرت کی شراب کب سے ناگوار ہوئی ہے۔یعنی یہ زندگی کب سے تلخ ہوئی تو میں کہوں گا کہ جب سے یہ آسمان زہراب کا کاسہ بنا ہے۔یعنی زہر مِلا پانی کا پیالہ بنا ہے۔گویا جب سے اِنسان زیرِ آسمان ہے اور گردش میں ہے تب سے اِنسان کی زندگی تلخ ہوگئی ہے۔

چشمِ مخمور کا ہوں کس کی میں کشتہ یارب کہ مری خاک سے بھی جام مے ناب بنا

کہ یا خدا میں کس کی نشیلی آنکھوں کا مارا ہوا ہوں کہ مدہوشی اور سرمستی میری سرشت بن گئی ہے۔ یہاں تک کہ

میری خاک میں بھی یہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ اس مٹی سے جو جو پیالہ بنایا گیا ہے وہ بھی خالص شراب ہی کا ہے۔

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ　　　اپنا آئینہ مرا دیدۂ پر آب بنا

کہ اے محبوب تو اگر اپنا جلواہ ملاحظہ کرنا چاہتا ہے تو آئینے کے سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ میری آنکھوں میں نظارہ کر لے۔ گویا میری اِن اشک آلود آنکھوں کو اپنا آئینہ بنا لے۔

آہ کے ساتھ جو نکلا شرِ آتشِ دل　　　چرخ پر جا کے وہ خورشید جہاں تاب بنا

کہ محبوب کے ظلم وستم کے سبب سے میرے دِل میں ایک آگ سُلگ رہی ہے اور ہر وقت اِس دِل سے آہیں نکل رہی ہیں۔ اب اِن آہوں کے ساتھ دِل کی آگ کی چنگاری نکل کر جب آہ کے ساتھ فلک پر گئی تو وہ دُنیا کو روشنی اور گرمی دینے والا سورج بن گئی۔

جب کیا عشق کے دریا نے تلاطم اے ذوقؔ　　　تو کہیں موج بنی اور کہیں گرداب بنا

کہ میرے دِل میں عشق کا ایک دریا موجزن ہے اور جب اِس عشق کے دریا میں، سمندر میں طوفان آتا ہے تو کہیں لہر بن جاتی ہے کہ جس کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا اور کہیں یہ بھنور بنا جاتا ہے کہ جس میں ڈوب کر کوئی اُبھر نہیں سکتا۔

9.6 غزل نمبر 3

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس اِنسان کو سگِ دُنیا نہ پایا — فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا
مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے — تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا
لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام — خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا
سراغِ عمرِ رفتہ ہو تو کیوں کر — کہیں جس کا نِشاں پا نہ پایا
رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا — غبار راہ بھی عنقا نہ پایا
تہِ خنجر ترے بسمل نے ہے ہے — ذرا قابو تڑپنے کا نہ پایا
احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے — نکل جاتے مگر رستا نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
چراغِ داغ لے کر دِل میں ڈھونڈا — نِشاں پر صبر و طاقت کا نہ پایا
وہ ازخودرفتہ ہوں جس کی خودی نے — خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا
کبھی تو اور کبھی ترا ار ہا غم — غرض خالی دِلِ شیدا نہ پایا
وہ بولے دیکھ کر تصویرِ یوسف — سُنا جیسا اُسے ویسا نہ پایا
نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل — سِتم میں بھی تجھے پورا نہ پایا
نظیر اُس کی کہاں عالم میں اے ذوقؔ — کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

9.6.1 فرہنگ

معنی	مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ
سگ	بدکردار، کتا، بداطوار	لحد	قبر، مزار، صندوق
عنقا	نایاب، معدوم، ناپید، نادر		

9.6.2 غزل (3) کی تشریح

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا　　　اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

شاعر محبوبِ حقیقی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُسے یعنی خُدا کو ہم نے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ ہم نے اُس کی بہت جُستجُو کی لیکن لاحاصل کہ وہ کہیں نہیں مِلا۔ اِس کھوج، اِس جُستجُو میں اگر ہم نے کچھ پایا تو یہ پایا کہ خود اپنے کو کھو دیا۔ خود اپنے کو کھوج نِکالنا مشکل کام ہو گیا۔

جس اِنسان کو سگِ دُنیا نہ پایا　　　فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا

لالچ ہی اِنسان کی برائیوں کا سبب ہوتا ہے۔ اگر حرص و ہوس اِنسان میں نہ ہو تو پھر کیا کہنے۔ یہی بات اِس شعر میں شاعر نے کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر دُنیا میں آدمی حرص و ہوس کا غلام نہ ہو تو پھر اُس کا مرتبہ بہت بُلند ہے۔ اِتنا بُلند کہ فرشتہ بھی اِس کی برابری نہیں کر سکتا۔

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے　　　تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

لوگ اکثر اپنی ناکامیوں کو مقدر سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر نفع نقصان سب تقدیر پر ہی منحصر ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب مقدر ہی کا کھیل ہے تو پھر ہم نے کیا کِیا؟ گویا ہم نے اِس دُنیا میں نہ کچھ کھویا ہے نہ پایا ہے۔ جب کہ حقیقت برعکس ہے۔

لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام   خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

اے محبوب تیرے عشق میں ہم زندگی بھر بے قرار رہے۔ تمام عمر ہمیں آرام نہیں ملا اور یہ بے قراری ہماری زندگی کا اِس طرح حصّہ بنی رہی کہ یقین نہیں کہ مجھے مرنے کے بعد قبر میں بھی آرام مِلا ہے کہ نہیں۔

سراغِ عمرِ رفتہ ہو تو کیوں کر   کہیں جس کا نِشاں پا نہ پایا

کہتا ہے کہ کہیں سے کوئی آدمی گزرے تو اُس کے پاؤں کے نشان سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اِس طرف سے کسی کا گزر ہوا ہے مگر گزری عمر کا کوئی سُراغ لگائے تو کیوں کر۔ کہ وہ تو چپکے سے گزر جاتی ہے۔ کہیں پاؤں کے نِشان بھی نہیں چھوڑتی کہ دریافت کر سکے۔

رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا   غبار راہ بھی عنقا نہ پایا

شاعر کہتا ہے کہ ہم اِس دُنیا سے کیا گئے کہ ہمارا نِشان تک باقی نہیں رہا۔ زندگی اور دُنیا کی اِس گم گشتہ راہ میں ہم ایسے بے نِشان ہو گئے کہ ہمارا غُبارِ راہ بھی ناپید ہو گیا۔ کہ جس راہ میں گرد ہوئے تھے وہ گرد بھی عنقا ہو گئی۔ (عنقا وہ خیالی پرندہ ہے جو کسی کو دِکھائی نہیں دیتا) اِسی انداز کا ایک شعر دردؔ کا ہے ۔

گمنام اب جہاں میں مجھ سا نہیں ہے کوئی

عنقا کا نام تو ہے ہر چند بے نِشاں ہے

تہ خنجر ترے بسمل نے ہے ہے   ذرا قابو تڑپنے کا نہ پایا

کہ عاشق کو صبر لازم ہے۔ جس میں صبر اور استقلال نہیں ہو گا وہ سچا عاشق نہیں ہو سکتا۔ اب شاعر کہتا ہے کہ افسوس تیرا عاشق زیرِ خنجر تڑپنے پر قابو نہیں پا سکا۔ گویا عشق میں اُس نے اپنی ناپختگی کا ثبوت دیا ہے۔

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے   نکل جاتے مگر رستا نہ پایا

شاعر نے اِنسانی زندگی کی لاچاری اور مجبوری کی عکاسی کی ہے۔ کہتا ہے کہ نہ یہ زندگی کوئی انعام ہے اور نہ یہ دُنیا رہنے کی بہترین جگہ۔ لہذا ہم اِس آسمان کی چار دیواری سے کب کے نِکل چکے ہوتے۔ یعنی اِس دُنیا سے کب کے

چلے گئے ہوتے مگر لاچار تھے کہ کوئی راستا ہی نہیں سوُجھ رہا تھا۔ ہمارے دور کے ایک اور شاعر عرشؔ نے بھی اِسی انداز کا ایک شعر کہا ہے ۔

میں نکلتا بھی تو کیوں کر حِصارِ یار سے

صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا

وہ بولے دیکھ کر تصویرِ یوسف سُنا جیسا اُسے ویسا نہ پایا

حضرت یوسف سے متعلق مشہور ہے کہ دُنیا میں سب سے زیادہ خوب صورت تھے۔ بلکہ تمام حسن کا تین چوتھائی اُن میں تھا۔ اب شاعر کہتا ہے کہ محبوب حسین ہے لیکن اپنے حسن کا گُمان اُس کو کس قدر ہے اِس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے حضرت یوسف کی تصویر کو دیکھا تو کہنے لگا کہ ہاں خوب صورت ہے۔ مگر جتنی شہرت تھی ویسا خوب صورت نہیں ہے۔

نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل سِتم میں بھی تجھے پورا نہ پایا

کہ اے ظالم محبوب تو کرم کرنے میں تو خیر ادھورا ہے ہی، سِتم کرنے میں بھی پورا نہیں ہے۔ یعنی ناقص ہے۔ کہ اپنے عاشق کو زخمی کرنے کے لیے جو خنجر اُٹھایا بھی تو زور کا وار نہیں کیا، تو نے زور کا ہاتھ نہیں مارا کہ زخم گہرا ہوتا اور درد کی شدت میں اِضافہ ہوتا۔

نظیر اُس کی کہاں عالم میں اے ذوقؔ کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

غزل کے مقطعے میں شاعر خود سے مخاطب ہے۔ کہتا ہے کہ اے ذوقؔ دُنیا میں حسین لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر ایسا کوئی نہیں ہے جو ہمارے محبوب کی برابری کر سکے۔ وہ ایسا ہے کہ جس کی نظیر نہیں مِل سکتی۔ دُنیا میں نہ کوئی ویسا ہوا ہے اور نہ کوئی ہوگا۔

9.7 غزل نمبر 4

نام یوں پستی میں بالاتر ہمارا ہوگیا　　　جس طرح پانی کنویں کی تہہ میں تارا ہوگیا

میرے نالوں سے جو پانی سنگ خارا ہوگیا　　　کوہ کی چشموں کا ہر آنسو شرارا ہوگیا

ذکرِ دُنیا نفس مردہ کو ہوا آبِ حیات　　　مر کے یہ سیماب پھر زندہ دوبارا ہوگیا

دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اُس مہہ پارہ کے　　　میں نے جانا ماہ تاباں پارا پارا ہوگیا

رشک سے اُس زُلف کی کیا مشک ہی یکسر ہے خون　　　بلکہ جل کر سوختہ عنبر بھی سارا ہوگیا

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوارا　　　پر اُمیدِ وصل میں برسوں گوارا ہوگیا

ہے مقامِ زندگی زیرِ دمِ شمشیرِ مرگ　　　ہوگیا جس طرح کوئی دم گوارا ہوگیا

دی شہادت نشے کی سرخی سے چشمِ یار نے　　　خوں رہا اپنا نہ پنہاں آشکارا ہوگیا

ذوقؔ اس بحرِ جہاں میں کشتی عمر رواں　　　جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہوگیا

9.7.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
سیماب	پارہ	عنبر	خوشبو، شاہ بو، عمدہ خوشبو

9.7.2 غزل (4) کی تشریح

نام یوں پستی میں بالاتر ہمارا ہوگیا　　　جس طرح پانی کنویں کی تہہ میں تارا ہوگیا

شاعر کہتا ہے کہ اِس پستی میں ہمارا نام بُلند ہوگیا ہے۔ ہم اِس درجہ پست ہیں کہ اِس بُلندی کے مستحق نہیں۔

جس طرح پانی کنویں کے نیچے سے تارے کی طرح دِکھائی دیتا ہے۔ گو وہ پستی میں ہے لیکن تارا لگتا ہے۔ اُسی طرح ہم بھی پست ہیں گو ہمارا نام بالا ہو گیا ہے۔

میرے نالوں سے جو پانی سنگ خارا ہو گیا　　　کوہ کی چشموں کا ہر آنسو شرارا ہو گیا

کہ میر نالوں اور فغاں کی تاثیر سے پانی نیلگوں پتھر یعنی نیلا پتھر پہاڑ ہو گیا ہے، تو اِس کا اثر یہ ہوا ہے کہ کوہ کی آنکھوں کا ہر آنسو چنگاری بن گیا ہے۔ اِشارہ کوہِ آتش فشاں کی طرف ہے۔

ذکرِ دُنیا نفس مردہ کو ہوا آبِ حیات　　　مر کے یہ سیماب پھر زندہ دوبارا ہو گیا

کہ دُنیا داری کا ذکر مردہ روح کے لیے آبِ حیات کا سا کام کرتا ہے کہ اس کا ذکر سُنتے ہی اُس کی جان میں جان آ جاتی ہے۔ گویا یہ مردہ روح پارے کی مانند ہے جس کو مار کر اُس میں وہ کیفیت پیدا کی جاتی ہے جس کو تڑپ اور بے قراری کہتے ہیں۔ اب یہ نفسِ مردہ ذکرِ دُنیا سُنتے ہی زندہ ہو اُٹھتی ہے۔ اِس لیے بے قراری اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار　　　پر اُمیدِ وصل میں برسوں گوارا ہو گیا

کہ محبوب کی جُدائی میں جینا بہت مشکل تھا۔ بلکہ اُس کے ہجر میں ایک پل کے لیے بھی زندہ رہنا گوارا نہیں تھا۔ لیکن وصل کی اُمید نے برسوں ہمیں زندہ رکھا۔ یعنی اِس اُمید میں کہ ایک دِن وصل ہو گا، برسوں ہم کو جینا گوارا ہو گیا۔

ہے مقامِ زندگی زیرِ دمِ شمشیرِ مرگ　　　ہو گیا جس طرح کوئی دم گوارا ہو گیا

کہ زندگی کا مقام اصل میں موت کی تلوار کے نیچے ہے۔ ہر وقت دمِ واپسیں کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اِس صورت میں کون سکون سے بسر کر سکتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ یہ کوئی دم کی جو زندگی تھی ہم نے جیسے تیسے گزار لی ہے۔

دی شہادت نشے کی سرخی سے چشمِ یار نے　　　خوں رہا اپنا نہ پنہاں آشکارا ہو گیا

کہ محبوب کی آنکھوں میں شراب کی مستی ہے اور اُن خمار آلودہ آنکھوں میں جو لال ڈورہ ہے وہ گویا ہمارے قتل کی گواہی دے رہا ہے۔ اُس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اُن آنکھوں نے خون کیا۔ کہ خون کی لالی دھار کی صورت میں موجود

ہے۔ ہمارا خون چھپ نہیں سکا بلکہ سب پر عیاں ہو گیا ہے۔

ذوقؔ اس بحرِ جہاں میں کشتی عمر رواں — جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

کہ اے ذوقؔ دُنیا کے دریا میں عمر کی کشتی کی کوئی مخصوص منزل نہیں ہے۔ گویا معلوم نہیں ہے کہ اس کو کہاں پہنچنا ہے۔ یہ جس جگہ جا لگے گی وہی اِس کا کنارہ ہو جائے گا۔ گویا کب، کہاں اور کیسے موت آ کر زندگی کو ختم کر دے گی کچھ معلوم نہیں ہے۔ غالبؔ نے اِسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

9.8 غزل نمبر 5

نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا — اے فلک گر تجھے اُونچا نہ سُنائی دیتا
دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا — آسماں آنکھ کے تل میں ہے دِکھائی دیتا
لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھے مگر — ایک تیرا نہ مجھے دردِ جُدائی دیتا
پنجۂ مہر کو بھی خونِ شفق میں ہر روز — غوطے کیا کیا ہے تیرا دستِ حنائی دیتا
روشنِ اشک گرا دیں گے نظر سے اِک دن — ہے ان آنکھوں سے یہی مجھ کو سجھائی دیتا
میں ہوں وہ صید کہ پھر دام میں پھنستا جا کر — گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا
خوگرِ ناز ہوں کس کا کہ مجھے ساغرِ مے — بوسۂ لب نہیں بے چشم نمائی دیتا
منھ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے — گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا
دیکھ گر دیکھنا ہے ذوقؔ کہ وہ پردہ نشیں — دیدۂ روزن دل سے ہے دِکھائی دیتا

9.8.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی
تل	وہ نقطہ جو عموماً سیاہ رنگ کا آنکھ کی پتلی کے بیچوں بیچ ہوتا ہے، تل کے برابر جگہ، ایک قسم کا تخم جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔
صید	شکار کا پیشہ، شکار کرنا
حریص	لالچی، لالچ کرنے والا، نیت خراب، پیٹو

9.8.2 غزل(5) کی تشریح

نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا　　　اے فلک گر تجھے اُونچا نہ سُنائی دیتا

شاعر کہتا ہے کہ اے فلک چھوٹی آواز تیرے کانوں میں کہاں پڑتی ہے۔ اگر تجھے اُونچا نہ سُنائی دیتا تو میں اِس قدر زور سے آہ وفریاد کیوں کرتا۔

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا　　　آسماں آنکھ کے تل میں ہے دِکھائی دیتا

اللہ کس کو اعلیٰ مرتبہ دے دے کس کو خبر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دیکھ خدا کس طرح چھوٹوں کو عظمت بخش دیتا ہے کہ آنکھ کا تل کس قدر چھوٹی چیز ہے لیکن پورا آسمان اُس میں سمایا دِکھائی دیتا ہے۔

لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھے مگر　　　ایک تیرا نہ مجھے دردِ جُدائی دیتا

کہتا ہے کہ آسمان لاکھ تکالیف دیتا، لاکھ مشکلیں نازل کرتا۔ ہم کو سب گوارا ہوتے اور اُف تک نہ کرتے۔ لیکن ہاں اے محبوب تری جُدائی کا درد بہت سخت ہے۔ یہ گوارا نہیں ہوتا۔ کاش! وہ یہ جدائی کا درد نہ دیتا۔

پنجۂ مہر کو بھی خونِ شفق میں ہر روز　　　غوطے کیا کیا ہے تیرا دستِ حنائی دیتا

سورج جب طلوع ہوتا ہے تو کبھی نیچے اور کبھی اُوپر ہوتے دِکھائی دیتا ہے اور نیچے اُوپر ہونے کو شاعر نے غوطے دینے سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے محبوب تمھارے مہندی لگے ہاتھ کی کیا بات ہے۔ سورج کو بھی اس پر رشک آتا ہے کہ وہ بھی طلوع ہوتے اس مہندی والے پانو پر نظر پڑتے ہی رشک سے شفق میں کیسے کیسے غوطے کھاتا ہے۔ شاعر نے صنعتِ حسن تعلیل سے کام لیا ہے کہ سورج تو ویسے ہی اُوپر نیچے ہوتے دِکھائی دیتا ہے لیکن شاعر نے دُوسرا شاعرانہ سبب بتایا ہے۔

روشِ اشک ِگرا دیں گے نظر سے اِک دن　　　　ہے ان آنکھوں سے یہی مجھ کو بجھائی دیتا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا تکبر اور ہماری انکساری رنگ ضرور دِکھائے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمیں آنسو کی طرح اپنی نظروں سے ِگرا دیں گے۔ ہمیں ذلیل کر دیں گے۔ کم از کم اُن کی آنکھوں سے یہی سوجھ رہا ہے۔ یہی دِکھائی دے رہا ہے۔

میں ہوں وہ صید کہ پھر دام میں پھنستا جا کر　　　　گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا

عشق کا معاملہ بڑا عجیب ہوتا ہے۔ اِس کی قید بھی نہ صرف گوارا ہوتی ہے بلکہ از حد مسرت افزا ہوتی ہے۔ لہذا شاعر کہتا ہے کہ معشوق نے مجھے اپنی زلفوں میں گرفتار کیا ہے۔ مگر میں وہ شکار ہوں کہ اگر وہ مجھے رہا بھی کر دے تو میں پھر جا کر اُس کے جال میں پھنس جاتا۔

منھ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے　　　　گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

شاعر اِنسان کی ہوس اور لالچ کی حد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حرص و ہوس کے غلاموں کی اِنتہا مت پوچھ۔ یہ اِس قدر لالچی ہیں کہ اگر خدا انھیں ساری خدائی دے دیتا تب بھی ان کے لالچ کی حد ختم نہیں ہوتی۔ اِن کی تسلی نہیں ہوتی اور اپنی زبان سے بس نہیں کہتے۔ یہ نہ کہتے کہ تم نے بہت دے دیا ہے۔ ہماری تشفی ہوگئی ہے۔ اب بس کر دے۔ گویا بہت ناشکرے ہیں۔

دیکھ گر دیکھنا ہے ذوقؔ کہ وہ پردہ نشیں　　　　دیدۂ روزن دل سے ہے دِکھائی دیتا

اے ذوقؔ اگر اُس پردہ نشین کو دیکھنا چاہتا ہے، اگر اُس کا نظارہ کرنا چاہتا ہے تو پھر دیکھ کہ وہ دِل کے روزن سے یعنی دِل کی آنکھ سے صاف دِکھائی دیتا ہے۔ گویا اُس کا نظارہ کرنے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ تو دِل میں مکیں ہے۔ بہ قول شاعر ؎

دِل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

9.9 غزل نمبر6

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہوا کسیر بن جاتا
اگر پارہ کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کی
تری زُلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دے کر
جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

جگر دل دونوں ہیں پہلو میں زخمی اس نے کیا جانے
اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

9.9.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی
اکسیر	وہ دوا جس کے کھانے سے انسان کبھی بیمار نہ ہو۔
تفنگ	بندوق
قلقل مینا	مینا کے ہنسنے کی آواز، صراحی سے شراب انڈیلنے کی قلقل کی آواز

9.9.2 غزل(6) کی تشریح

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا　　　جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے ظالم کسی بے کس یعنی محتاج کو اگر جان سے مار دیا تو کون سا اچھا کام کر دیا کہ وہ تو آپ ہی مر رہا ہوتا ہے۔ جو خود مر رہا ہو اُس کو اگر مارا تو کیا مارا۔ کسی تگڑے سے ٹکراتے، اُس کو مارتے تو کوئی بات ہوتی۔

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا　　　اگر پارہ کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

کہ اے کیمیا گر خود کو مارتے، اپنی حرص کو مارتے کہ اُس کے ختم ہونے سے تم اکسیر کی طرح انمول ہو جاتے۔ تم نے پارے کو مار کر کون سا تیر مارا ہے۔

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کی　　　تری زُلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

کہ اِس دِل نے تم سے عشق کرنے کی غلطی کی تھی۔ یہ ایسی خطا تھی جس کے لیے جو سزا دی جاتی کم تھی۔ اِس کو اِس قدر پیٹا جاتا کہ دوبارہ ایسی غلطی نہ کرتا۔ لہذا اے محبوب تیری زُلفوں نے اِس کے اُلٹے ہاتھ باندھ کر مارا بھی تو کیا مارا ہے۔

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دے کر　　　　جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

کہ محبوب اپنے وعدے کا سچا نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ قول دے کر یعنی زبان دے کر مُکر جاتا ہے۔ اِس لیے اُس نے وعدہ کر کے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا بھی تو کون سی بات ہے۔

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے　　　　الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

کہ اُس قاتل معشوق کے پاس بظاہر تو کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی بندوق تھی اور نہ تیر و تبر۔ تو پھر اے خدا اُس نے میرے دِل پر آخر تاک کر یعنی نشانہ باندھ کر کیا مارا ہے کہ یہ بے جان ہو گیا ہے۔

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قُلقلِ مینا　　　　کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

کہ خوشی کے ساتھ غم توام ہے۔ ہنسنے کے ساتھ ساتھ رونا بھی پڑتا ہے اور ٹھیک اُسی طرح جس طرح صراحی قہقہے کی آواز میں رو رو کر پیالہ بھر دیتی ہے۔ اس لیے اگر کسی بے خبر نے قہقہہ مارا ہے تو کیا مارا کہ اُسے معلوم نہیں ہے کہ قہقہے کے ساتھ رونا بھی پڑ سکتا ہے۔

جگر دل دونوں ہیں پہلو میں زخمی اس نے کیا جانے　　　　اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

کہ میرے سینے میں دِل اور جگر دونوں زخمی ہو گئے ہیں خدا جانے محبوب نے جگر پر کس کا وار کیا ہے اور دِل پر کیا مارا ہے جو دونوں زخمی ہو گئے ہیں۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں　　　　اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

شاعر کہتا ہے کہ شیطان نے خدا کے حکم پر محض ایک سجدہ آدم کو نہیں کیا تھا اور وہ مارا گیا یعنی فرشتوں کی صف سے نکال باہر کر دیا گیا۔ اگر اُس نے لاکھوں برس سجدے کیے بھی تو کیا کِیا۔

دلِ بد خواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بد بیں میں　　　　فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

کہ اے ذوقؔ اگر آہ کا تیر مارنا ہی تھا تو اِس بُرا چاہنے والے دِل پر مارتے کہ اِسے سبق حاصل ہوتا۔ یا پھر بُرا دیکھنے والی آنکھ پر مارتے کہ یہ بُرا دیکھنے سے باز آتی۔ فلک پر آہوں کا تیر مارا بھی تو کیا مارا۔ اُس سے کیا حاصل ہوا۔

9.10 غزل نمبر 7

ہنگامہ گرمِ ہستیِ ناپائیدار کا	چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
میں جو شہید ہوں لبِ خندانِ یار کا	کیا کیا چراغ ہنستا ہے میرے مزار کا
ہو رازِ دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا	پردہ جو درمیان نہ ہو دل کے غبار کا
پوچھے ہے کیا حلاوتِ تلخابہ سرشک	شربت ہے باغِ خلد بریں کے انار کا
پہنچے گا تیرے پاس کبوتر سے پیشتر	مکتوبِ شوق اُڑ کے ترے بیقرار کا
ہے عین وصل میں بھی مری آنکھ سوئے در	لپکا جو پڑ گیا ہے مجھے اِنتظار کا
بجھنے کے دل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی	ہوگا درخت گور پہ میرے چنار کا
اُس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق	گویا کہ اِک ستارہ ہے صبحِ بہار کا
اے ذوقؔ گر ہیں ہوش تو دُنیا سے دُور بھاگ	اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

9.10.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
چشمک	آنکھ لڑانا، آنکھ مچولی، آنکھ کا اشارہ، پلکوں کی جھپک، کنکھی ،نظر بازی، عینک، چشمہ		
حلاوت	مٹھاس، شیرینی، ذوق، کیف، لطف، سکھ، چین، آرام		
تلخابہ	کڑوا یا کھاری پانی، آبِ تلخ		

9.10.2 غزل(7) کی تشریح

ہنگامہ گرم ہستیِ ناپائیدار کا　　　چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

یہ زندگی کہ جوخود ناپائیدار ہے کیسے کیسے ہنگامے گرم رکھتی ہے۔ کیسا کیسا شوروغل مچائے رکھتی ہے۔ اِس کی اپنی ہستی کا یہ عالم ہے کہ ایک لمحے بھر کی فرصت ہے۔ اِس کی ہستی بجلی کی چشمک کی طرح ہے۔ ایک لمحے میں آنکھوں کو چکا چوند کر کے ختم ہوجاتی ہے یا پھر شرار کا تبسم ہے کہ چنگاری اُٹھتی ہے اور نیچے آتے آتے بجھ جاتی ہے۔

میں جو شہید ہوں لبِ خندانِ یار کا　　　کیا کیا چراغ ہنستا ہے میرے مزار کا

کہ میں محبوب کے مسکراتے ہونٹوں کا شہید کِیا ہوا ہوں، قتل کِیا ہوا ہوں۔ لہذا میرے مزار کا چراغ بھی کیسے کیسے مجھ پر ہنس رہا ہے۔ چراغ کی لو سے چنگاریوں کے نکلنے کو چراغ کا ہنسنا کہتے ہیں۔

ہو رازِ دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا　　　پردہ جو درمیان نہ ہو دل کے غبار کا

شاعر کہتا ہے کہ اگر رنج اور میل کا پردہ درمیان میں نہ ہو تو پھر ایک دوست کے دِل کا راز دُوسرے دوست سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ یعنی اگر دِل میں میل نہ ہو تو پھر دوست سچے ہمراز ہوتے ہیں۔

پوچھے ہے کیا حلاوتِ تلخابہ سرشک　　　شربت ہے باغِ خلد بریں کے انار کا

کہ پشیمانی کے آنسو کی کڑواہٹ میں کتنی مٹھاس ہے، مت پوچھو۔ یہ اِس قدر شیریں اور میٹھے ہوتے ہیں کہ باغِ بہشت کے انار کا شربت ہوتا ہے۔

پہنچے گا تیرے پاس کبوتر سے پیشتر　　　مکتوبِ شوق اُڑ کے ترے بیقرار کا

پُرانے زمانے میں کبوتر سے قاصد کا کام لیتے تھے۔ وہ اُڑ کر بہت جلد خط پہنچا دیتے تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب یہ تیرے بے قرار عاشق کا اشتیاق نامہ ہے یہ اُڑ کر تیرے پاس پہنچ جائے گا اور کبوتر سے پہلے پہنچے گا۔

ہے عین وصل میں بھی مری آنکھ سوئے در　　　لپکا جو پڑ گیا ہے مجھے اِنتظار کا

کہتا ہے کہ میری آنکھ اِنتظارِ یار میں ہر وقت دروازے کی طرف لگی رہتی تھی۔ اِس طرح دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کا اِسے چسکا پڑ گیا اور ایسا چسکا پڑ گیا کہ عین ملاقات کے وقت اُسی جانب دیکھتی رہی۔

اے ذوقؔ گر ہیں ہوش تو دُنیا سے دُور بھاگ اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

یہ دُنیا ایک مے کدے کی مانند ہے۔ اِس میں ہوش کا قائم رہنا بہت مشکل ہے۔ اِس دُنیاداری کے نشے میں آدمی مدہوش رہتا ہے۔ اب شاعر کہتا ہے کہ اے ذوقؔ اگر کچھ ہوش باقی ہے تو اِس دُنیا سے دُور بھاگ لے کہ اِس میکدے میں ہوشمند آدمی کا کیا کام ہوسکتا ہے۔

9.11 غزل نمبر 8

شکر پردے ہی میں اُس بت کو حیا نے رکھا ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا
رہا پامال رہِ عشق کی تربت کا نشاں اُس نے تعویذ جو نقش کف پا نے رکھا
تلخ کامی کا رہا بعدِ فنا بھی یہ اثر استخواں کو مرے منھ پر نہ ہما نے رکھا
آشیاں باغ میں ڈھونڈا جو قفس سے جا کر ایک تنکا بھی نہ تھا بادِ صبا نے رکھا
دل جو دیوانہ نہ تھا میرا تو پھر کیوں اُس کو پابہ زنجیر تری زلف و دتا نے رکھا
آنکھیں دیدارطلب، گور سے آئی ہیں نکل دستہ نرگس کا نہیں میرے سرہانے رکھا
ناتواں ہیں نہ تن زار میرا دیکھ سکا خوب دھوکے میں اُسے تارِ قبا نے رکھا
کیا تماشا ہے کہ دیوانہ بنا کر اپنا نام مجنوں مرا اُس ہوش رُبا نے رکھا
شربتِ مرگ سے محروم نہ تھا کبھی خضر لیک ناکام اُسے آبِ بقا نے رکھا
نہ گیا مر کے بھی اُس مصحفِ رخسار کا شوق کہ رہا گور پہ قرآن سرہانے رکھا

9.11.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
تربت	مزار، قبر، مٹی، خاک، مقبرہ	ہما	پرندے کا نام

9.11.2 غزل (8) کی تشریح

شکر پردے ہی میں اُس بت کو حیا نے رکھا — ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

خدا کا شُکر ہے کہ محبوب شرم و حیا کے سبب سے پردے سے باہر نہیں آیا۔ وہ پردے میں ہی رہا۔ ورنہ اُسے دیکھنے کے بعد کس کا ایمان سلامت رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اچھا ہوا کہ وہ پردے میں رہا اور خدا نے ہمارا ایمان بچا لیا۔

تلخ کامی کا رہا بعدِ فنا بھی یہ اثر — استخواں کو مرے منھ پر نہ ہما نے رکھا

میری ناکامی و نامُرادی جو زندگی بھر میرے ساتھ رہی، میرے مرنے کے بعد بھی مجھ پر اُس کا اثر برابر بنا رہا۔ اور اس قدر اثر رہا کہ کبھی میری قبر پر بھی ''ہما'' نے سایہ نہیں کیا۔ ''ہما'' ایک پرندہ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جس کے سر سے گزر جائے اُس کا مقدر جاگ اُٹھتا ہے اور وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ خود ہڈی کھاتا ہے۔

دل جو دیوانہ نہ تھا میرا تو پھر کیوں اُس کو — پابہ زنجیر تری زلف و دتا نے رکھا

اگر میرا دِل دیوانہ نہیں تھا، تم پر عاشق نہیں تھا تو پھر کیوں تیری دُہری زلف نے پابہ زنجیر کر رکھا ہے۔ تمھاری زلفوں نے اس کو کیوں جکڑ رکھا ہے۔ مُراد یہ کہ عاشق ہی کو معشوق قید کرتا ہے۔

کیا تماشا ہے کہ دیوانہ بنا کر اپنا — نام مجنوں مرا اُس ہوش رُبا نے رکھا

کہ عجب تماشا ہے کہ مجھے خود اپنا دیوانہ بنایا اور پھر کہتا پھرتا ہے کہ یہ مجنوں ہے، پاگل ہے۔

نہ گیا مر کے بھی اُس مصحفِ رخسار کا شوق — کہ رہا گور پہ قرآن سرہا نے رکھا

کہ جیتے جی تو ہم محبوب کے رُخساروں کا نظارہ کرتے رہے۔ لیکن مرنے کے بعد بھی یہ شوق گیا نہیں اور نتیجتاً قبر میں میرے سرہانے قرآن پاک رکھا ہے۔ چونکہ مصحف قرآن مجید کو کہتے ہیں اور مجازاً معشوق مُراد لیتے ہیں۔ لہٰذا شاعر نے رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔

9.12 غزل نمبر 9

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا	پر ذکر ہمارا نہیں آتا، نہیں آتا
جینا ہمیں اصلاً نظر اپنا نہیں آتا	گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا
کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میری طرف سے	جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا
کس دم نہیں ہوتا قلق ہجر ہے مجھ کو	کس وقت مرا منھ کو کلیجا نہیں آتا
ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہائیں	شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
آتا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت	پھر دیکھیئے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا
ساتھ اُن کے ہیں ہم سائے کی مانند وہ لیکن	اس پر بھی خفا ہیں کہ لِپٹنا نہیں آتا
دل مانگنا مُفت اور یہ پھر اُس پہ تقاضا	کچھ فرض تو بندے پہ تمہارا نہیں آتا
جاتی رہی زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے	افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا
آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے	جب تک اُسے غُصہ نہیں آتا، نہیں آتا
قسمت سے ہی لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ	سب فن میں ہوں میں طاق، مجھے کیا نہیں آتا

9.12.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی	مشکل الفاظ	معنی
اصلاً	اصل میں، دراصل	قلق	رنج، دکھ، افسوس، الم، اندوہ، فکر

9.12.2 غزل(9) کی تشریح

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا — پر ذکر ہمارا نہیں آتا، نہیں آتا

کہ اے محبوب تمھاری محفل میں کس کا ذکر نہیں ہوتا۔ ہر کسی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ ہمارا کبھی ذکر نہیں ہوتا۔

جینا ہمیں اصلاً نظر اپنا نہیں آتا — گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

کہ محبوب کی جدائی میں ہم تڑپ رہے ہیں۔ حالت خراب ہوگئی ہے اور آج بھی وہ رشکِ مسیحا میرا محبوب کہ جس کا دیدار زندگی کی علامت ہے اگر نہیں آتا ہے تو پھر ہمیں کسی طرح بھی اپنا بچنا نظر نہیں آرہا ہے۔ گویا اگر وہ نہیں آتا ہے تو پھر ہماری موت لازم ہے۔

کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میری طرف سے — جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

کہ خدا جانے میرے محبوب کو میرے جانب ایسا کیا وہم ہوگیا ہے کہ وہ کبھی تنہا مِلتا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خواب میں بھی وہ تنہا نظر نہیں آتا۔ ہمیشہ دُوسروں کے ساتھ ہی نظر آتا ہے۔

کس دم نہیں ہوتا قلق ہجر ہے مجھ کو — کس وقت مرا منھ کو کلیجا نہیں آتا

کہ وہ کون سا وقت ہے کہ جب مجھے ہجر کی بے قراری نہیں ہوتی اور وہ کون سا لمحہ ہے جب اس بے قراری کے سبب سے میرا کلیجہ مُنہ کو نہیں آتا ہے۔ یعنی دِل گھبراتا نہیں ہے۔

ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہائیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

کہ ہم تو روتے نہیں ہیں۔ ضبط وصبر کیے رہتے ہیں۔ لیکن اگر رونے پہ آجائیں تو پھر ہم کم نہیں روتے۔ یعنی شبنم کی طرح آنسو نہیں بہاتے بلکہ اتنا روتے ہیں کہ دریا بہا دیتے ہیں۔ سب کچھ نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ غالبؔ کا شعر ہے۔

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

آتا ہے تو آ جا کہ کوئی دم کی ہے فرصت　　　پھر دیکھیئے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

اے محبوب اگر تو آنا چاہے تو اب بھی کچھ بگڑا نہیں ہے کہ ابھی کچھ پلوں کی زندگی باقی ہے۔ پھر کیا معلوم ہے کہ سانس آتی بھی ہے کہ نہیں۔

آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے　　　جب تک اُسے غُصہ نہیں آتا، نہیں آتا

کہ محبوب کو اکثر غُصّہ نہیں آتا۔ گویا ٹھنڈے مزاج کا ہے۔ لیکن جب اُسے ایک بار غُصّہ آ جائے تو پھر اُترتا نہیں ہے۔ اور جب تک نہیں اُترتا کہ جب تک کوئی جان سے نہ چلا جائے۔ یعنی جب آتا ہے تو کسی کی جان لے کر ہی جاتا ہے۔

قسمت سے ہی لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ　　　سب فن میں ہوں میں طاق، مجھے کیا نہیں آتا

اے ذوقؔ میں قسمت ہی کا مارا ہوا ہوں کہ کسی فن میں بھی نام نہیں کر سکا۔ ورنہ ہر فن میں میں تاک ہوں۔ وہ کون سا فن ہے جو مجھے نہیں آتا۔

9.13 غزل نمبر 10

ہفتا د و د و فر یق حسد کے عد د سے ہیں	اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں
مر دا ر ہیں و ہ طا ئر سد ر ہ ہی کیوں نہ ہو	تیر نِگاہِ یار کی جو دُور زد سے ہیں
خو ر شید وا ر د یکھتے ہیں سب کو ا یک آ نکھ	روشن ضمیر ملتے ہر ایک نیک و بد سے ہیں
چشم ثمر ہے سر و سے ہیں اُن کو جو بیو قو ف	رکھتے اُمیدِ دوستی اُس سرو قد سے ہیں
د شنا م د و کہ بو سہ خو شی پر ہے آ پ کی	رکھتے فقیر کام نہیں ردوکد سے ہیں
و ہ ا یک دم کہ جس میں میسر ہو وصلِ یا ر	بہتر سمجھتے ہم اُسے عمرِ ابد سے ہیں
ہر چند نا تو ا ں ہیں مگر ر کھتے ہیں دِل قو ی	ہم عشق کی کمک سے جنوں کی مدد سے ہیں
جا اِن لبا سیوں کے نہ ظا ہر ی لبا س پر	عاری عبائے ہوش و قبا ے خرد سے ہیں
دِل کے و ر ق پہ ثبت ہیں صد مہر دا غِ عشق	ہم کرتے ذوقِ عشق کا دعویٰ سند سے ہیں

9.13.1 فرہنگ

مشکل الفاظ	معنی
سرو	لمبا پیڑ، لمبا پیڑ جس سے محبوب کو تشبیہ دی جاتی ہے

9.13.2 غزل (10) کی تشریح

ہفتا د و د و فر یق حسد کے عد د سے ہیں ۔۔۔ اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

کہ مسلمانوں میں یہ جو ۷۲ فرقے ہیں یہ دراصل ابجدی حساب سے حسد کے شمار سے ہیں اور اپنا یہ مسلک ہے

کہ ہم حسد نہیں کرتے، حسد سے باہر ہیں۔

خورشید وار دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ　　　روشن ضمیر ملتے ہر ایک نیک و بد سے ہیں

کہ جو روشن ضمیر اِنسان ہیں وہ چھوٹے بڑے، اپنے پرائے سب کو سورج کی مانند کہ جو ہر کسی کو روشنی و گرمی دیتا ہے ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ سب سے یکساں سلوک رکھتے ہیں۔ کسی سے تمیز نہیں کرتے۔

دشنام دو کہ بوسہ خوشی پر ہے آپ کی　　　رکھتے فقیر کام نہیں ردوکد سے ہیں

کہ اے محبوب چاہے آپ ہمیں گالیاں دیں یا بوسہ دیں، آپ کی خوشی ہے۔ ہمیں ہر دو صورت منظور ہے۔ ہم فقیر ردوکد سے مطلب نہیں رکھتے۔ یعنی تردید میں یقین نہیں رکھتے۔

ہر چند ناتواں ہیں مگر رکھتے ہیں دِل قوی　　　ہم عشق کی کمک سے جنوں کی مدد سے ہیں

کہ ہم اگر چہ ناتواں ہیں، کمزور ہیں لیکن ہم عاشق، عشق کی مدد اور دیوانگی کی مدد سے خاصا مضبوط دِل رکھتے ہیں۔ کہ آپ کے ظلم وستم سے یہ گھبراتا نہیں ہے۔

جا اِن لباسیوں کے نہ ظاہری لباس پر　　　عاری عبائے ہوش و قبائے خرد سے ہیں

کہ اِن ہوشیار لوگوں کے ظاہری لباس کو مت دیکھو۔ ہر چند بظاہر یہ لوگ لباس میں ہیں لیکن دراصل یہ لوگ ہوش وفہم کے لباس سے عاری ہیں۔

دِل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہر داغِ عشق　　　ہم کرتے ذوقؔ عشق کا دعویٰ سند سے ہیں

عشق میں اِس دِل نے سخت صدمات اُٹھائے ہیں۔ بے شمار داغ رنج والم کے اِس دِل پر ثبت ہیں۔ داغ کی گویا سینکڑوں مہریں لگی ہیں۔ لہذا اے ذوقؔ دِل کی کتاب پر سینکڑوں عشق کے داغوں کی مہریں ہونے کے سبب ہی ہم عشق کا دعوی کرتے ہیں۔ ہمارا دعوی بے سند نہیں ہے۔

9.14 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ ذوقؔ کے حالات زندگی اوران کی شخصیت کے اہم پہلو پر بحث کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ ذوقؔ کی غزل گوئی قلم بند کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ ذوقؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 4:۔ ذوقؔ کی شاعری کی زبان وبیان پراظہار خیال کیجئے۔

سوال نمبر 5:۔ نصاب میں شامل ذوقؔ کے غزلیات کی تشریح معہ حوالہ کیجئے۔

9.15 کتابیات

1 بیسویں صدی کی اردو شاعری، انتخاب وترتیب، از اوصاف احمد، مطبع، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی۔

2 خاقانی ہند ذوقؔ دہلوی (معتبر کوائف اور مستند کلام)، از کالی داس گپتا رضا، مطبع، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

3 ہندوستانی ادب کے معمار، ذوق دہلوی، از تنویر احمد علوی، مطبع، ساہتیہ اکادمی، دہلی۔

اکائی نمبر 10

غزل کی تعریف اور اس کی ہیئتی وموضوعاتی خصوصیات

ساخت:

10.1 سبق کا تعارف

10.2 سبق کا ہدف

10.3 غزل کی تعریف اور اس کی ہیئتی وموضوعاتی خصوصیات

10.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

10.5 امدادی کتب

10.1 سبق کا تعارف

اصناف شاعری کی بات کی جائے تو غزل ایک حسین وجمیل اور نازک سی صنف سخن ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ عروس شاعری(bridge of poetry) ہے جو بام عروج پر ہے اور اہمیت کی حامل ہے۔ یہ صنف ہر دور، ہر طبقہ، ہر تہذیب اور ہر زمانہ میں ہر عام وخاص کی مقبول ترین صنف رہی۔ ماضی میں بھی ہر ایک کے دل کو لبھارہی تھی اور عصر حاضر میں بھی ہر کوئی اس کا دیوانہ ہے اور یقیناً اس کا سحر کل بھی کم نہ ہوگا۔ اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غزل اس صنف کو کہیں گے جس میں حسن وعشق یا محبّ ومحبوب سے متعلق مضامین شامل ہوں۔ یعنی ہجووصال کا تذکرہ، سوز وغم کا ذکر، وصل معشوق کی لذت اور اسطرح کی دیگر کیفیات عشق واردات محبت شامل ہوں یعنی آنکھوں سے آنکھیں چار ہونا اور ہوش وحواس گم ہونا اور ہمیشہ حسن یار میں کھوئے رہنا وغیرہ۔

10.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں اردو غزل کی تعریف اور غزل کی ہئیتی پہچان کو شامل کیا گیا۔غزل چونکہ اردو شاعری کی آبرو کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے طلبا کو غزل کا مفہوم اور غزل کی اہمیت وافادیت سے روشناس کروانا ضرری خیال کیا جاتا ہے۔

10.3 غزل کی تعریف اوراس کی ہئیتی وموضوعاتی خصوصیات

غزل ہر عہد میں اُردو شاعری کی مقبول ترین صنفِ سخن رہی ہے جس کے گیسوئے پیچیدہ کو سجانے اور سنوارنے میں ہر عہد کے تقریباً تمام ہی شعراء نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دِکھائے ہیں۔اسی لیے اُردو شاعری کا بیشتر سرمایہ صنفِ غزل پر مُشتمل ہے اوراس لحاظ سے اُردو تنقید کا بھی بیشتر حِصّہ غزل کی تنقید کے لیے مختص ہے،تذکروں کی تنقید سے لے کر جدید تنقید تک بیشتر شعری معیارات کے پسِ پشت صنفِ غزل کی کارفرمائی نمایاں ہے۔

غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں ’’باتیں عشق کی،عورتوں کی اور صحبت‘ جوانی کی کرنا.کاتنا‘ رسی بٹنا‘ ریسمان‘‘ (کریم اللغات)۔اس بات پر تمام ناقدوں کا اِتفاق ہے کہ غزل کی اِبتداء عربی قصائد کی تشبیب سے ہوئی جسے فارسی گو شعراء نے قصائد سے الگ کر کے ایک جُداگانہ صنف کی حیثیت سے قائم کیا۔اِبتدائی عربی ادب میں قصیدہ ایک طویل نظم کو کہا جاتا تھا جس میں ہر طرح کے موضوعات مثلاً مدح،ہجو،فخر،رثا اور غزل کے مضامین وغیرہ نظم کیے جاتے تھے۔عربی شاعری میں حسن وعشق اور جنسی معاملات اِبتداء ہی سے موضوعِ سخن رہے ہیں اس لیے عربی میں غزلیہ قصیدہ کی اصطلاح بھی رائج تھی۔اس لحاظ سے عربی قصائد کی تشبیب اور غزل کے موضوعات وہئیت کافی حد تک مماثل ہیں۔غزل اور تشبیب دونوں میں عشق ومحبت،شراب وشباب،کیف ومستی اور نغمہ وبہار کے مضامین اساسی حیثیت کے حامل رہے ہیں۔دونوں کی خارجی ہئیت میں مطلع،مقطع،ردیف وقوافی اور بحور واوزان وغیرہ اجزائے ترکیبی شامل ہیں لیکن اس اشتراک کے باوجود دونوں میں نمایاں فرق یہ ہے کہ تشبیب کے تمام اشعار میں ایک مسلسل مضمون بیان کیا جاتا ہے جب کہ غزل کا ہر شعر ایک علحیدہ اور خود مکتفی مضمون کا حامل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ قصیدے میں گریز کا شعر

غزل میں مقطع کی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔اس مقام پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کوئی بھی خود مکتفی صنفِ سخن محض خارجی ہئیت اور موضوعات کی تخصیص سے ہی منفرد نہیں ہوتی بلکہ داخلی ہئیت یعنی کیفیت،مزاج،لب ولہجہ،رویے اور رجحان وغیرہ اوصاف کے اتصال سے ایک صنفِ سخن قائم ہوتی ہے۔اس لحاظ سے تشبیب قصائد اور غزل اپنی تمام مماثلتوں کے باوجود بھی ایک دُوسرے سے منفرد اور ممتاز ہے۔

خارجی ہئیت کے اعتبار سے غزل کے پانچ اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں:

ا۔ مطلع	۲۔ قافیہ	۳۔ ردیف
۴ مقطع	۵۔ موزونیت	

یعنی خارجی ہئیت کے لحاظ سے غزل کی تعریف یہ ہے کہ غزل ایسا موزوں کلام ہے جس کے تمام اشعار خود مکتفی ہوتے ہیں۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بعد کے اشعار کے دُوسرے مصرعے لازمی طور پر ہم قافیہ اور ضمنی طور پر ہم ردیف ہوتے ہیں۔غزل کے آخری شعر میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے۔غزل کے لیے قافیہ اور وزن لازمی شے ہیں البتہ ردیف کی حیثیت اضافی ہے جس کی عدم موجودگی غزل کی ہئیت پر تو اثر انداز نہیں ہوتی لیکن قافیے میں زور پیدا کرنے اور شعر کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے ردیف کی حیثیت مسلم ہے۔اسی طرح غزل کی ضمنی تکمیلیت اور اس کی کامیابی کافی حد تک غزل کی زمین پر منحصر ہوتی ہے۔اس لیے غزل کی افہام وتفہیم اور اس کے جمالیاتی تفاعل کو سمجھنے کے لیے غزل کے اجزائے ترکیبی اور اس کے متعلقات کی تفہیم اشد ضروری ہے۔

موزونیت:

غزل کا پہلا لازمی عنصر موزونیت ہے۔منطقیوں سے قطع نظر عربی، فارسی اور اُردو شعریات میں شاعری کے لیے موزونیت اوّلین اور لازمی شرط ہے اس لیے کسی غیر موزوں غزل کا تصور ناممکن ہے۔موزونیت آوازوں کے ایک خاص تناسب اور توازن کو کہا جاتا ہے جس سے شعر ایسے ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتا ہے جن کی ادائیگی میں آواز ایک خوب صورت تسلسل اور ترنم سے متصف ہو جاتی ہے یعنی الفاظ موسیقی کی روح سے ہم آہنگ ہو کر نثری اسلوب سے ممتاز ہو

جاتے ہیں۔عروضی اوزان و بحور اسی موزونیت کی بازیافت کے لیے تکنیکی اجزاء میں جو روایت اور ثقافت کے دائرے میں محصور ہوتے ہیں اس لیے ایک زبان کے عروضی پیمانے دُوسری زبان کے عروضی پیمانوں سے مختلف ہوتے ہیں لیکن اِن تمام اِختلافات کے باوجود بُنیادی طور پر ہر زبان کا عروضی نظام ریاضیاتی اصولوں کا حامل ہوتا ہے۔جیسے:

عربی بحر رجز:۔فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن ایک شعر میں آٹھ بار

اس بحر ہر ساکن حرف کے بعد ایک متحرک حرف کے اِلتزام سے موزونیت پیدا ہو رہی ہے۔عربی و فارسی کا عروضی نظام ساکن اور متحرک حروف کی خاص تکرار پر منحصر ہے۔ جب کہ ہندی عروضی کا نظام ماترائی ہے۔جس میں حروف علت کے اِلتزام سے موزونیت کو متشکل کیا جاتا ہے۔اُردو غزل کا عروضی نظام عربی اور بڑی حد تک فارسی عروض پر منحصر ہے لیکن کہیں کہیں ہندی اوزان کو بھی برتا گیا ہے جیسے بحرِ میرؔ۔

حالیؔ اور مسعود حسین رضوی ادیبؔ شاعری کے لیے وزن کی لازمی شرط کے قائل نہیں ہیں لیکن شعر میں تیزی و تندی اور اس کے اثر میں شدت پیدا کرنے نیز کامل شعر کے لیے وزن کو لازم قرار دیتے ہیں۔غزل میں موزونیت جذبات واحساسات کو اس طرح متحرک کرتی ہے کہ قاری و سامع شعر کے معنی کی تفہیم کے بجائے شعر میں ڈوب جاتا ہے۔اس لیے غزل کی بے پناہ مقبولیت میں دُوسرے امور کے ساتھ موزونیت کو بھی بڑا دخل ہے۔

قافیہ:

قافیہ شعر میں صوتی خوش آہنگی پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔قافیے کی تعریف یہ ہے کہ ردیف سے قبل شعر یا مصرع کے آخر میں آنے والا وہ لفظ جو دُوسرے مصرع یا شعر میں واقع ہم مقام لفظ سے صوتی مشابہت رکھتا ہے اور معنوی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔دو الفاظ میں قافیے کی بُنیاد ایسے مُشترک حرف پر ہوتی جس کو لفظ سے منہا کرنے پر یا تو لفظ بے معنی ہو جاتا ہے یا اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔علم قافیہ کی اصطلاح میں ایسے حرف کو حرفِ روی کہا جاتا ہے۔ جیسے محبت کا قافیہ عبادت۔اِن دونوں الفاظ کے آخر میں واقع حرف ت حرفِ روی ہے جس کو ساقط کر دینے سے محبّ اور عباد الفاظ بچتے ہیں جو بے معنی ہیں یا اپنے پہلے معنی کے حامل نہیں ہیں۔

حُسن کی اشاعت کا آخری جریدہ ہے　　　داغؔ کی غزل ہے وہ ذوقؔ کا قصیدہ ہے

(اظہرؔ عنایتی)

اس مطلع میں جریدہ اور قصیدہ قوافی میں جن میں حرفِ روی دال اور ہ ہے۔ مطلع کے ساتھ غزل کے ہر شعر کے دُوسرے مصرع میں قافیہ کا ہونا ضروری ہے۔

ردیف:

ردیف غزل کے لیے لازمی تو نہیں ہے لیکن غزل کو مزید آراستہ و پیراستہ کرنے اور اس کے حسن میں اِضافہ کرنے میں ردیف نمایاں رکردار ادا کرتی ہے۔ ردیف کی تعریف یہ ہے کہ شعر میں قافیے کے بعد آنے والے ایک یا زائد ایسے متعینہ الفاظ ردیف کہلاتے ہیں جو مطلع سے لے کر مقطع تک شعر کے ہر دُوسرے مصرع میں اپنے متعینہ مقام پر مُسلسل دہرائے جاتے ہیں۔ جیسے مذکورہ بالا شعر میں جریدہ اور قصیدہ قوافی کے بعد لفظ ''ہے'' دونوں مصرعوں میں اپنے متعینہ مقام پر مکرر واقع ہوا ہے۔

غزل میں ردیف وقوافی کی پابندی غزل کو موسیقی کے پُر لطف اور مترنم زیر و بم سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ غزل میں شعر کے آخر میں قافیہ کا اِلتزام، موسیقی میں طبلے کی تھاپ کے مماثل ہوتا ہے جو موسیقی کی تاثیر کی اِنتہا ہوتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غزل میں ردیف وقوافی کی پابندی غزل کو غیر فطری اور تنگ داماں بنا دیتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کے شاعر کو بعض خوب صورت مضامین صرف اس لیے چھوڑنا پڑتے ہیں کہ موجودہ قوافی میں ان کا ادا ہو پانا ممکن نہیں ہوتا ہے یا قافیے کی مجبوری کی وجہ سے ان میں تکلف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے دُوسری اصناف کے مقابلے میں غزل کا شاعر ردیف وقوافی کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ وہ اسی مضمون کو شعر کا قالب عطا کرتا ہے جو ردیف وقوافی سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے غزل کا فن ایک مشکل ترین فن ہے جس کی ایجاز بیانی اور ردیف قوافی کی بندشوں پر عبور حاصل کرنا قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

زمینِ غزل:

شاعر کی طبعیت کی روانی اور غزل کی کامیابی کا بڑی حد تک دار و مدار غزل کی زمین پر ہوتا ہے۔ غزل کی زمین شاعر کے مزاج اور اس کے باطنی آہنگ کی عکاس ہوتی ہے جس سے نہ صرف غزل میں ایک صوتی تکرار کا لطف پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ غزل کی ایسی ساخت ہوتی ہے جس میں خود مکتفی اور جداگانہ مضامین کسی ایک رشتے سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ غزل کی زمین قافیہ، ردیف اور بحر تین عناصر کے اتصال سے صورت پذیر ہوتی ہے لیکن زمینِ غزل کی تعریف میں ردیف اور بحر لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور قافیہ کی حیثیت اضافی ہوتی ہے۔ یعنی ردیف اور بحر کی یکسانیت کے ساتھ دو مختلف القوافی غزلیں ہم زمین غزلیں کہلاتی ہیں۔

مطلع:

غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعہ ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں مطلع کہلاتا ہے۔ مطلع سے غزل کا آغاز ہوتا ہے جو ایک طرف سامع و قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تو دُوسری طرف وزن، ردیف اور قافیے کے تعین میں رہنمائی کرتا ہے اور پوری غزل کے خارجی اور داخلی رنگ و آہنگ کو نمایاں کرتا ہے۔ غزل میں مطلع جس قدر اہم ہوتا ہے اس کا کہنا اسی قدر دُشوار گذار ہے جس کی کامیابی شاعر کے قُدرت کلام پر دلالت کرتی ہے۔ اس لیے اکثر غزلوں کا مطلع برائے مطلع یا بھرتی کا ہوتا ہے جس کے پیشِ نظر بعض ناقدین غزل کے لیے مطلع کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ غزل میں ایک یا ایک سے زائد مطلع ہو سکتے ہیں جنھیں بالترتیب مطلعِ اوّل، مطلعِ ثانی، مطلعِ ثالث کہا جاتا ہے۔ شعرائے متقدمین اپنی غزلوں میں صرف ایک مطلع کا التزام کرتے تھے لیکن بعد کے شعراء نے اس تحدید سے انحراف کرتے ہوئے دس دس، پندرہ پندرہ مطلعوں کی غزلیں کہی ہیں تاکہ ان کے اُستادانہ جوہر زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو سکیں۔

حسنِ مطلع یا زیب مطلع:

کسی غزل میں ایک مطلع یا کئی مطلعوں کے بعد آنے والے پہلے شعر کو حسنِ مطلع یا زیب مطلع کہا جاتا ہے۔

حسنِ مطلع، مطلع کی موسیقی و ترنم اور اس کے مزاج کی توسیع کرتا ہے جس کی بُنیاد پر غزل کے اگلے اشعار کا آہنگ متعین ہوتا ہے اس لیے حسنِ مطلع کے لیے انتہائی چابک دستی اور قدرتِ کلام کی ضرورت ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے اس کا پہلا مصرعہ ہم قافیہ اور ہم ردیف نہ ہونے کی وجہ سے اپنے آہنگ میں آزاد ہوتا ہے۔ اس آزاد آہنگ کو مطلع سے ہم آہنگ کرنا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔

مقطع:

غزل کے اس آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں جس میں شاعر اپنے تخلص کو لاتا ہے۔ تخلص شاعر کی شعری شخصیت کا غماز ہوتا ہے جو ایک شخص کے دو کرداروں کو نمایاں کرتا ہے۔ پہلا کردار جغرافیائی اور تاریخی حدود کا حامل ہوتا ہے جب کہ دُوسرا کردار عمومی اور مثالی نوعیت کا ہوتا ہے۔ شاعر کا اصل نام ارضیت کے دائرے میں محدود ہوتا ہے جب کہ اس کا تخلص ایک مثالی اور تہذیب یافتہ شخص کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے غزل کا مقطع دراصل عربی قصائد کے گریز کے مترادف ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر شعراء تشبیب کے اختتام پر گریز کے شعر میں اپنا یا ممدوح کا نام استعمال کرتے تھے اس لیے جب غزل قصیدہ سے علحیدہ ہوئی تو تخلص اور تسمیہ کی رسم بھی ایک لازمی عنصر کے طور پر اس کے ساتھ آئی۔ تخلص کا استعمال عموماً غزل کے آخری شعر یعنی مقطع میں ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات تخلص کا استعمال غزل کے درمیانی شعر یا مطلع میں بھی کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر غزل کو زیادہ شخصی بنانے کی کوشش کرتا ہے یا کسی خاص فضا اور ماحول کو اُجاگر کرنا چاہتا ہے۔ جس غزل میں درمیان کے کسی شعر میں تخلص کا استعمال ہوتا ہے عموماً اس کے بعد کے اشعار قطعہ بند ہوتے ہیں لیکن یہ اصول کلی نہیں۔ مقطع میں عموماً خودی، نرگسیت اور شاعرانہ تعلّی کے مضامین جیسے حریفوں پر چوٹ، ناقدری زمانہ، فن کارانہ زعم وغیرہ مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔

قطعہ بند اشعار:

غزل کا ہر شعر مضمون اور معنی کے لحاظ سے آزاد اور خود مکتفی ہوتا ہے لیکن بعض اوقات کسی مضمون یا خیال کے دو مصرعوں میں ادا نہ ہونے کی صورت میں ایک سے زائد اشعار کا سہارا لینا پڑتا ہے جن میں ایک مُسلسل مضمون بیان کیا

جاتا ہے۔غزل کے ایسے اشعار کو قطعہ بند کہا جاتا ہے۔قطعہ بند اشعار عموماً غزل کے آخر میں واقع ہوتے ہیں اور شاعر تحریری شکل میں ''ق'' لکھ کر ان اشعار کے تسلسل کی طرف اِشارہ کرتا ہے۔

غزل کے اشعار کی تعداد:

شعرائے متقدمین نے ایک غزل میں کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ پچیس، بعض کے نزدیک سترہ اشعار کی تعداد متعین کی تھی۔لیکن بعد کے شعراء نے اس اصول کی پابندی نہیں کی اور تین اشعار کی غزل سے لے کر سو اشعار کی غزلیں کہیں۔

دوغزلہ، سہ غزلہ، چوغزلہ:

شعرائے متقدمین نے ایک غزل کے لیے زیادہ سے زیادہ سترہ اشعار کی تعداد متعین کی تھی۔اس زمین میں مزید اشعار کہنے کے لیے ازسرِ نو مطلع سے دُوسری غزل کہی جاتی تھی۔اسی غزل کے سترہ اشعار کے بعد پھر مطلع سے آغاز کر کے تیسری غزل کہی جاتی تھی جنھیں بالترتیب دوغزلہ، سہ غزلہ اور چوغزلہ وغیرہ کہا جاتا تھا۔

شعرائے متقدمین کے نزدیک غزل کے اشعار کی تعداد جفت کی بجائے طاق ہونا چاہئے۔اشعار کی جفت تعداد عیب خیال کی جاتی تھی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کے بُنیادی مفروضیات میں ایک مفروضہ یہ ہے کہ شاعر کا محبوب یکتا اور یگانہ ہوتا ہے جس کا دُنیا میں کوئی ثانی نہیں۔دُوسرے یہ کہ محبوب تک رسائی اور عشق میں کامیابی ایک ناممکن امر ہے اس لیے ہجر و مفارقت کے مضامین غزل کے لیے لازمی ہیں۔اس لیے اِن تمام تصورات کی واضح مناسبت طاق تعداد سے ہے۔غزل کے ان اصولوں کو بعد کے شعراء نے روا نہیں رکھا۔

غیر مسلسل اور مسلسل غزل:

غیر مسلسل غزل ایسی غزل کو کہا جاتا ہے جس کا ہر شعر مختلف اور جُداگانہ مفہوم کا حامل ہوتا ہے۔یعنی ہر شعر خود ایک مستقل اِکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔اس لیے مغربی تنقید کے زیرِ اثر غزل کی ریزہ خیالی اور اشعار کی بے ربطگی کو ہدفِ تنقید بنایا گیا جس کے نتیجے میں مسلسل غزل کی اصطلاح وجود میں آئی۔مسلسل غزل ایسی غزل کو کہا جاتا ہے جس کے تمام

اشعار سلسلہ بہ سلسلہ ایک دُوسرے سے مربُوط ہوتے ہیں لیکن قطع کی طرح ایک شعر دُوسرے شعر پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ اپنی اپنی جگہ مکمل اِکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلسل غزل اور نظم میں باریک فرق یہ ہے کہ نظم میں موضوع یا خیال کی مرکزیت کے ساتھ خیال کا آغاز و اِرتقا ہوتا ہے اور ایک شعر یا مصرع دُوسرے شعر یا مصرع سے منطقی ارتباط قائم کرتے ہوئے پوری نظم کو ایک اِکائی کی شکل دیتا ہے جب کہ مسلسل غزل میں ہر شعر اپنے آپ میں پورے معنی کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر تمام اشعار ایک ہی تاثر کو قائم کرتے ہیں۔

اُردو شاعری میں مسلسل غزل کا رواج زمانۂ قدیم سے ہے خصوصاً شعرائے دکن نے مسلسل غزل کی ہئیت کو زیادہ رواج دیا اس لیے بعض ناقدین نے قلی قطب شاہ کی بعض غزلوں پر عنوان قائم کر کے انہیں نظم کی شکل میں اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن زمانۂ قدیم میں مسلسل غزل کی اصطلاح رائج نہیں تھی۔ یہ اصطلاح مغربی تنقید کے زیرِ سایہ جدید دور میں پروان چڑھی۔

غزل کی داخلی ہئیت:

غزل ایجاز و اختصار کا فن ہے۔ اس لیے غزل میں معنی کا تفاعل علامتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ کسی خاص واقعے یا حادثے کی تخصیص اور اس کی تاریخی ارضیت کو ختم کر کے غزل اسے عمومی اور آفاقی جہت عطا کرتی ہے۔ غزل میں جو کچھ بیان ہوتا ہے اس کا تعلق اِنسان کی بُنیادی جبلتوں سے ہوتا ہے اس لیے غزل کا کِردار ایک مثالی اور عمومی کِردار ہوتا ہے جو کسی پورے معاشرے یا عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ غزل کا شاعر مخصوص واقعات سے متاثر ہو کر اور ان تجربات کو اپنی شخصیت سے آمیز کر کے ایسی شکل عطا کرتا ہے جس سے اس واقعہ اور تجربے کی نوعیت یکسر بدل جاتی ہے اور ایک مخصوص تجربہ یا واقعہ ایک عمومی تجربے یا واقعے کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے جس سے سامع کی شخصیت بُنیادی جبلتوں کی رنگ آمیزی سے یک لخت ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور اسے غزل میں بیان ہونے والا تجربہ، اپنا تجربہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ غزل کی رمزیت اور اس کی اشاراتی زبان آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے میں ایک نمایاں کِردار ادا کرتی ہے۔ غزل کا شاعر اپنے دُشمن کا نام اُجاگر کرنے کے بجائے اس کی کِردار کی خصوصیات کے لحاظ سے اسے قاتل یا معشوق کا پیرایہ بیان عطا

کر کے ایک مثالی کِردار کے طور پر پیش کرتا ہے۔غزل کے اندازِ بیان میں دھیمہ پن' عاجزی' انکساری اور سُلگنے والی کیفیت ہوتی ہے جس کا روایتی پیرایہ بیان حسن وعشق سے مختص ہے جسے تغزل کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔تغزل ،غزل کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کے سہارے شعر میں اثر آفرینی اور سُلگنے جیسی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔تغزل کے لیے حسن وعشق کا پیرایہ بیان لازمی ہے جس میں محبوب سے گفتگو یا اس کے بیان میں جذبات واحساسات کی شدت کے باوجود بیان میں آہستگی اور کم مائیگی کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔اشتعال انگیزی اور غیر معتدل رویے سے پرہیز کیا جاتا ہے۔غزل میں حسن وعشق کا یہ پیرایۂ بیان پوری طرح علامتی ہوتا ہے جس سے دُوسرے معنی بھی مُراد لیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے غزل کے لیے الفاظ کے اِنتخاب اور ان کے استعمال میں حد درجہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک طرف ترنم اور نغمگی کو اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں تو دُوسری طرف شدید جذبات واحساسات کی معتدل عکاسی اور معنی آفرینی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔غزل کے لیے سادگی اور صفائی لازمی اوصاف ہیں اس لیے غریب اور اجنبی الفاظ کے مقابلے میں مانوس، شیریں اور غیر پیچیدہ الفاظ کا استعمال غزل کے لیے ناگزیر ہے۔

غزل کے موضوعات:

اُردو غزل، فارسی غزل کی زائیدہ ہے اور فارسی غزل عربی قصیدے سے برآمد ہوئی ہے۔اس لیے فارسی غزل اور اِبتدائی اُردو غزل کے موضوعات، عربی قصائد کے بعض موضوعات کا عکس ہیں۔عربی قصیدہ شعرائے عرب کے شاعرانہ تخیلی تجربات کا ایک مظہر ہے۔جس میں ہر طرح کے مضامین وموضوعات کو بیان کیا جاتا تھا۔خلفاء وسلاطین کی مہمات وفتوحات کے بیان سے لے کر اونٹنیوں کی جفاکشی، گھوڑوں کی رفاقت و وفاداری، جوانی کے عیش، بچّوں کی جُدائی اور انھیں دیکھنے کی آرزو وغیرہ تمام فطری جذبات عربی قصائد کے موضوع تھے۔ایران میں قصیدے کے موضوعات میں تراش خراش کر کے اسے مدح اور ہجو تک محدود کر دیا گیا اور قصائد کی تشبیب سے صنفِ غزل کی ایجاد کی گئی جس میں عشق ومحبت، رندی وسرمستی، شراب وکباب، گُلشن وگُلزار، رعنائی بہار، جورِ گردوں، جفائے زمانہ اور محرومی و ناداری وغیرہ کے مضامین بیان کیے جاتے تھے جو بعد میں اُردو و فارسی غزل کا طرۂ اِمتیاز بن گئے۔جدید مطالعے کی رو

سے غزل کسی خاص موضوع کی پابند نہیں ہوتی ہے بلکہ حیات و کائنات کے تمام موضوعات غزل کا حِصّہ ہوتے ہیں لیکن عام طور پر غزل کی صنفی شناخت عشق و محبت کے ان موضوعات سے قائم ہے جن کی بُنیاد جنسی جذبے پر قائم ہوتی ہے جسے عشقِ مجازی کہا جاتا ہے۔ عشقِ مجازی کے دو خاص موضوع ہیں (ا) ہجر (۲) وصال۔ ہجر سے متعلق موضوعات میں دل کی بیتابی، بیماری، تمناؤں کا ہجوم، غم و الم کی فراوانی، بے چارگی و بے بسی، جنون، دیوانگی، موت اور نزع وغیرہ کے مضامین شامل ہوتے ہیں جب کہ وصل سے متعلق موضوعات میں کامرانی و سرمستی، نشاط وصل، فرقت کے دِنوں کی یاد، شکوے شکایتیں، عدو کی بُرائی، اپنی تعریف اور فرقت کے اندیشے وغیرہ مضامین شامل ہوتے ہیں۔ عمومی طور پر غزل کا خاص موضوع ہجر و فراق ہے۔ حالانکہ غزل میں محبوب کے حسن و جمال کی تعریف اور اس کے جسمانی اوصاف کو بھی بیان کیا جاتا ہے لیکن اِن تمام موضوعات کو مستحسن نہیں سمجھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ غزل ایک داخلی صنف ہے جس میں اوصاف کے بیان کے بجائے کیفیت کا بیان لازم ہے۔

عشقِ مجازی کے ساتھ عشقِ حقیقی بھی غزل کا موضوع ہے۔ شبلی کے خیال کے مطابق عشقیہ شاعری کے لیے عشقِ حقیقی لازم ہے۔ شبلی نعمانی کے مطابق فارسی کی عشقیہ شاعری کا مرتبہ اسی لیے بُلند ہے کہ اس زبان میں تصوف کے مضامین کو بدرجہ اتم برتا گیا ہے۔ چوں کہ دُوسری زبانوں میں متصوفانہ خیالات کا رواج نہیں ہے اسی لیے اِن زبانوں میں بُلند پایہ عشقیہ خیالات مُشکل سے ملتے ہیں۔ تصوف نے وسیع المشربی، اتحاد و مذہب اور رواداری وغیرہ امور پر از حد زور دیا جس کے لیے عشق و محبت کے جذبات کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ تصوف کے زیرِ اثر جن عام تصورات کی غزل میں عکاسی کی گئی ان کے مطابق وجودِ حقیقی صرف ایک ہے اور تمام مظاہر کائنات اس کا عکس ہیں جس کے دیدار کے لیے عقل کے بجائے وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے وجود حقیقی تک رسائی صرف عشق کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی کا ذریعہ ہے اس لیے سالک عشقِ مجازی میں توکل، صبر و رضا، ترکِ ہوس اور نفس کشی کے عناصر شامل کر کے زندگی کے لیے ہجر و فراق اور درد و غم کو لازمی قرار دیتے ہیں اور موت کی آغوش میں وصالِ حقیقی کی تمنا کرتے ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک کامل اِنسان بننے کے لیے صفائی قلب اور خلوصِ نیت بہت ضروری ہے۔ عشق کی اعلیٰ و ارفع

منزل وہ ہے جب اِنسان کے ظاہر و باطن ایک ہو جاتے ہیں۔ انہی تصورات کے نتیجے میں برابری، رواداری، وسیع المشربی، دُوسروں کے مذاہب کا احترام اور اخلاقیات سے متعلق موضوعات غزل کا حِصّہ بنے۔ تصوف سے متعلق دو نظریے وحدت الوجود اور وحدت الشہود اُردو غزل کے اہم موضوعات ہیں۔ تصوف کی اِبتدا مذہبی پابندیوں اور ظاہری رسوم کی پابندیوں کے ردِعمل کے طور پر ہوئی تھی۔ اسی لیے ظاہری اعمال کے مقابلے میں یہاں باطنی کیفیت پر زور دیا جاتا ہے۔ قول وفعل کے تضاد کو بُنیاد بنا کر غزل نے اِبتدا سے ہی اہلِ ظاہر کو طنز وتعریض کا نشانہ بنایا اور نمائشی عبادت کے مقابلے میں صفائی قلب پر زور دیا اور خلوصِ نیت، عاجزی وانکساری، صبر وضبط، ظاہر و باطن کی یکسانیت، رواداری، وسیع المشربی غزل کے خاص موضوعات بن کر اُبھرے۔ آزادہ روی غزل کا خاص موضوع ہے۔ اس کے تحت دیر وحرم، کعبہ و کلیسا، کفر وایمان وغیرہ کے اِمتیازات کو ختم کر کے اِنسانی مساوات کو اوّلیت دی گئی ہے۔ دیر وحرم کی بے جا قیود سے آزادی کی خواہش کے نتیجے میں محفلِ منداں کی اہمیت اُجاگر ہوئی جہاں اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کا تصور مفقود ہوتا ہے۔ زاہد ومحتسب اور ناصح اس لیے طنز کا نشانہ بنے کہ ان کے قول وفعل میں تضاد ہوتا ہے۔ اسی طرح شیخ کے عمامے کو شیخ کی فضلیت اور ظاہری نمود ونمائش کا ذریعہ قرار دے کر اس پر لعن طعن کی گئی۔ غزل نے سماجی طور پر تسلیم شدہ تمام خیالات اور طور طریقوں کے خلاف آزادانہ طور پر اِظہارِ خیال کیا مثلاً خدا، جنت، جہنم اور تقدیر سے متعلق رائج تصورات کو موضوعِ سخن بنا کر ان کو طنز وتعریض کا نشانہ بنایا گیا۔

ان تمام امور کے باوجود غزل کے لیے موضوعات کی تخصیص ناممکن ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ غزل نے ہمیشہ بدلتے ہوئے تصورات وحالات کی ترجمانی کی ہے جب ماورائی اور مابعدالطبقاتی مسائل کی اہمیت زندگی میں زیادہ تھی تو اس وقت غزل نے تصوف کو ایک مستقل موضوع قرار دیا لیکن جب سیاسی اور سماجی منظر نامہ تبدیل ہوا تو غزل میں بھی اِن موضوعات کی عکاسی کی گئی۔ حالؔی کے بعد کے شعراء کے یہاں اپنے ماحول سے رشتے استوار کرنے کا رُجحان بڑھا جس کے نتیجے میں عام سیاسی وسماجی موضوعات غزل کے دائرے میں شامل ہو گئے۔ اس لیے غزل میں موضوع سے زیادہ اہمیت اس کی زبان اور اس کے مزاج کو حاصل ہے۔

10.4 نمونہ برائے امتحانی سولات

سوال نمبر 1:۔ اردوغزل سے کیا مراد ہے؟ کی وضاحت کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ اردوغزل کی تعریف اورغزل کی ہیتی پہچان کروایئے۔

سوال نمبر 3:۔ اردوغزل کی اہمیت وافادیت کاتعین پیش کیجئے۔

سوال نمبر 4:۔ اردوغزل کی مقبولیت کے اسباب بیان کیجئے۔

سوال نمبر 5:۔ اردوغزل کے اجزائے ترکیبی مثالوں کے ساتھ بیان کیجئے۔

10.5 امدادی کتب

1 اردوغزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، از گوپی چند نارنگ، مطبع، این سی پی یوایل، نئی دہلی۔

2 غزل اور مطالعہ غزل، از ڈاکٹر عبادت بریلوی، مطبع، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

3 آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، از بشیر بدر، مطبع، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

4 اردوغزل میں علامت نگاری، از انیس اشفاق، مطبع، اتر پردیش اردو اکادمی۔

اکائی نمبر 11

اُردو غزل پر فارسی غزلیہ روایت کے اثرات

ساخت:

11.1 سبق کا تعارف

11.2 سبق کا ہدف

11.3 اُردو غزل پر فارسی غزلیہ روایت کے اثرات

11.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

11.5 امدادی کتب

11.1 سبق کا تعارف

غزل عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی قصیدے کا پہلا حصہ تشبیب فارسی میں قصیدے سے الگ ہو کر غزل کے روپ میں جلوہ نما ہوا۔ یہ بات تو واضح ہے کہ غزل پہلے عربی زبان سے فارسی میں آئی اس کے بعد فارسی سے اردو تک کا سفر اس نے امیر خسرو کے عہد میں ہی کر لیا۔ پھر اردو میں غزل واحد صنفِ سخن ہے جو غمِ جاناں، غمِ ذات اور غمِ دوراں کو تخلیقی اظہار دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ ایک ایرانی صنف ہے جو فارسی کے ساتھ ہندوستان میں رونما ہوئی اور اب اردو میں مقبول ہے۔

11.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں اردوغزل پر فارسی شاعری کے پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔غزل چونکہ عرب سے ایران اور ایران سے اردو میں داخل ہوئی ہے ۔اس ارتقائی سفر میں کیا لین دین رہا اور کیا اثرات قبول کئے کا جائزہ طالب علم کے لئے پیش کیا گیا ہے۔تا کہ غزل کی اصل اور ہیتی پہچان میں آسانی ہو۔

11.3 اُردوغزل پر فارسی غزلیہ روایت کے اثرات

کوئی بھی ادبی روایت مخصوص اسالیبِ بیان یعنی تشبیہات واستعارات اور رموز علائم وغیرہ کے ساتھ مخصوص ذوقِ سلیم ،تنقیدی تصورات ،اخلاقی وعمرانی اقدار پر مبنی ہوتی ہے اور کسی ایک تہذیب وثقافت میں مسلّم اور قائم ودائم ہوتی ہے۔جس کے مفروضیات سے متعلق فن کار سے کوئی سند نہیں مانگی جاتی۔کوئی بھی قائم شدہ روایت گذشتہ تجربات کا ایک عظیم ورثہ ہوتی ہے جس کی بُنیاد پر ہی نئے تجربات قابلِ قبول اور مسلّم ہوتے ہیں۔روایت ایک ایسی ساخت اور ایک ایسا سانچہ ہے جو نئے تجربات سے متاثر بھی ہوتی ہے اور انھیں متاثر بھی کرتی ہے۔جس روایت میں نئے تجربات کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی یا اس کی یہ صلاحیت ختم کر دی جاتی ہے، وہ روایت مُردہ ہو جاتی ہے۔اس کے برعکس جو تجربہ اور نیاپن روایت سے یکسر جدا ہوتا ہے وہ کبھی باوقار اور قائم نہیں ہوسکتا۔

فارسی غزل کی روایت

ایران میں فارسی شاعری کا باقاعدہ آغاز ۹ ویں صدی عیسوی میں ہوا۔رودکی فارسی زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے جس کے دیوان میں دُوسری اصناف کے ساتھ صنفِ غزل بھی شامل ہے۔غالبًا رودکی کے ہی زمانے میں ایرانیوں نے غزل کو عربی قصیدے سے منقطع کر کے ایک علحیدہ اور منفرد صنفِ سخن کی حیثیت سے قائم کیا۔لیکن ۱۱ ویں صدی عیسوی تک غزل پر قصیدے کے اثرات گہرے رہے جس کی وجہ یہ تھی کہ غزل کی بُنیادیں تو عشق ومحبت کے

جذبات پر قائم ہے اوران جذبات کی آفاقیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ۱۱ ویں صدی عیسوی تک ایران میں جنگی جذبات پر زیادہ زور رہا ہے۔اس لیے ان بُنیادی جذبات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔۱۱ ویں صدی عیسوی کے بعد جب ایران میں تصوف کا دور دورہ شروع ہوا تو غزل کے عروج وارتقا کا بھی پہلا نوروز ہوا۔حکیم سنائیؔ اور واحد مراغیؔ نے غزل کو جذبات سے لبریز کیا اوراس میں نزاکت، صفائی و روانی کی خصوصیات پیدا کیں۔خواجہ فریدالدین عطارؔ،مولانا رومؔ،عراقیؔ، شیخ سعدیؔ،خسروؔ، سلمانؔ اورخواجہ حافظؔ شیرازی وغیرہ نے فارسی غزل کی روایت کو مستحکم کیا اور فارسی طرز و اسلوب میں لطافت وشیرینی پیدا کی۔اس زمانے تک غزل میں عشق ومحبت، فلسفہ وتصوف، اخلاق وموعظمت، پند ونصاح وغیرہ مضامین پوری طرح داخل ہو چکے تھے۔فارسی شاعری میں امرد پرستی کا رجحان بھی ابتدا ہی سے تھا۔ بڑے بڑے شرع کے پابند بادشاہ بھی اعلانیہ حسن پرستی کرتے تھے اوران کے قصائد میں ان کے معشوقوں کا نام بھی بڑے تزک واحتشام سے لیا جاتا تھا۔اس عہد میں حسین ترک غلام ہر جگہ مہیا تھے اور ہر جگہ شریکِ صحبت تھے۔اسی لیے اکثر ایرانی شعراء ان غلاموں پر فِدا تھے اوران کی شان میں قصیدہ خواں یا غزل خواں تھے۔فوجی ترک اکثر حسین ہوتے تھے جو شعراء کی رغبت اور کشش کا باعث تھے اس لیے ان ترکوں سے عشق کے نتیجے میں عشقیہ غزل میں جنگ وجدل اور سامانِ حرب وضرب اور ظلم وستم سے متعلق لفظیات اور اصطلاحات شامل ہوئیں۔تاتاریوں کی تباہی و بربادی کے بعد ایران میں تصوف نے زیادہ زور پکڑا اور سپہ گری کا جوش کم ہوا۔اس عہد میں غزل میں سوز وگداز اور درد وغم کی فضا قائم ہوئی۔غزل میں صوفیانہ خیالات کی عکاسی رموز وعلائم کے ذریعے شروع ہوئی۔یعنی شاہد وے اور معشوق عام طور پر ذاتِ حقیقی اوراس کی تجلیات کی علامت کے طور پر استعمال ہوئیں لیکن یہ مفہوم صاحبِ قلب ونظر کے لیے ہے اس لیے اس عہد میں عشقِ حقیقی نے عشقِ مجازی کو بھی فروغ دیا۔حافظؔ کے زمانے تک غزل عشق ومحبت اور محبوب کے حسن و جمال کی تعریف سے مختص تھی۔حافظؔ نے غزل میں رندانہ،صوفیانہ،فلسفیانہ اوراخلاقی مضامین کو شامل کر کے غزل کو وسعت دی اور غزل کو معراج تک پہنچایا اس لیے فارسی میں صرف ایک ہی رنگ دِکھائی دینے لگا۔حافظؔ کی غزل کا اسلوب اتنا لطیف اور سادہ تھا کہ اس کا تتبع بہت مشکل تھا اس لیے ایران میں فارسی غزل کا ارتقاء سو سال تک رُک گیا جو فغانیؔ کے نئے اسلوب اور نئی طرزِ ادا

کے بعد دوبارہ شروع ہوا۔اس عہد میں امن وامان اورخوشحالی زیادہ تھی۔امیر تیموریہ شعروشاعری کے قدردان تھے جس کی وجہ سے اکثر فارسی شعراء نے
ہندوستان کی طرف رُخ کیا۔اس زمانے میں فلسفے کو لازمی طور پر نصابِ تعلیم میں شامل کیا گیا۔ان تمام وجوہات کی بِنا پر فارسی غزل کے مختلف اسالیبِ بیان وجود میں آئے اور کلاسیکل شعری روایت کو اس استحکام حاصل ہوا۔

ا۔عاشقانہ غزل	۲۔فلسفیانہ غزل
۳۔متصوفانہ غزل	۴۔اخلاقی غزل
۵۔زندانہ غزل (خمریات)	

اسلُوبِ بیان کے اجزاء:

ا۔سوز وگداز	۲۔رنگینی ورعنائی
۳۔خیال بندی	۴۔معاملہ بندی
۵۔سادگی	۶۔نفاست
۷۔شیرینی	۸۔پیچیدہ بیانی
۹۔مضمون آفرینی	۱۰۔تمثیل
اا۔نازک خیالی	۱۲۔سراپا نگاری

فارسی غزل کے مذکورہ تمام اسالیب کسی ایک غزل میں بھی موجود ہیں اور ہر اسلُوب سے متعلق پُوری غزل بھی ہے۔

فارسی غزل کی عشقیہ رسومات اور عاشق ومعشوق کا تصور:

فارسی غزل میں محبوب ومعشوق مذکر ہوتا ہے جو اکثر اوقات بازاری اور متبذل حرکات وسکنات کا مالک ہوتا ہے۔ایرانی محبوب ارزاں اور آسانی سے ہاتھ آنے والا ہے جس کے تعلقات سینکڑوں لوگوں سے ہوتے ہیں۔وہ آج

ایک کے ساتھ ہے تو کل دُوسرے کے ساتھ۔اس کے چاروں طرف عاشقوں کا جمگھٹ رہتا ہے۔وہ کبھی ایک سے آنکھ لڑاتا ہے اور کبھی دُوسرے سے۔کسی سے اِشارے کرتا ہے اور کسی کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔وہ کبھی روٹھ جاتا ہے اور کبھی راضی ہو جاتا ہے۔عاشق اس کی ایک ایک ادا پر جان دے دیتے ہیں اور ہر عاشق یہ سمجھتا ہے کہ محبوب کا اصلی التفات اس کی ہی طرف ہے۔غرض کہ ایرانی محبوب دھوکے باز، چالباز اور فتنہ پرداز ہے۔جب کہ ایران کا عاشق سیدھا سادھا اور صاف دل ہے۔وہ خود کو انتہائی ذلیل وخوار قرار دیتا ہے اور خود کو معشوق کی گلی کا کتا سمجھتا ہے۔ایران کا عاشق ہر طرح کی ذلت اور بے قدری پر فخر محسوس کرتا ہے اور اسی ذلت کو بلندیٔ عشق اور کمالِ عشق سمجھتا ہے۔ایرانی معشوق صورت کے لحاظ کائنات کا حسین ترین مظہر ہے لیکن سیرت کے اعتبار سے بدترین ہے۔اس میں دُنیا کے تمام عیوب پائے جاتے ہیں۔ایرانی معشوق جھوٹا، بدعہد، ظالم، سفاک، حیلہ گر، حیلہ ساز، کینہ پرور، نہایت احمق ہے جو ہر شخص کی بات آسانی سے مان لیتا ہے اور ہر ایک کے قابو میں آجاتا ہے۔ان تمام امور کے باوجود ایرانی معشوق نادان اور بت تصویر نہیں ہے۔وہ اداشناس اور سخن فہم ہے لیکن عاشق کو جلانے اور تڑپانے کے لیے تجاہلِ عارفانہ اس کا شیوہ ہے۔اسی لیے ایرانی غزل میں عشق کی تیزی وتندی کے ساتھ جذبات میں وسعت ہے۔اداشناس معشوق کی وجہ سے شوق، آرزو اور تمنا کے اظہار کے نئے نئے طریقے سامنے آتے ہیں۔

فارسی غزل کے اہم موضوعات:

محبوب کی کج ادائی:۔ عاشق لامتناہی خواہشوں کا بندہ ہوتا ہے جس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ معشوق اس کی ہر خواہش اور آرزو برلائے۔چوں کہ ہر خواہش کا پورا ہونا ممکن نہیں اس لیے عاشقوں کو معشوق بدفہم اور بدعہد نظر آتے ہیں اور معشوق بے انتہا عشق اور شوق کی وجہ سے مغرور ہو جاتا ہے۔معشوق عاشق کے منانے کو نہیں سنتا، وہ عاشق سے فقط ظاہری رسم وراہ رکھتا ہے، کبھی کبھار کوئی لطف کی بات کہتا ہے تو اتنی غلط باتوں کے درمیان کہ اس کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے۔معشوق عاشق کا حال رقیب سے دریافت کرتا ہے اور اپنی بزم میں عاشق کو دیکھ کر یہ سوال کرتا ہے کہ آپ یہاں

کیوں تشریف لائے ہیں۔ عاشق کو اپنی بزم میں بیٹھنے نہیں دیتا۔ رقیب سے ناز و نیاز کی باتیں کرتا ہے اور عاشق کو جلاتا ہے۔ عاشق معشوق کی مجلس میں صبر سے کام لے کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اپنی طرف نظرالتفات نہ پاکر اُٹھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عاشق کے دوست احباب معشوق سے اس کی سفارش کرتے ہیں جس کا اور الٹا اثر ہوتا ہے۔ معشوق اپنے ہم جلیس خوش جمالوں کے ساتھ عاشق پر ہرجائی ہونے کا الزام لگانا چاہتا ہے۔ رقیب عاشق کو پریشان اور تنگ کرتا ہے اور معشوق اُس کی ایک نہیں سنتا۔

محبوب کا ظلم: محبوب عاشق کی تمنا اور آرزو کبھی پوری نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اس کے برخلاف عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس لیے عاشق پر سب سے زیادہ ظلم توڑنے والا شخص اس کا معشوق ہوتا ہے۔ محبوب کا یہ عمل بھی ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا۔ جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ عاشق اس ادا کا عادی ہو گیا ہے تو وہ اس پر لطف وعنایت کرنے لگتا ہے اور ظلم کا نیا طریقہ ایجاد کرتا ہے۔ عاشق جب بھی کوئی راز کی بات معشوق سے پوچھتا ہے تو وہ تمام لوگوں کو سنا کر اس کا جواب دیتا ہے۔

اخفائے حال: عاشق و معشوق دونوں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ محبت کا راز عیاں نہ ہو جائے اس لیے بے تابی دل اور اضطراب کو چھپانا عاشقوں کا فریضہ ہے۔ عاشق اگر معشوق کی مجلس میں بھی جاتا ہے تو اس کی طرف قصداً نظر نہیں اُٹھاتا کہ کہیں محبت کا راز فاش نہ ہو جائے۔

عاشق کی بے چارگی: نوعمر اور کمسن معشوقوں کے سامنے بڑے بڑے علماء وفضلا ناک رگڑتے اور گھٹنے ٹیکتے نظر آتے ہیں اور معشوق کی ہر بات کو من وعن قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

آزارِ عشق سے فرار: عاشق محبوب کے بے انتہا ظلم وستم سے تنگ آ کر یہ خیال کرتا ہے کہ عشق سے باز آئے لیکن دل اسے پھر عشق کی طرف مائل کرتا ہے اس لیے وہ لوگوں کو کاروبارِ عشق سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

ناصح: عاشق کی حالتِ زار دیکھ کر ناصح اسے عشق سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے اور اسے سمجھاتا ہے۔ عاشق کے لیے ناصح بڑا مکروہ اور کریہہ شخص ہوتا ہے لیکن وہ ناصح کی بعض باتوں کو اس لیے سُن لیتا ہے کہ ناصح بار بار اس کے محبوب کا نام لیتا ہے۔

رقیب: رقیب عشق سے نا آشنا اور بوالہوس ہوتا ہے لیکن محبوب اس کو پسند کرتا ہے۔ رقیب کے منھ سے کبھی کبھار کوئی بات عاشقانہ اگر نکل جاتی ہے تو وہ عاشق کی ہی سنی سنائی ہوتی ہے۔

اظہارِ عشق: عاشق معشوق کے سامنے اپنے عشق کا اِظہار نہیں کر پاتا ہے۔ اس کے لیے اِظہارِ عشق اِنتہائی مشکل امر ہے۔ ہر بار سوچتا ہے کہ اب ملے گا تو یہ کہوں گا، وہ کہوں گا لیکن ملاقات کے وقت زبان شل ہو جاتی ہے اور عاشق مجسمِ عشق ہو جاتا ہے جس کو محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

معشوق کو خط لکھنا: معشوق کو خط لکھنے میں عاشق کے دِل میں جو جو خیالات نمو پذیر ہوتے ہیں فارسی غزل میں ان کی پوری عکاسی کی گئی ہے۔

معشوق کا زوال پذیر حسن: معشوق کے زوال پذیر حسن کو دیکھ کر عاشق کو اس بات کا صدمہ ہے کہ معشوق نے خلوت نشین ہو کر اپنا حسن ضائع کر دیا۔ عاشقوں کو عشق پرستی کا موقع نہیں دیا۔ معشوق کو بھی اپنی اس حالت پر افسوس ہے کہ اُس نے چندروزہ حکومت کا فائدہ کیوں نہیں اُٹھایا۔

عاشق اور صبر: عاشق اگر صبر وقناعت سے کام لے تو وہ معشوق کے غرور وتکبر کو پاش پاش کر سکتا ہے لیکن عاشقوں کی قسمت میں صبر وقناعت نہیں ہوتی۔

کم سن معشوق اور آئینِ حسن: خدا نے کم سن حسینوں کو اقلیم حسن کی سلطنت سے نواز دیا ہے جو اپنی کم سنی کی وجہ سے آئینِ حسن سے واقف نہیں اس لیے وہ فرمار وائی حسن کے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا لیکن اقبال حسن بگڑے کاموں کو بنا دیتا ہے۔

معشوق کا کسی اور معشوق پر فریفتہ ہونا: معشوق کسی اور معشوق پر فریفتہ ہو جاتا ہے یعنی معشوق، عاشق بن جاتا ہے۔ اس موقع پر عاشقِ اوّل معشوق کے معشوقوں سے اس کی سفارش کرتا ہے اور اپنے معشوق سے ہمدردی جتاتا ہے۔

عاشق اور موت: عاشق، عشق کے لیے آزار اور رنج ومحن سے گھل گھل کر نحیف وکمزور ہو جاتا ہے۔ اس پر موت کے آثار طاری ہو جاتے ہیں جسے دیکھ کر اس کے عزیز وآقارب چپکے چپکے رونے دھونے لگتے ہیں اور عاشق اور زیادہ اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے۔

واسوخت: معشوق کے غرور وتکبّر کو توڑنے کے لیے کسی اور معشوق سے دِل لگانا اور دُوسرے معشوق کے حسن و جمال کی تعریف پہلے معشوق کے سامنے کرنا تا کہ معشوقِ اصلی راہِ راست پر آ جائے۔

فارسی غزل میں تصورِ عشق:

عشق قلبِ اِنسانی کا نور اور فطری کشش ہے جس سے دِل میں ایک خاص ذوق اور شورش پیدا ہوتی ہے۔ عشق تڑپ، اضطراب اور بے چینی کا باعث ہوتا ہے۔ دولتِ عشق ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی بلکہ منزلِ عشق دُور دراز ہے اور ایک عُمر کی مسافت کے بعد بھی یہ راہ طے نہیں ہوتی جس میں رنج وغم اور اضطراب و بے قراری کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور ہر مرحلہ لطف و انبساط کا باعث ہوتا ہے۔ عاشق کا غم باعثِ مسرت ہوتا ہے۔ عشق کی اِبتدا ہی اِنتہا ہوتی ہے اور اِس کی اِبتدا و اِنتہا دونوں حالتیں ذوق ولطف کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ وہ شراب ہے جو پختہ اور خام دونوں صورتوں میں لطیف ہوتی ہے۔ عشق باعثِ آزار اور باعثِ رنج ومحن ہوتا ہے لیکن عشق کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا خارجی تکالیف سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ اس میں رنج کا رنج نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ رنج ہوتا ہے کہ یہ رنج پہلے کیوں نہیں حاصل ہوا۔ عشق سے اِنسان میں شریفانہ اور اعلیٰ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک عاشق، کینہ اور بغض وعناد سے پاک ہوتا ہے۔ اس کے دِل میں سوز و گداز اور رقت کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ دُشمن سے بھی دُشمنی کا خیال نہیں کرتا۔ عشق اِنسان میں ایثار اور قربانی کی صفات پیدا کرتا ہے۔ عاشق اپنے معشوق کے لیے جان و مال، عزت وآبرو سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ایک سچے عاشق میں جانبازی، جاں نثاری کی صفات ہوتی ہیں۔ عشق اِنسان کو دلیر اور بہادر بناتا ہے۔ عاشق کسی سے بغض وعناد نہیں رکھتا بلکہ تمام لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب لوگ اس کے معشوق کے دوست ہیں۔ عشق اِنسان کو وحدت پرست بناتا ہے۔ ایک سچّا عاشق اپنے معشوق کے سِوا دُنیا و مافیہا سے بے نیاز اور بے خبر ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ عشق اِنسانی نفس کی تمام بُرائیوں کو ختم کر کے اس میں پاکیزگی اور ارفعیت پیدا کرتا ہے اور اِنسان کو اِنسان بناتا ہے۔ تمام اعلیٰ اقدار عشق کے فیض سے ہی قائم ہوتی ہیں۔ اِنسانی کاروبارِ حیات اور نظامِ کائنات کے پسِ پشت عشق کی کارفرمائی ہے۔

اُردو غزل:

اُردو غزل کا آغاز تو ہندی روایت کے زیرِ اثر ہوا۔ ہاشمی، شاہی اور قلی قطب شاہ وغیرہ جنوبی ہند کے شعراء پر واضح طور پر ہندی روایت کے اثرات ہیں لیکن اُردو غزل کا اِرتقا و عروج فارسی روایت کے زیرِ سرپرستی اور زیرِ سایہ ہوا۔ ولی دکنی اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو غزل میں فارسی روایت کے عناصر کو زیادہ قوت اور جوش سے پختہ کیا حالانکہ ولی سے قبل کی غزل میں بھی فارسی روایت کی نشاندہی کی جا سکتی ہے لیکن ولی نے جس شعوری کوشش کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا وہ صرف ولی کا کارنامہ ہے۔ ولی کے کلام سے شُمالی ہند میں ایک اِنقلاب برپا ہو گیا اور فارسی روایت آرزو، میر، مظہر، درد، سودا کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہوئی غالب کے یہاں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچتی ہے۔ اس لحاظ سے اُردو غزل فارسی روایت کا دُوسرا قالب ہے۔ اُردو غزل ہیئت اور موضوع ہر دو اعتبار سے فارسی غزل کی زائدہ ہے۔

تصورِ عشق:

اُردو غزل میں بھی فارسی کے زیرِ اثر عشق، کاروبارِ دُنیا اور کاروبارِ زندگی کا محرک ہے۔ عشق ایک حرکت اور مسلسل جُستجُو ہے جس کا نقطۂ آغاز تو خارجی حسن ہے لیکن اس کی اِنتہا کوئی نہیں۔ عشق تمام رسوم و قیود سے آزاد ہے جو باعثِ تڑپ اور اِضطراب ہے۔ عشق ایک بلائے جاں ہے اور یہ بلائے جاں ہی عالمِ رنگ و بُو کی رونق کا باعث ہے ۔

ہے عشق سے ہی چار طرف بحث و گفتگو
شور اس بلائے جاں کا جہاں میں کہاں نہیں

(میر)

عشق سے طبعیت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد لادوا پایا
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

رونقِ ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز ہے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

(غالبؔ)

تصورِ عاشق: فارسی روایت کے زیرِ اثر اُردوغزل میں بھی عاشق سیدھا سادھا اور معشوق کی گلی کا کتا ہوتا ہے۔اپنی ذلت و خواری عاشق کے لیے باعثِ فخر ہوتی ہے۔دیوانہ، پاگل ہونا عاشق کے لیے باعثِ عزت ہے۔عاشق کی نظر صرف اپنے محبوب پر ہوتی ہے۔اس کے علاوہ وہ دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوتا ہے۔وہ شراب کے اثر سے سرمست اور بے خود ہوتا ہے۔

پہنا جو میں نے جامۂ دیوانگی تو عشق
بولا کہ یہ بدن پہ ترے سج گیا لباس

(مصحفیؔ)

تصورِ معشوق:

فارسی روایت کے زیرِ اثر اُردوغزل میں بھی معشوق مرد ہوتا ہے اور وہ ظالم، کینہ پرور، بدعہد اور تمام برائیوں کا حامل ہوتا ہے۔اُردوغزل کا معشوق بھی اپنے حسنِ ظاہری میں کامل ترین مظہر ہے لیکن باطن میں تمام غیر اخلاقی حرکات اس سے منسوب ہیں۔اُردوغزل کا معشوق بھی فارسی کی طرح ہرجائی، نظر باز اور ایک نظر میں سب کو مطمئن کرنے والا ہے۔اس کے اِردگرد بھی عاشقوں کا جمگھٹ رہتا ہے اور وہ سب کو اپنے ناز و ادا سے گھائل اور مجروح کرتا رہتا ہے۔

وہ قہر ہے آفت ہے مصیبت ہے بلا ہے
دل ہے کہ اُسی دُشمنِ جانی پہ فدا ہے
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
ترے وعدوں پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

رسومیات وموضوعات: اُردوغزل کی عشقیہ رسومات اوراس کے موضوعات بھی بڑی حدتک فارسی غزل سے مستعار ہیں۔عشق و عاشقی کے درمیان عاشق کی قلبی کیفیات اور جذبات و احساسات،معشوق کا طرزِعمل اوررویہ، عاشق کی تہذیبِ عشق، ناصح اوررقیب کی دل آزاریاں،ہجروفراق اوروصل کی کیفیتیں وغیرہ تمام فارسی غزل کا عکس ہیں ۔

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف　　　دل سے شعلہ سے کچھ لپٹتا ہے

(سوداؔ)

ہم طورِعشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن　　　سینہ میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

(میرؔ)

دیکھتا ہوں میں تری بزم میں ہرایک کامُنھ　　　طلب رحم کی نظروں سے گنہگار کی طرح

(سوداؔ)

کیا پوچھتے ہو رعاشق راتوں کو کیا کرے ہے
گاہے بکا کرے ہے، گاہے دعا کرے ہے
سوراخ سینہ میرے رکھ ہاتھ بند مت کر
ان روزنوں سے دل تک کسب ہوا کرے ہے

(میرؔ)

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دُشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

(غالبؔ)

لفظیات وتراکیب: وؔلی کے بعد سے اُردو غزل میں فارسی غزل کا رچاؤ پیدا کرنے اوراس کی لفظیات وآہنگ کی لطافت ونزاکت کو بحسن وخوبی استعمال کرنے پر زیادہ زور دیا گیا۔اُردو غزل گوشعراء نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ اُردو غزل ظاہری رنگ وآہنگ کو فارسی غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ کیا جائے تاکہ اُردو غزل فارسی غزل کا بہتر متبادل ہوسکے۔ چنانچہ اس کوشش میں وؔلی سے لے کر میؔر وغالبؔ اکثر شعراء نے فارسی لفظیات وتراکیب کو اوّلیت دی اور بہت سے فارسی اشعار کا اُردو میں ترجمہ کیا۔اسی طرح اُردو غزل میں بہت جلد کلاسیکی رچاؤ پیدا ہو گیا اور سو سال سے بھی کم عرصے میں اُردو کی مستحکم اور توانا کلاسیکی روایت وجود میں آ گئی۔

مدار صحبت ما ہر حدیث زیر لبی است   کہ اہلِ بزم عوام اندوگفتگو عربی است
(عرفی)

ہر ایک سے کہا نیند میں پر کوئی نہ سمجھا   شاید کہ مرے حال کا قِصّہ عربی ہے
(میرؔ)

دیدہ ام دفترِ پیمان وفا حرف بحرف   نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست
(نظیرؔی)

فہرست میں خوبان وفادار کے پیارے   دیکھا تو کہیں اس میں ترا نام نہ پایا
(قائم)

فارسی تراکیب: اُردو زبان میں فارسی تراکیب کے استعمال سے گہرائی، جامعیت اوراختصار کی خصوصیات پیدا ہوگئیں ہیں۔

قتلِ موعود کی حسرت میں موے اہلِ نیاز   ہمنشیں سیر تو کر ناز کی طغیانی کو
(راسؔخ)

شب کہ برقِ سوزِ دل سے شعلۂ ابر آب تھا   شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا
(غالبؔ)

بحور واوزان: اُردوشاعری میں مستعمل تمام بحوراوراوزان فارسی عروض سے مستعار ہیں۔اُردوغزل میں وہ ہی بحریں اوروزن زیادہ استعمال کیے گئے جوفارسی میں مروج ومستعمل تھے۔اس لحاظ سےاُردوغزل کا خارجی آہنگ بعینہ فارسی غزل کا خارجی آہنگ ہے

طرزِ ادا: اُردوغزل کے اکثر طرزِ ہائے ادا فارسی سے مستعار ہیں۔سادہ بیانی، سہلِ ممتنع، خیال بندی، نازک خیالی، مضمون آفرینی، معاملہ بندی، تمثیل نِگاری وغیرہ خصوصیات فارسی شاعری سے ماخوذ ہیں۔

خیال بندی:

تیری انگلی ہے جوفندوق سی وہ برقِ طور ہے　　　تو اگر ہوتا ید بیضا سے بیعت مانگتا

(ناسخ)

نازک خیالی: شاعری اپنی ہوئی نیرنگئی دانش وری　　　جوسخن ہے سوطلسم راز بطلیموس ہے

(مومن)

مضمون آفرینی:

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ وہ نین ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

(سودا)

معاملہ بندی:

ہزاروں گالیاں وہ دے رہے تھے بے خطا مجھ کو
جو پوچھا بات کیا ہے جل کے بولے بات کیا ہوتی

(محمودرامپوری)

تمثیل نگاری:

پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کہیں مردوں کا منھ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آ ب میں
(ذوقؔ)

بہ حیثیت مجموعی اُردو غزل تمام وکمال فارسی غزلیہ روایت کے تابع اوراس کا عکس ہے۔اُردوغزل نے فارسی روایت کے تحت اپنی کلاسیکی روایت کومضبوط اور مستحکم کیا۔

تصوف:

فارسی غزلیہ روایت کے زیرِ اثر اُردوغزل میں متصوفانہ مضامین کو خاص اہمیت حاصل رہی بلکہ اُردوغزل کا فکری مزاج تمام تر تصوفانہ تصورات سے قائم ہوا۔اُردوغزل میں تصوف کے ان نظریات وخیالات کو زیادہ اہمیت و وقعت حاصل رہی جو فارسی غزل کی روایت میں روحِ رواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس لیے تصوف کا خالص ہندوستانی نظریہ وحدت الشہود کو وحدت الوجود کے مقابلے اُردوغزل میں زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی۔ایرانی روایت کے تحت اُردوغزل میں غم نصیبی،سوز وگداز،رسوائی،لاآبالی پن،اندمشربی،آزادخیالی،وسیع المشربی،خلوصِ دل،رواداری وغیرہ کی اعلیٰ صفات پیدا ہوئیں اوراُردوغزل نے بہت جلد اپنی کلاسیکی روایت کومستحکم کرلیا۔

جگ میں آ کر اِ دھر اُ دھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
ما ہتیو ں کو ر وشن کر تا ہے نو ر تیر ا　　ایمان میں مظاہر، ظاہر ظہور تیرا
(دردؔ)

گو ش شنو ا ہو تو مر ے ر مز کو سمجھے　　حق یہ ہے کہ سازِ حقیقت کی نوا ہوں
(مصحفیؔ)

تھک تھک کے ہر مقام پر دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
(غالبؔ)

طاعت میں تار ہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کے بہشت کو
(غالبؔ)

11.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ اردو غزل کا پس منظر بیان کیجیے۔

سوال نمبر 2:۔ اردو غزل پر فارسی شاعری کے اثرات پر بحث کیجیے۔

سوال نمبر 3:۔ اردو غزل نے ''قصیدے'' کی کوکھ سے جنم لیا، کی وضاحت کیجیے۔

سوال نمبر 4:۔ اردو غزل کے ارتقائی سفر کا ایک تاریخی تعارف پیش کیجیے۔

11.5 امدادی کتب

1 اردو پر فارسی کے لسانی اثرات، از ڈاکٹر عصمت جاوید، مطبع، اسباق پبلیکیشنز، نیتا پارک، ایروڈ پونا۔

2 اردو غزل پر تصوف کے اثرات، از ڈاکٹر محمد اسلام رشیدی، مطبع، گلوبل اردو کمپیوٹر، رام گنج بازار، جے پور۔

3 ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء، از، اقبال حسین، مطبع، بہار اردو اکادمی پٹنہ۔

4 اردو شاعری پر ایک نظر، از کلیم الدین احمد، مطبع، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، بہار۔

اکائی نمبر 12

غزل کا آغاز وارتقاء

ساخت:

12.1 سبق کا تعارف

12.2 سبق کا ہدف

12.3 غزل کا آغاز وارتقاء

12.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

12.5 امدادی کتب

12.1 سبق کا تعارف

اردو میں غزل فارسی ادب سے آئی۔ اب یہ اردو کی سب سے مقبول صنف سخن ہے۔ فارسی کی طرح اردو غزل میں بھی مضامین وموضوعات کی کوئی قید نہیں ہے۔ فلسفیانہ، عاشقانہ، زاہدانہ ہر طرح کے مضامین نظم کئے گئے۔ ہندوستان میں امیر خسروؔ غزل لکھنے اور اسے مقبول بنانے والے اولین جنوب ایشائی شاعروں میں سے ہیں۔ ولی دکنیؔ کو ایک زمانے تک پہلا باقاعدہ شاعر گردانا جاتا رہا لیکن بعد کی تحقیق نے قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا۔

12.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں اردو غزل کا باقاعدہ آغاز وارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے جس کا مقصد طلبا کو اردو غزل کے تاریخی سفر کا سے واقف کروانا ہے۔ اردو غزل کے ابتدائی نقوش کہاں اور کن کن فارسی شعرا کے ہاں ملتے ہیں کی وضاحت شامل ہے۔

12.3 غزل کا آغاز وارتقاء

دستیاب لسانی شہود کی رو سے اُردو زبان اور اُردو غزل کا آغاز مسا وی طور پر ہوا۔ امیر خسرو ؔ۱۳۲۵ء، اُردو زبان کے پہلے غزل گو ہیں جن کی مشہور غزل ۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

اُردو کی پہلی غزل ہے جس کے چیدہ چیدہ اشعار میرؔ کے تذکرے ''نکات الشعرا'' قائم کے تذکرے ''مجز ن نکات'' میں شامل ہیں جب کہ یہ پوری غزل قدرت اللہ قائمؔ کے تذکرے ''مجموعۂ نغز'' (۱۸۰۸ء) میں شامل ہے۔ لیکن اس غزل کی اصل شہرت محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آبِ حیات'' کی اشاعت کے بعد ہوئی۔ خسروؔ کی وفات سے ''نکات الشعرا'' کی تالیف تک اس غزل کا کوئی تحریری ثبوت دستیاب نہیں ہے۔ اس لیے ماہرِ لسانیات زبانی روایت کی وجہ سے اس غزل کی زبان کو خسروؔ کی خالص زبان تسلیم کرنے میں تذبذب کا شکار ہیں۔ لیکن اکثر محققین اس غزل کو خسروؔ کی غزل قرار دیتے ہیں۔ اِبتدائی عہد میں خسروؔ کے علاوہ ان کے پیر بھائی امیر حسن حسنؔ دہلوی کی بھی ایک غزل ملتی ہے ۔ جس میں ہندی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے ایک نیا لہجہ، ایک نیا آہنگ صاف سُنائی دیتا ہے۔ حسن دہلوی ایک قادر الکلام پُرگو شاعر تھے جن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالرحمٰن جامیؔ نے انہیں ''سعدیؔ ہندستان'' کہا تھا۔

ہر لحظ آید دردیم دیکھوں اوسے ٹک جائے کر

گویم حکایت ہجر خود با آں صنم جیئو لائے کر

شُمالی ہند میں خسروؔ اور حسنؔ کے بعد ساڑھے تین سو سال تک غزل کے اکّا دکّا نمونے دستیاب ہیں۔ بابر کے عہد میں فارسی کے مشہور شاعر شیخ جمالیؔ کبنوہ (م ۱۵۳۵) کی ایک غزل دستیاب ہے جس پر فارسی رنگ غالب ہے ۔

خوار شدم زار شدم لٹ گیا — دررہ عشق تو کمر ٹٹا ہے
گرچہ بدم گفت رقیب کٹن — اس کا کہا مت کرو یہ جھٹا ہے

اس کے بعد اکبرِ اعظم کے عہد (۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) میں بہرام سقّہ بخاریؔ اور ملّا نوریؔ کی ایک ایک غزل ملتی ہے۔ جس میں خسروؔ کے ریختہ کا رنگ نمایاں ہے ۔

چپ کرا ے دل شدہ سقا زغم یار منال — گر جفا رفت بہ جان تو میاں کرتی ہے
(سقّہ)

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد — بے چارہ نوریؔ نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے
(ملّا نوری)

شاہ جہاں (۱۶۲۷ء۔۱۶۵۷ء) میں اُردو زبان ارتقاء کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ لیکن اس عہد میں بھی غزل کے نمونے کمیاب ہیں۔ اس دور کے دو شاعر چندر بھان برہمنؔ (م ۱۶۶۲) اور منشی ولی رام ولیؔ کی ایک ایک غزل دستیاب ہے جن میں احساسات و جذبات کے بیان کے ساتھ فلسفیانہ اور اخلاقی پہلو حاوی ہے ۔

تو مہماں آمدی ایں جانفدی خود خانۂ خاوند
تو اپنے آپ کو بھولا کسی کو نا پچھانا ہے
شرابِ سُرخ مے نوشی، اجل کردی فراموشی
مرن کو دور مت سمجھ عجب یہ ٹک بہانا ہے

(ولی رام ولیؔ)

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشیہ ہے نہ پیالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا سیں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

(چندر بھان برہمنؔ)

اورنگ زیب کے عہد میں (۱۷۰۷ء-۱۶۵۷ء) اُردو زبان کافی ترقی کر چکی تھی اور مدرسوں میں ذریعہ تعلیم ہو گئی تھی۔ اسی عہد میں فارسی کے مشہور شاعر ناصر علی سرہندی (۱۶۹۷ء) کی تین غزلیں ملتی ہیں جن میں فارسی رچاؤ کے ساتھ فارسی مضامین کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان غزلوں میں دکنی اثرات بھی نمایاں ہیں۔

سجن کے حسن کا قرآں پڑھیا ہے میں نظر کر کر
نہیں پائی غلط اوس میں دیکھیا زیر و زبر کر کر
چندر سے مکھ پر یہ خال مشکیں نپٹ بشوخی لٹک رہا ہے
عجب ہے یاراں کی زنگی بملک رومی اٹک رہا ہے
نین کے ساغر تمن کے بھیتر اچھوں لبالب سوں بل پڑے گا
ہووےگی نرگس خجل چمن موں گلوں کی اکھیا میں گل پڑے گا

شُمالی ہند میں عہدِ خسروؔ سے اورنگ زیب تک غزل کی روایت اپنی خام شکل میں تھی اور اس کا اِرتقا بہت سست رو تھا لیکن اسی ساڑھے تین سو سال کے عرصے میں جنوبی ہند میں غزل طفولیت کی منزل سے گذر کر عہدِ شباب میں قدم رکھ چکی تھی اور اس کی روایت میں ایک استحکام پیدا ہو چکا تھا۔

جنوبی ہند میں غزل کا اِرتقاء

اُردو زبان وادب کے فروغ میں سرزمینِ دکن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کی دکن میں آمد سے شُمالی ہند کی زبان کو اپنے غیر خاندانی علاقوں میں پھلنے پھولنے کا موقع میسر آیا اور مذہبی، سیاسی وسماجی ضرورتوں نے اُردو زبان کو ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے جلوہ گر کیا۔ ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد جنوبی ہند میں ہند ایرانی مُشترکہ تہذیب وثقافت نے اِرتقائی منزلیں طے کرنا شروع کیں جس میں ہندوستانی عناصر کی شمولیت زیادہ تھی۔ بہمنی سلطنت کے آٹھویں بادشاہ فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں (م ۱۴۱۹) جنوبی ہند میں اُردو غزل کا آغاز ہوا۔ فیروز شاہ ایک اچھا شاعر تھا جو فارسی اور اُردو میں فکرِ سخن کیا کرتا تھا۔ فیروز شاہ کا فارسی کلام تو آج دستیاب ہے لیکن اس کے اُردو کے کلام کا صرف ایک نمونہ غزل کی صورت میں دستیاب ہے جس کی بُنیاد پر فیروز شاہ کو جنوبی ہند کا پہلا غزل گو کہا جاسکتا ہے۔ فیروزؔی کی غزل میں ہندوستانی معاشرت اور ہندی رنگ کافی غالب ہے ؎

سوج اتک دل بدل سر سے سو شعلے آگ کے برسے
بھوت فیروزؔی اب تر سے سو کا ہی میکہ نئیں کھولتا

اسی عہد کے مشتاقؔ بیدری اور لطفیؔ کی غزلوں کے نمونے بھی ملتے ہیں جن میں ہندوستانی روایت کے پیشِ نظر عورت کی طرف سے ہجر وفراق کے مضامین کے ساتھ اسلامی تصوف کی چاشنی بھی ہے ؎

صفا اس گال کوں دیکھت نظر سو جا گا گر پڑتی
مکھی کے پیر میں کاں طاقت سورج لک جا گزر آوے
(مشتاقؔ بیدری)

لطفیؔ ترے چلن کی پا کی کہاں ہے اس میں
جیوں پانچ پانڈوؤں کی کہتے سو دھرپتی ہوں

پندرھویں صدی کے اِختتام پر جنوبی ہند میں بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور اس علاقے میں پانچ خودمختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔ بیجا پور میں عادل شاہی (۱۴۹۰) بیدر میں برید شاہی (۱۴۸۷ء) برار میں عماد شاہی (۱۴۸۷ء) احمد نگر میں نظام شاہی (۱۴۹۰ء) اور گولکنڈہ میں قطب شاہی (۱۵۱۲ء) ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ اُردو ادب کی ترویج وترقی کے لحاظ سے اِن ریاستوں میں بیجا پور اور گولکنڈہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں ریاستوں کے سلاطین علوم وفنون اور شعر وادب کے دلدادہ تھے۔ اس لیے اِن علاقوں میں اُردو زبان وادب کو جو ترویج وترقی حاصل ہوئی وہ دُوسری ریاستوں میں نہ ہوسکی۔

قطب شاہی سلطنت میں ابراہیم قطب شاہ کا عہد ادب کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے۔ اسی عہد میں سرزمینِ گولکنڈہ میں شعر وادب کا آغاز ہوا اور فیروز بیدریؔ، ملا خیالیؔ اور محمودؔ جیسے شعراء منظرِ عام پر آئے۔

محمود (م ۱۵۲۷ء) نے اُردو غزل میں ہندی اثرات کے ساتھ فارسی روایت کو جذب کرنے کی کوشش کی اور عشقِ حقیقی ومجازی کے ساتھ زندگی کے دُوسرے تجربات کو غزل کا موضوع بنایا۔ محمودؔ نے غزل میں وسعت وتوانائی پیدا کر کے ایک جُداگانہ روایت قائم کی جس کے تسلسل کی آخری کڑی ولیؔ اورنگ آبادی ہیں۔ اس لیے محمود کو غزل کا مجدد بھی کہا جاتا ہے۔

حسنِ لیلیٰ کا تماشا دیکھ مجنوں مکھ منے — کیوں گزرتا سربسر از آفتاب عاشقاں
ڈرتا ہوں میں اس مست سیاہ چشم سوں آخر — بے دیں کریں محمودؔ سے سجادہ نشیں کوں

فیروزؔ بیدری اور ملاّ خیالیؔ کے یہاں بھی ہندی اور فارسی کی آمیزش سے ایک نیا روپ رنگ پایا جاتا ہے لیکن اِن دونوں شعرا کے یہاں محمودؔ کے مقابلے میں ہندی عناصر کی شمولیت زیادہ ہے جس سے غزل میں گیت کا رس پیدا ہوگیا ہے۔

اس عہد میں غزل کا سب سے بڑا شاعر قلی قطب شاہ (۱۶۱۱ء۔۱۵۸۱ء) ہے جو قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ تھا۔ قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے جس کے دیوان کو اُس کے بھتیجے اور جانشین محمد قطب شاہ نے

ردیف وار ترتیب دے کر منظوم مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔قلی قطب شاہ کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مُشتمل ہے جس میں رُباعی اور مثنوی کے علاوہ تمام تر غزلیں ہیں۔جن میں اکثر مربوط اور مسلسل ہیں اس لیے بعض ناقدین نے ان غزلوں کو نظم کہا ہے۔

قطب شاہ کی غزل میں ہندستانی عناصر اور ہندیت حاوی ہے۔قطب شاہ ہندستانی تہذیب کا دلدادہ تھا اسی لیے اس کی غزل میں اتحاد و رواداری کا بھرپور مظاہرہ ہے۔قطب شاہ نے ہندوستانی تیوہاروں اور رسم و رواج کو قومی تقریب کی حیثیت سے رائج کیا اور اپنے کلام میں ان کی عکاسی کی۔ بسنت،نوروز،آمدِ برسات وغیرہ اس کی غزلوں کے موضوع ہیں۔قطب شاہ کی غزل میں مادی پہلو نمایاں ہے۔اس کے یہاں جسم و جسمانیت ،لمس وحسیات اور جنسیات پرستی حاوی ہے اس لیے سراپا نِگاری اور عریاں نِگاری قطب شاہ کی غزلوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔قطب شاہ کی غزلوں میں لیلیٰ مجنوں،شیریں فرہاد کے ساتھ مینا اور اروشی کا بھی ذکر کیا ہے۔اس لحاظ سے قطب شاہ نے غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا کی اور غزل میں شگفتگی،شیرینی اور بے باکی کی خصوصیات پیدا کیں۔

ہمارا سجن خوش نظر باز ہے　　　　تو اس دل میں سب عشق کا راز ہے

اے نار میرے نین کو دے اپنا دیدارِ عیش

سروں بھی تپستے ہیں مرے انکوں بھی دے گفتارِ عیش

قطب شاہ کی غزل کا محبوب فارسی روایت کے برعکس ہندستانی عورت ہے اور کہیں کہیں گیت کی روایت کے تحت اظہارِ عشق عورت کی طرف سے ہے۔جب کہ ہیئت ،وزن اور لفظیات کی سطح پر فارسی اثرات نمایاں ہیں۔اس طرح قطب شاہ کی غزل ہندایرانی تہذیب کی بہترین مظہر ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کا نواسہ اور قطب شاہی فرمانروا عبداللہ قطب شاہ کی غزل تجربات کا سیدھا سادھا بیان ہے۔ اس کی غزل بے ساختگی اور روانی کی خصوصیات سے متصف ہے۔ساتھ ہی عبداللہ کی غزل میں خارجیت کے ساتھ داخلیت کے عناصر بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔عبداللہ کی غزل میں بحور وقوافی کے مخصوص استعمال سے ایک مُنفرد اور

جُداگانہ ترنم اور جھنکار پائی جاتی ہے۔اس کی اکثر غزلوں میں چار چار قافیے استعمال کیے گئے ہیں۔

نہیں ہے جس میں تیرا عشق اس تھے ہزاراں بار بہتر سنگ خارا

قطب شاہی دور کے ملک الشعراء غواصؔی نے اُردو غزل کو ایک نئی طرز اور نئی فکر سے آشنا کیا۔غواصؔی نے غزل میں اخلاقی اور روحانی عناصر شامل کر کے اُردو غزل کو وسعت بخشی اور غزل میں سوز و گداز اور پاکیزگی و بلندی کے اوصاف پیدا کیے۔

عشق کی آگ میں جل کر راک ہونا عشق بازی میں چاک چاک ہونا

اس سجن کے وصال کی خاطر آرزو دل میں لاک لاک ہونا

اس عہد کے دُوسرے اہم غزل گویوں میں مراں جی خمد آئیؔ، ابن نشاطؔی، طبعؔی، ابوالحسن تانا شاؔہ قابلِ ذکر ہیں۔

بیجاپور کے اِبتدائی غزل گویوں میں برہان الدین جانؔم، شہباز حسینؔی، خواجہ محمد دیدار فانؔی اہم ہیں۔ان شعراء کی غزلوں میں اخلاقی اور روحانی مضامین پرزور ہیں۔خواجہ محمد دیدار فانؔی کے یہاں فارسی لفظیات اور اسلُوب کا اثر زیادہ ہے۔فانؔی نے اُردو غزل کو فارسی روایت سے قریب کرنے کی کوشش کی اور ہئیت وطرزِ ادا اور اشارات وعلائم میں ایرانی غزل کا تتبع کیا۔اس لحاظ سے ان کی زبان وبیان اور اسلُوب ان کے ہم عصروں سے منفرد ہے۔

جے مست ہے درس کے اس کوں شراب کیا ہے
جس کا گزک جگر ہے تِس کوں کباب کیا ہے

از غمزہ ہائے خوبی خوں کردجانِ من را
مجھ سے اتیت اوپر اتنا عتاب کیا ہے
(فانؔی)

جانؔم کہے اے شہ پری، یک زہرا دُوسرا مشتری
تو شیام ہوں تیری چری کہتا ہوں راسک راس میں
(جانؔم)

دونوں رکاباں نیک و بد رکھنا قدم توں ایک حد
تب ہو پڑے گا دیکھ تو توبہ کا چابک مار توں
(شہباز حسین)

عادل شاہی سلطنت میں حسن شوقؔی اور علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ، ہاشمؔی ممتاز غزل گو ہیں۔شوقؔی نے غزل کے جدید اسلُوب کو مستحکم کیا اور مختلف عشقیہ جذبات و کیفیات کی عکاسی کے ساتھ سراپا نِگاری اور محبوب کے حسن و جمال کی مدح وقدح میں فارسی طرزِ ادا اور اسلُوب کو اُردو غزل میں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ساتھ ہی ہندی روایت و معاشرت کو بھی بحسن وخوبی برتنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے شوقؔی کی غزل گھُلاوٹ اور سوز و گداز کی کیفیت سے متصف ہے۔ شوقؔی کے یہاں فارسی روایت کے زیرِ اثر زاہد و ناصح پر طنز و تعریض اور اپنی کافرانہ طرز پر فخر کے مضامین بدرجہ اتم موجود ہیں۔

شوقی ہمارے عشق میں کئی زاہداں مشترک ہوئے
اس مذہبِ کفّار میں تیری مسلمانی کدر
شمع کے سوز میں سُکھ نئیں و لے آرام ہے دن کو
گھٹی ہے عمر سب میری سو نِس دن جانگدازی میں

شاہیؔ کی غزلوں میں ہندی روایت حاوی ہے۔اس کے یہاں لذتِ جسم اور عشق کا جنسی پہلو نمایاں ہے۔

میں چھاؤں ہوں پیا سنگ لاگی رہے ہوں دائم
یک پل جُدا نہ ہونا وصلت اسے کہتے ہیں

ہاشمؔی کی غزل میں عورت کے جذبات اس کی زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ہاشمؔی نے عورتوں کی زبان و محاورے کے پیرائے میں دکنی ماحول اور طرزِ معاشرت کی عکاسی کے ساتھ مختلف النوع اِنسانی جذبات و احساسات، روزمرّہ کے تجربات اور حیات و کائنات کے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔اس لیے ہاشمؔی کی تمام غزلیہ شاعری ریختی کے ذیل میں شامل نہیں کیوں کہ ہاشمؔی کی اکثر غزلوں میں سنجیدگی کا عنصر بدرجہ اتم ہے۔

مرے یو جیو میں آتا کسی سوں بات نہ کرنا
پکڑے کونا توجا سونا لپٹ کر موں کو چادر میں

سترھویں صدی کے آخر تک جنوبی ہند کی غزل پر فارسی اثرات کافی حدتک مُرتب ہو چکے تھے۔لیکن غزل میں مثنوی کا توضیحی انداز، اخلاقیات، زاہدو ناصح پر طنز، حسن وعشق کے افسانے اور سراپا نِگاری سے متعلق موضوعات شامل ہیں۔لیکن ان تمام امور کے باوجود دکنی غزل مقامی زبان اور ہندی روایت سے بہ حیثیت مجموعی قریب تھی۔

اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد جنوب پر شُمال کی زبان حاوی ہونے لگی اور ہندی روایت پر فارسی اثرات غالب آنے لگے۔اس دور میں آزآد، فدوؔی، بحرؔی، فراقؔی، داؤدؔ وغیرہ شعراء کے علاوہ وؔلی گجراتی اور سراؔج اورنگ آبادی دو ایسے شعراء گذرے جنھوں نے نہ صرف قدیم دکنی روایت کی پاسداری کی بلکہ اپنے کلام میں مستقبل کے سارے اِمکانات سمیٹ کر کلاسیکل اُردو شاعری کی بُنیادیں مستحکم کیں اور شُمالی ہند میں اُردو شاعری کی راہیں استوار کیں۔

۱۷۰۰ء میں وؔلی کا سفرِ دہلی اور شاہ سعداللہ گُلشن سے اُن کی ملاقات اُردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے جس نے اُردو زبان اور شاعری کو ایک نئی جہت اور ایک نئی قوت سے ہمکنار کیا۔وؔلی نے گُلشن کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اُردو شاعری میں شعوری طور پر فارسی روایت کو مستحکم کیا اور اس طرح دکنی اور ایرانی روایت کے اِمتزاج سے زبان کا ایک خمیر تیار کیا۔وؔلی نے فارسی اصناف بحور واوزان اور لفظیات وتراکیب سے دکنی اور شُمالی ہند کی زبان کے درمیان ایک ایسا توازن پیدا کیا جس کے سبب کلاسیکل اُردو کی بُنیادیں استوار ہوئیں اور وؔلی کی شکل میں غزل نے بہت جلد اپنا مزاج حاصل کرلیا۔وؔلی کی غزل میں تہہ داری، ایجاز واختصار اور استعاراتی نظام پوری طرح کارفرما ہے۔یہی بُنیادی خصوصیات فارسی غزل کی طرۂ امتیاز ہیں جو وؔلی سے قبل کے شعراء کے یہاں شاذ ونادر دیکھنے کوملتی ہیں۔وؔلی کی دُوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے موضوعات میں تنوع پیدا کر کے اس میں داخلیت اور دروں بینی کی صفات پیدا کیں اور عشقِ مجازی کو بوالہوسی کے دائرہ کار سے نکال کر پاکیزگی اور بُلند خیالات کی طرف مائل کیا۔وؔلی نے عشقِ مجازی کے ساتھ عشقِ حقیقی سے بھی غزل کے رِشتے استوار کیے۔بہ حیثیت مجموعی وؔلی نے فطری اور تجربی عمومیت کے سہارے تصوراتی اور مثالی خصوصیات سے غزل کو متصف کیا۔

درو ادیٔ حقیقت جس نے قدم رکھا ہے اوّل قدم ہے اس کا عشقِ مجاز کرنا

خوب رو خوب کام کرتے ہیں یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

سرؔاج اورنگ آبادی نے ولؔی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے غزل میں شدتِ جذبات اور سرشاری کی کیفیات پیدا کیں اور عشقِ مجازی کے جذبہ و کیف اور بیان کی صفائی و برجستگی سے غزل کی زبان و اسلوب میں ایک پُر وقار پختگی وصلاحیت پیدا کی جو سرؔاج سے قبل کی غزل میں مفقود تھی۔ یہاں تک کہ ولؔی کی زبان بھی اکھڑی اکھڑی محسوس ہوتی ہے۔سرؔاج کی غزل کی اسی شیرینی ولطافت کے اثرات میرؔ سے لے کر اقبالؔ تک کی غزل پر حاوی ہیں۔

نہیں ہے تاب مجھے سامنے ترے جاناں کہاں سراج، کہاں آفتابِ عالم تاب

....

کیا خاک آتشِ عشق نے دل بے نورے سرؔاج کو

نہ خطر رہا، نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

12.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ اردو غزل کا آغاز وارتقاء کا جائزہ لیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ دکنی اردو غزل کی خصوصیات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ اردو غزل کے ارتقاء میں اہم شعراء کے مقام کا تعین کیجئے۔

12.5 امدادی کتب

1 اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، از گوپی چند نارنگ، مطبع، این سی پی یو ایل، نئی دہلی۔

2 غزل اور مطالعہ غزل، از ڈاکٹر عبادت بریلوی، مطبع، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

اکائی نمبر 13

شمالی ہند میں اُردو غزل کا آغاز و اِرتقاء

ساخت:

13.1 سبق کا تعارف

13.2 سبق کا ہدف

13.3 شمالی ہند میں اُردو غزل کا آغاز و اِرتقاء

13.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

13.5 امدادی کتب

13.1 سبق کا تعارف

اورنگ زیب کے آخری زمانے میں دکن کے سب سے مشہور شاعر ولی دکنی کو اردو شاعری کا ''باوا آدم'' کہا جاتا ہے۔ ان کا دیوان جب دہلی آیا تو ان کی پیروی میں بیدل، خان آرزو اور فطرت وغیرہ نے ریختہ میں شعر کہنے شروع کر دئے۔ 18 ویں صدی کی پہلی دہائیوں میں اردو کے کئی اچھے شاعر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ فائزؔ، حاتمؔ، آبروؔ، یک رنگؔ، شاکر ناجیؔ، انجام وغیرہ جیسے مشہور شاعر اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دیوان موجود ہیں۔ اسی دور میں سب سے زیادہ غزلیں کہی گئی ہیں۔ ویسے قصیدے، مثنوی، مرثیہ، شہر آشوب، رباعی، مخمس وغیرہ میں بھی طبع آزمائی ہوئی ہے۔

13.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں شمالی ہند میں اردو غزل کا آغاز وارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔اردو شاعری کا آغاز تو شمالی ہند میں ہی ہوا تھا لیکن دکن میں پروان چڑھی اور پھر پلی بڑھی شمالی ہند میں۔ کیوں کہ جب ولیؔ دکنی کا دیوان شمال ہند میں پہنچتا ہے تو اہل دلی کے شعرا کو احساس ہوتا ہے کہ جس زبان کو گری پڑی زبان سے منسوب کیا جاتا ہے اس میں بھی شاعری کی جاسکتی ہے۔اس اکائی میں غزل کے اسی ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔

13.3 شُمالی ہند میں اُردو غزل کا آغاز وارتقاء

غزل کا نقطۂ آغاز اور اس کا اصل مولد و مسکن شُمالی ہند ہے لیکن اپنی آفرینش کے بعد غزل اپنے آبائی علاقے سے بیگانہ ہوگئی اور دُور دراز کے غیر علاقوں میں تقریباً چار سو سال تک آزادانہ طور پر اس کی نشو ونما ہوتی رہی، جہاں اِرتقا کی کئی منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے ایامِ شباب میں غزل نے ایک بار پھر شُمالی ہند کی طرف رُخ کیا۔ ۱۷۰۰ء میں ولیؔ کی دلی آمد سے شُمالی ہند کے فارسی ادباء وشعراء اُردو زبان کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۷۱۹ء میں ولیؔ کے دیوان کی آمد سے دھلی میں اُردو شاعری گلی کوچوں میں گشت کرنے لگی جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ دھلی میں جہاندار شاہ کی تخت نشینی کے بعد سے سیاست میں عوامی عمل دخل کو اہمیت حاصل ہوگئی تھی اس لیے عوامی زبان اُردو کو بھی درباری سرپرستی حاصل ہونا ناگزیر تھا۔ دُوسرے اس عہد میں ایرانیوں کے احساسِ برتری اور معارضہ آرزوؔ و حزیںؔ نے بھی نئی نسل کو فارسی کے بجائے اُردو شاعری کی طرف راغب کیا۔ شُمالی ہند میں اُردو غزل نے پوری طرح فارسی روایت کو جذب و قبول کیا اور ہندوی روایت کے عناصر کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی۔ زبان و بیان، مضمون و معنی، رسومیات غرض کہ ہر سطح پر فارسی روایت کو اوّلیت حاصل ہوئی۔ اس کی دو وجوہات تھیں:

(۱) فارسی زبان وادب کی بین الاقوامی حیثیت اور معیار

(۲) خواص کی فارسی پسندی۔

شُمالی ہند میں اُردو شاعری کا آغاز فارسی گو شعراء کے ہاتھوں عمل میں آیا اور انھوں نے تفنن طبع کے طور پر کچھ ریختے میں کہنا شروع کیا۔ چونکہ شُمالی ہند میں غوری کے عہد سے اورنگ زیب کے عہد تک فارسی زبان سکّہ رائج الوقت تھی اور عوام کو سیاست میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی اِس لیے شُمالی ہند میں فارسی روایت کو جو استحکام حاصل تھا وہ جنوبی ہند میں نہ تھا۔ ''شعرالہند'' میں عبدالسلام ندوی نے فارسی روایت کے تسلسل، ارتقا، نقطۂ عروج اور اصلاحات کے پیشِ نظر اُردو شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ دورِ متقدمین

(الف) اِبتدائی دور (ب) اصلاحی دور (ج) لکھنوی دور

۲۔ دورِ متوسطین

۳۔ دورِ متاخرین

دورِ متقدمین۔ اِبتدائی دور

ولؔی گجراتی کے سفرِ دھلی کے بعد شُمالی ہند میں فارسی کے مشہور شعراء نے تفنن طبع کے طور اُردو غزل میں طبع آزمائی کی اور شُمال میں شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ لیکن ان شعراء کے یہاں سنجیدگی، پختگی اور ٹھہراؤ کی کمی ہے جس کی وجہ سے اِبتدائی عہد کی غزل کے وافر نمونے موجود نہیں تاہم اِن شعراء کی اہمیت سے کسی بھی طرح اِنکار ممکن نہیں۔ اس دور کے شعراء کی تعداد کافی ہے جن میں مولوی عبدالغنی قبولؔ، شاہ وحدتؔ، بیدلؔ، شاہ گلشنؔ، فائزؔ، انجامؔ، پیامؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ، بہارؔ اور آزادؔ بلگرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء نے زبان و بیان کی صفائی کے ساتھ فارسیت پر قابلِ قدر توجہ دی ۔

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
در و دیوار سے اب صحبت ہے

(امیدؔ ہمدانی)

آرزو دل میں یہی گلشنؔ کے ہے مرنے کے وقت
سرو قد کوں دیکھ سیر عالمِ بالا کریں

(سعداللہ گلشنؔ)

ٹک تو فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم

(امیدؔ خاں انجام)

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

(خان آرزوؔ)

نہیں اس شوخ سا رنگیں ادا گل اگر رنگیں ہوا تو کیا ہوا گل

(بہارؔ دہلوی)

حالانکہ جنوبی ہند میں بھی فارسی سے اخذ و قبول کا رُجحان بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا لیکن الفاظ، تراکیب، بندشِ مضمون اور بحر وغیرہ پر ہندی اثرات کی وجہ سے فارسی روایت بہت کچھ دب گئی تھی جب کہ شُمالی ہند میں فارسی روایت سر چڑھ کر بولتی ہے۔ اس لیے اُردو کے تمام تذکرہ نِگاروں نے ولیؔ اور سراجؔ کے علاوہ تمام دکنی شاعری کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور دکنی شاعری کو ایک ''لچریات'' کے مترادف ٹھہرایا۔

شُمالی ہند میں ولیؔ کے زیرِ اثر جو شاعری پروان چڑھی اس کا حاوی عنصر ایہام گوئی تھا۔ حالانکہ ایہام گوئی ولیؔ کی بُنیادی خصوصیت نہیں بلکہ اس کے مختلف رنگوں میں سے ایک رنگ ہے لیکن شُمالی ہند کے اِبتدائی شعراء ایہام کو ولیؔ کی بُنیادی خصوصیت قرار دیتے ہوئے اس کے تتبع میں ایہام گوئی کو شاعری کی اساس بنایا اور غزلیہ شاعری کو اپنا طرۂ امتیاز قرار دیا۔ ایہام ایک صنعت معنوی ہے جس میں ایک ذو معنی لفظ کو اس قرینے کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے کہ جس میں معنئ قریب اور معنٰی بعید کا التزام ہوتا ہے اور شاعر کی مُراد معنئ بعید سے ہوتی ہے۔ یعنی شعر کے اصل معنی ایک ہی

ہوتے ہیں جب کہ دُوسرے معنی کا وہم ہوتا ہے۔اس عہد میں شُمالی ہند میں ایہام گوئی کا رُجحان سیاسی وسماجی عوامل کا زائدہ ہے۔محمد شاہ کے زمانے میں معاشرہ دورنگی کا شکار تھا۔قول وفعل میں تضاد تھا اور امراء وسلاطین اپنے ذاتی مفادات کے لیے اخلاقی اور سماجی اقدار کو پامال کر رہے تھے۔پورا معاشرہ اخلاقی پستی کا نمونہ تھا۔اس تہذیب میں کیف وسرور اور طوائفوں کی گرم بازاری تھی۔اس لیے نمائش اور عیش پرستی اس دور کی سب سے بڑی خصوصیات ہیں۔انہی خصوصیات کے نتیجے میں اُردو کے اِبتدائی غزل گوشعراء نے فارسی شاعری کے خارجی عناصر صنعت گری اور الفاظ وتراکیب پر زیادہ زور صرف کیا اور جذبات وخیالات کو ثانوی حیثیت دی۔ایہام گوئی کی ایک وجہ ہندی روایت بھی ہے جس میں دوہوں کی مقبولیت نے اُردو شعراء کو اس صنعت کی طرف مائل کیا۔صنعتِ ایہام معنی آفرینی کا ذریعہ ہے جس میں لفظ کے چابک دست استعمال کی وجہ سے قاری وسامع کا ذہن ایک لمحہ کے لیے غیر اصلی معنی میں الجھتا ہے لیکن ذرا سے غور وفکر سے اصلی معنی آشکارا ہو جاتے ہیں۔یہ بات خود اس فکر کا مظہر ہے کہ یہ کائنات بیک وقت حقیقت ومجاز کی حامل ہے۔مجازی پہلو قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ پُرکشش ہوتا ہے لیکن ذرا سی عقلی کاوش حقیقت کو آشکارا کر دیتی ہے۔دراصل کائنات کی حقیقت ایک ہی ہے جو مختلف رنگوں میں نظر آتی ہے۔اس دور کے ایہام گوشعراء آبرؔو، شاکر ناجؔی، شرف الدین مضمونؔ، شاہ حاتمؔ، مصطفیٰ خاں یک رنگؔ، احسن اللہ احسنؔ، شاہ ولی اللہ اشتیاقؔ، سعادت علی امروہی، میر محمد سجادؔ، بیتابؔ، میر مکھن پاکبازؔ، کمترینؔ، عارف الدین خان عاجزؔ، فضلی اورنگ آبادی، عبدالوہاب یکروؔ وغیرہ جن میں شاہ مبارک آبرؔو، مضمونؔ اور حاتمؔ اہم ہیں۔

شاہ نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرؔو عہدِ محمد شاہی کا نمائندہ شاعر ہے۔آبرؔو کی غزل کا مزاج فارسی اور ہندی روایت کی آمیزش اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔انھوں نے ایک طرف فارسی رسومیات کو اپنی غزل کا حِصّہ بنایا تو دُوسری طرف ہندی تلمیحات واشارات کے ساتھ کبت ودوہوں کی روایت سے اخذ وقبول کیا۔زبان وبیان کی اس آمیزش نے آبرؔو کی غزل میں ایہام کے رنگ کو مزید گہرا کر دیا اور ایہام کی کئی صورتوں کو پیدا کیا۔آبرؔو نے لفظوں اور محاوروں کے برمحل استعمال سے مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کی کئی جہتیں پیدا کیں جس سے اُردو غزل میں لفظ ومعنی کی سطح پر وسعت ورنگا

رنگی کی صفات پیدا ہوگئیں۔ آبرؔو محض ایک ایہام گو نہیں بلکہ ان کی شاعری میں فارسی شعریات کے جملہ خصائص پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے مشکل زمینوں میں رواں اشعار کہے اور زبان و بیان اور محاورات وضرب الامثال کے برمحل استعمال سے غزل میں ایک لطف پیدا کیا۔

ایہام:

ہوئے ہیں اہلِ زرخواہاں دولت خوابِ غفلت میں
جسے سونا ہے یارو فرش پہ مخمل کے کہہ سو جا

نازک تنی پہ اپنی مغرور ہو رہے ہو
موسیٰ کمر نے تجھ کو فرعون کر دیا ہے سادہ

تمھارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے — کہاں ہے کس طرح کی ہے کِدھر ہے
نین سے نین جب ملائے گئے — دل کے اندر میرے سمائے گئے

ایہام گویوں میں دُوسرا اہم نام محمد شاکر ناجؔی کا ہے۔ ناجی نے بھی آبرؔو کی طرح ایہام کی تمام صورتوں کو برتنے کی کوشش کی اور غزل میں معنی آفرینی کا عنصر پیدا کیا۔ لیکن ناجؔی کے یہاں آبرؔو کے بالمقابل اثر آفرینی کی کمی ہے۔ ناجؔی کی غزل میں ایہام بطور ایہام پایا جاتا تھا۔ اِس کے علاوہ ناجؔی کی غزل میں محبوب کے جسمانی حسن، لباس اور آرائشِ جمال پر زیادہ زور ہے۔ کہیں کہیں اخلاقی مضامین بھی ملتے ہیں لیکن ان میں جذبہ واحساس کی کمی ہے ۔

ایہام

محبت سوں علی کو دیکھ ناجؔی — ہوا ہے دل میرا اب حیدر آباد
اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں — عارضی میری زندگانی ہے

شیخ شرف الدین مضمون کی غزل میں ایہام کے ساتھ شگفتگی، دل نشینی اور صفائی و برجستگی کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مضموؔن نے بعض فارسی اشعار کا اُردو میں خوب صورت ترجمہ کیا ہے ۔

شرم سے ہو جائیں پانی سب رقیب جو مرا یوسف ملے آچاہ سے

تجھ بن زبس کے پانی جاری کیے ہیں رو کر

چشموں سے میں اب اپنے بیٹھا ہوں ہاتھ دھو کر

ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں اے محبوب کیا

صبرِ ایوب کیا، گریۂ یعقوب کیا

مصطفیٰ خاں یک رنگؔ، احسن اللہ خاں احسنؔ اور عبدالوہاب یکرو، آبروؔ، ناجیؔ اور مضمونؔ کے پیرو ہیں۔ ان شعراء نے آبروؔ وغیرہ کی روایت کو آگے بڑھانے کے بجائے اس کے اتباع تک اپنے آپ کو محدود رکھا۔ البتہ یک رنگؔ کے یہاں زبان اور لہجے میں کچھ ایسے اِمتیازی نِشانات ضرور پائے جاتے ہیں جو آگے چل کر جان جاناںؔ کے یہاں واضح اور صاف ہوتے ہیں۔ شُمالی ہند میں ایہام گوئی کا رُجحان ۱۷۲۰ء سے ۱۷۳۹ء تک رہا جس کے بعد ردِ ایہام گوئی کی تحریک شروع ہوئی۔

متقدمین کا دُوسرا دور، تحریک ردِ ایہام گوئی:

محمد شاہی سلطنت کے رو بہ زوال ہونے کے ساتھ شُمالی ہند میں ایہام گوئی کا رُجحان بھی رو بہ زوال ہونے لگا اور ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کے بعد اُردو غزل نئی طرز اور نئی روش پر گامزن ہوئی۔ مرزا مظہر جان جاناںؔ اس نئے رُجحان کے سب سے بڑے ترجمان تھے جنھوں نے ایہام گوئی کے بجائے سچّے عاشقانہ جذبات پر غزل کی بُنیاد قائم کرتے ہوئے قلبی کیفیات اور واردات کے اِظہار پر زور دیا۔ ساتھ ہی ہندی الفاظ کے بجائے فارسی اسالیب کو مزید پُختگی کے ساتھ برتنے کا مشورہ دیا اور شاعری کے لیے ''اُردوِ معلیٰ'' شاہ جہاں آباد کی زبان کو فصیح قرار دیا۔ مرزا جان جاناںؔ نے فارسی تازہ گویوں کے اتباع میں عاشقانہ جذبات کے اِظہار اور زبان کی صفائی و شُستگی کے ساتھ ''سخنِ بے تلاش'' کو شاعری کا اصل جوہر قرار دیا۔ جب کہ مرزا سے قبل کی شاعری ایہام گوئی کے تحت ''تلاشِ لفظ تازہ'' تک محدود

ہونے کے ساتھ دکنی رنگ و آہنگ سے متاثر تھی۔ مرزاؔ نے اصلاحِ زبان کے تحت بھا کا اور ہندی کے ثقیل الفاظ اُردو سے زبان باہر کر کے اُردو میں فارسی کی شیرینی اور لطافت پیدا کی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر اُردو شاعری میں موضوع اور اسالیب کے اعتبار سے کافی وسعت پیدا ہوئی اور فارسی شاعری کے تمام موضوعات اور اصناف بڑی سرعت سے اُردو شاعری کا حِصّہ بننے لگے۔ اُردو شاعری خصوصاً اُردو غزل میں فارسی کے عشقیہ، متصوفانہ، اخلاقی اور خمیریہ موضوعات و مضامین کے جذب و قبول کرنے سے ان کے طے شدہ اسالیب بیان اور رموز و علائم بھی اُردو شاعری کا حِصّہ بن گئے جن کی بدولت اُردو غزل نے بہت جلد ترقی کی اعلیٰ منازل طے کر کے اپنے نقطۂ عروج کو حاصل کر لیا۔ تحریک ردِ ایہام گوئی دو نمایاں مقاصد کی حامل تھی:

(الف)۔ سچّے اور عاشقانہ جذبات کے اِظہار پر زور

(ب)۔ اصلاحِ زبان:

شاہ حاتمؔ نے اس تحریک کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور طرزِ ایہام پر مبنی اپنے قدیم دیوان سے اِنتخاب کر کے نئی طرز میں ایک چھوٹا سا دیوان ''دیوان زادہ'' ترتیب دیا۔ حاتمؔ نے سب سے پہلے اصطلاحِ زبان پر توجہ دی اور اُردو زبان کو محاورۂ دہلی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جس کی تکمیل میرؔ و سوداؔ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

مرزا جان جاناںؔ فارسی اور اُردو میں فکرِ سخن کرتے تھے اور بُلند پایہ صوفی ہونے کے ساتھ ایک روحانی پیشوا تھے۔ جان جاناںؔ کا اُردو کلام تو بہت کم دستیاب ہے لیکن تذکرہ نگاروں کی آرا کے مطابق اِبتدا میں مظہرؔ بھی ایہام گوئی کی طرف مائل ہوئے لیکن انھوں نے جلد ہی اس طرز سے کنارہ کشی اِختیار کرتے ہوئے عشقیہ جذبات و احساسات کو موضوعِ سخن بنایا اور اپنے دور کی شاعری کو متاثر کیا۔ مرزا مظہرؔ نے زبان کی صفائی، سادگی اور شائستگی کا خاص لحاظ رکھا اور الفاظ کو خوش سلیقگی کے ساتھ استعمال کرنے پر زور دیا۔ اس لحاظ سے مرزاؔ کا کلام بہت بُلند پایہ ہے۔ مرزاؔ کے دستیاب مختصر کلام میں عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی اور عصری مسائل کی بہترین عکاسی کی ہے ؎

یہ دِل کب عشق کے قابل رہا ہے　　　　کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزوں سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

مرزا مظہؔر کے عزیز شاگرد انعام الدین یقیؔن نے تحریکِ تازہ گوئی کو کامیاب بنانے اور اس کی اصطلاحات کو پورے طور پر رائج کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یقیؔن نے ذاتی تجربے اور احساسات کے اظہار کو نئے رنگ و روپ میں پیش کر کے لفظ و معنی میں ارتباط پیدا کیا اور فارسی کے رموز و علائم کو اس قدر سادگی و صفائی سے استعمال کیا کہ اُردو غزل نے فارسیت کے بجائے اپنے منفرد اور جُداگانہ مزاج کی تعمیر و تشکیل کی۔ یقیؔن کے یہاں مضمون آفرینی اور معنی آفرینی دونوں صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے
موجِ دریا کی طرح ضبط میں آسکتا نہیں
کوئی کیوں کر کہے احوالِ پریشاں میرا

اس قبیل کے دُوسرے اہم شعراء میں میر عبدالحئی تاباؔں، شرف علی فغاؔں، خواجہ احسن الدین خاں بیاؔن اور حاتؔم قابلِ ذکر ہیں۔ میر عبدالحئی تاباؔں کے یہاں بول چال کی زبان پر زور ہے جب کہ فغاؔں کے یہاں اِنفرادی انداز نمایاں ہے۔ شاہ حاتؔم بُنیادی طور پر دورِ ایہام گو کے شاعر ہیں لیکن مظہؔر کی اصلاحی تحریک کے زیرِ اثر انھوں نے اپنے قدیم دیوان کو مسترد کر کے ایک مختصر سا ''دیوان زادہ'' ترتیب دیا جس میں اصلاحی زبان کے ساتھ جذبات و احساسات کے پُر اثر اِظہار پر زور ہے۔

کیا ہوا حاتؔم تجھے، جینے سے اُکتایا کیوں ہے
دم غنیمت جان، مشفق زندگانی پھر کہاں

ان شعراء میں خواجہ احسن الدین خان بیاؔن کا مرتبہ سب سے بُلند ہے جن کے کلام میں فارسی شاعری کی فنّی

چابک دستی اور عام بول چال کے لب و لہجے کے ساتھ عشقیہ جذبات اور وارداتِ قلبیہ کا بیان خوب صورت پیرائے میں نمایاں ہوتا ہے۔ بیاںؔ کے یہاں سہل ممتنع کی مثالیں بکثرت موجود ہیں

سو برس میں نہ نکلے دل کی خلش　　　اور نکلے تو آن میں نکلے

دل ہمارا کہ گھر یہ تیرا ہے　　　کیوں شکست اس مکان پر آئی

مرزا مظہرؔ کی تحریک تازہ گوئی اپنے وقت اور عہد کی ضرورت اور سچّی آواز تھی۔ یہ دور پسپائیت، بے چینی اور افسردگی کا دور تھا۔ پورا معاشرہ شکست و ریخت سے دوچار تھا اس لیے ایسے یاس والم کے ماحول میں تصوف، آرزوں اور اُمیدوں کو قائم و دائم رکھنے کا ایک اعلیٰ وارفع سہارا تھا۔ اس لیے اس عہد کی غزل میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی متوازی طور پر جلوہ گر ہیں۔ اس عہد میں اُردو شاعری اور اُردو غزل کے بُلند پایہ اور بُلند مرتبت شعراء خواجہ میر دردؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ تھے جنھوں نے اُردو شاعری کو وقار اور استحکام بخشنے کے ساتھ اُردو زبان کو صلابت اور پختگی سے ہم کنار کیا۔ ان شعراء کی کوششوں سے فارسی شاعری کی روایت پوری طرح اُردو زبان میں حل ہوگئی اور اُردو زبان کے رنگ نے اپنی مثالی ہئیت کی تکمیل کی۔ میرؔ، سوداؔ اور دردؔ نے فارسی غزلوں پر غزلیں کہیں اور بہت سے فارسی اشعار کا اُردو میں ترجمہ کر کے اُردو غزل کے مزاج و آہنگ کو متعین کیا اور غزل کے بُنیادی اسالیب فراہم کیے۔

میر تقی میرؔ اس عہد کے ایک منفرد اور نمایاں غزل گو ہیں جس کے یہاں درد و غم کی کیفیت اس اعلیٰ ارفع صورت میں نمایاں ہوتی ہے جس میں یاس والم کے بجائے جینے کا حوصلہ اور سلیقہ ہے۔ میرؔ انسانی جذبوں اور کیفیت کا شاعر ہے۔ اس کے یہاں فکر و خیال بھی کیفیت سے ہم آمیز ہیں اس لیے میرؔ کے اکثر اشعار افشائے معنی کے بغیر سامع و قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ میرؔ کے یہاں عشق بُنیادی رویہ ہے جس کے پیرائے میں حیات و کائنات کے تمام مسائل پنہاں ہیں۔ میرؔ کی غزل کی دُوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ میرؔ نے روزمرّہ کی زبان، محاوروں، ضرب المثال کو اس سادگی اور صفائی کے ساتھ غزل کا حِصّہ بنایا ہے کہ ان تمام امور میں فارسی رچاؤ اور رنگ و آہنگ پوری طرح نمایاں ہے حالانکہ بعض غزلوں میں کوئی بھی فارسی ترکیب اور لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو　　دیر سے اِنتظار ہے اپنا

دِل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

سوؔدا کی غزل میں زورِ بیان، شگفتگی اور نشاط و کیف کے ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی ہے۔ سوؔدا کے یہاں جذبہ و احساس سے زیادہ تخیل آفرینی اور مضمون آفرینی ہے۔ سوؔدا کی غزل بیک وقت کئی رنگوں کی حامل ہے جس میں سوز وگداز، تصوف و فلسفہ، لفظی صناعی اور خیال بندی کے ساتھ بانکپن اور سلامتی کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر سوؔدا کی غزل میں بیروں بینی حاوی ہے۔ جب کہ میرؔ کے یہاں دروں بینی زیادہ ہے ۔

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں　　اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کِیا کرے

ناوک ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں　　تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

دردؔ کی غزل میں تصوف اور معرفت کا عنصر حاوی ہے جس میں غم کی تلخی کے بجائے ایک سرور اور قناعت کی کیفیت ہے۔ دردؔ کے یہاں عشق ایک اعلیٰ و ارفع جذبے کی صورت میں جلوہ گر ہے جس کی وجہ سے حقیقت مطلقہ تک رسائی اور ان کی عظمت کا حصول ممکن ہے۔ دردؔ کے یہاں زندگی اور اِنسان اپنی کاملیت کے ساتھ ظہور پذیر ہے۔

جوں آئینہ منھ کسی سے مت پھیر　　تیرے دِل میں اگر صفا ہے

ان نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں　　پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

اُردو غزل کے ان تین معماروں کے علاوہ اسی دور میں میر سوؔز کی غزل بھی لائق توجہ ہے جس میں خارجیت اور معاملہ بندی کے عناصر نے ایک نئے اسلوب کی داغ بیل ڈالی۔ اِس لحاظ سے متقدمین کا دُوسرا دور اُردو شاعری خصوصاً اُردو غزل کا عہدِ زریں ہے جس میں اُردو غزل کے وہ تمام رنگ و اسلوب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں جو کلاسیکی غزل کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بقول اخترؔ انصاری ''اس دور میں متعدد ایسے اسالیب نے جنم لیا جن کو غزل کی پوری تاریخ کی روشنی میں ''حاصلِ غزل'' کا مرتبہ دیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان میں سے ہر ایک اُردو غزل کی ایک دیرینہ روایت بن کر غزلیہ شاعری کا ایک مقبول و معروف پسندیدہ، جانا پہچانا، دیرپا بلکہ مستقل اندازِ بیان ثابت ہوا'' اختر انصاری نے کلاسیکل غزل کے چار بُنیادی اسالیب کی نشاندہی کی۔

(۱) میرؔ کا اسلوب جو سوز و گداز، وارفتگی، سپردگی، معنی آفرینی، گہری داخلیت، تہ داری، نرمی اور جذبہ و فکر کی صحیح آمیزش سے مُرکب ہے۔ اُردو غزل کا سب سے معتبر اسلوب، اسلوب میرؔ ہے جس کی جھلک بیسویں صدی کے ہر استاد شاعر کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔

(۲) دردؔ کا اسلوب جو علویت، گہرے تفکر، مرئیت سے تجریدیت اور زماں سے لازماں پر منحصر ہے۔ آتشؔ اور اصغرؔ اسی اسلوب کے زائیدہ ہیں۔

(۳) سوداؔ کا اسلوب خارجیت، مرئی حقائق سے نبرد آزما ہونے کی خواہش اور کوشش، تخیل آفرینی اور استعارہ بندی سے عبارت ہے۔ مصحفیؔ، ذوقؔ اور ناسخؔ و غالبؔ اسی اسلوب کے پروردہ ہیں۔

(۴) میر سوزؔ کا اسلوب جو جذبات نِگاری اور داخلی کیفیت کے بجائے خارجیت پسندی اور معاملہ بندی سے عبارت ہے۔ جعفر علی خاں حسرتؔ، قلندر بخش جرأتؔ اور داغؔ اسی اسلوب کے پیرو ہیں۔

متقدمین کا تیسرا دور:

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک دھلی میں اُردو غزل نے وہ ترقی اور عروج حاصل کیا جس نے آئندہ زمانوں کے لیے مثالی نقش قائم کیے۔ نادر شاہ اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے بزمِ دھلی درہم برہم ہوگئی اور یہاں کے ادبا و شعراء جائے امان کی تلاش میں فرخ آباد، اودھ اور روہیلکھنڈ کی طرف سرگرمِ سفر ہوئے جس کے نتیجے میں بزمِ لکھنؤ آراستہ ہوئی۔ لکھنؤ کے پہلے دور کے تمام تر شعراء دھلوی ہیں جن میں خان آرزوؔ، فغاںؔ، میرؔ، سوداؔ، حسرتؔ، جرأتؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، رنگینؔ، میر حسنؔ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

سیاسی و سماجی اعتبار سے لکھنؤ کی فضا پُر سکون تھی جہاں دولت کی فراوانی نے امراء و رؤسا کے ساتھ عوام کو بھی تعیش پسند بنا دیا تھا۔ معاشرے میں نسائیت اور بازاری عورتوں کا بول بالا تھا۔ تکلف و تصنع یہاں کی تہذیب کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس لیے لکھنوئ شاعری میں جذبات کی پاکیزگی اور سنجیدگی کے بجائے خارجی عناصر، معاملہ بندی اور جنسی لذت پرستی کے اوصاف زیادہ ہیں۔ لکھنوی شعراء کے جنسیت پرستی کے رجحان کی بدولت ہی صنفِ ریختی وجود میں آئی جن میں

عورتوں کے جذبات کو عورتوں کی زبان میں سطحیت کے ساتھ عکاسی کی جاتی ہے۔ خارجیت پسندی کی وجہ سے لکھنوی شعراء نے زبان کی تراش خراش اور صنعت گری پر زیادہ توجہ صرف کرنے کے ساتھ محبوب کے اعضاء اور اس کے سامانِ آرائش و زیبائش کا مزے لے لے کر بیان کرنے کو اپنا محبوب مشغلہ قرار دیا۔ لکھنوی شعراء نے شعوری طور پر اپنی شاعری کو دہلوی شاعری سے علحیدہ کرنے کی کوشش کی۔ مصحفیؔ، جرأتؔ، رنگینؔ جو لکھنویت کے بُنیاد گذاروں میں سے ہیں در حقیقت دھلوی شعراء ہیں لیکن ان کی شاعری کا اصل رنگ سرزمینِ لکھنؤ پر کھلا۔

جرأتؔ کی غزل میں جذبات نِگاری کے بجائے واقعہ نویسی اور معاملہ بندی ہے۔ جرأتؔ حسن و عشق کے خارجی معاملات کو موضوعِ سخن بناتے ہیں اس لیے ان کے یہاں بعض مقامات پر عریانی اور جنسی لطف اندوزی کے عناصر پائے جاتے ہیں جو بعض اوقات فحش اور پھکڑ پن کی منزل میں پہنچ جاتے ہیں۔ درحقیقت جرأتؔ کی غزل حسیات اور عسیات کی شاعری ہے۔ ان کا عشق سیدھا سادھا ہے جس میں کوئی فلسفیانہ رنگ نہیں ہے۔ جرأتؔ نے غزل میں ذاتی تجربات و احساسات کو داخل کر کے غزل میں مضمون آفرینی کے عنصر کو کم کیا ؎

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ ان کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

دے کے بوسہ مجھے چتون میں جتاتا ہے وہ شوخ
ایسا پایا ہے بھلا تونے مزہ اور کہیں

مصحفیؔ کی غزل کا بڑا حِصّہ ناکام آرزوؤں اور حسرتوں کا بیان ہے جس میں قلبی واردات کے بیان میں ایک اعتدال اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ مصحفیؔ کے یہاں سوز و گداز اور لہجے کا دھیما پن بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن مصحفیؔ کسی ایک میں بند نہیں ہیں چنانچہ ان کے یہاں معاملہ بندی، تصوف، اخلاق، خارجیت وغیرہ سب عوامل موجود ہیں ؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار　　اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
رہتے ہیں ساکنانِ قفس منتظر تیرے　　بادِ صبا اِدھر بھی گذرگاہ گاہ کر

انشاؔ کی غزل میں شوخی و ظرافت کا عنصر حاوی ہونے کے ساتھ سخت و ثقیل الفاظ کے استعمال سے سخت ناہمواری

ہو جاتی ہے لیکن کہیں کہیں سوز و گداز کی کیفیت بھی نمایاں ہے۔ انؔشا اور رنگینؔ کا نام اُردو غزل میں ریختی کے حوالے سے زیادہ مشہور ہے جس میں ہوس پرستی، جنسی فعل اور جنسی بدعنوانیوں کے ساتھ عورتوں کی رسوم وغیرہ کا انہی کی مخصوص زبان اور محاورہ میں بیان ہوتا ہے۔ رنگینؔ و انؔشا نے اودھ کی بیگماتی زبان کو بڑے سلیقے سے پیش کیا۔ عورتوں کی زبان جنوبی ہند میں ہاشمیؔ اور دُوسرے شعراء کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن ہاشمیؔ وغیرہ کی غزل کو ریختی نہیں کہا جاسکتا جس کی وجہ یہ ہے کہ ریختی کے عورتوں کی زبان کے ساتھ جنسی تلذذ اور سطحیت لازمی ہے جس سے شعرائے دکن کی غزل عاری ہے۔

13.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ شمالی ہند میں اردو غزل کے ارتقاء پر روشنی ڈالیئے۔

سوال نمبر 2:۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا ارتقاء ولیؔ دکنی کے دیوان کے پہنچنے کے بعد ہوا، وضاحت کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ شمالی ہند کی اردو غزل کی اہم خصوصیات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 4:۔ ایہام گوئی کے اہم غزل گو شعرا کا تعارف پیش کیجئے۔

13.5 امدادی کتب

1 اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، از گوپی چند نارنگ، مطبع، این سی پی یو ایل، نئی دہلی۔

2 غزل اور مطالعہ غزل، از ڈاکٹر عبادت بریلوی، مطبع، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

3 آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، از بشیر بدر، مطبع، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

4 اردو غزل میں علامت نگاری، از انیس اشفاق، مطبع، اترپردیش اردو اکادمی۔

5 غزل کا نیا علامتی نظام، از انیس اشفاق، مطبع، اترپردیس اردو اکادمی لکھنو۔

6 غزل کا منظرنامہ، از شمیم حنفی، مطبع، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

اکائی نمبر 14

دورِ متوسطین میں اُردو غزل

ساخت:

14.1 سبق کا تعارف

14.2 سبق کا ہدف

14.3 دورِ متوسطین میں اُردو غزل

14.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

14.5 امدادی کتب

14.1 سبق کا تعارف

۱۸ویں صدی کے اِختتام تک لکھنؤ میں اُردو شاعری اور اُردو غزل کا عام رواج ہو چکا تھا لیکن اس عہد تک بیشتر لکھنوی شعراء کا تعلق دہلی سے تھا۔ آتش و ناسخ کے ظہور پذیر ہونے کے بعد لکھنوی اسکول پوری قوت سے قائم ہوا اور دھلی و لکھنؤ کے درمیان واضح حد فاصل قائم ہوئی۔

14.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں دو متوسطین میں اردو غزل کا ایک تاریخی ارتقاء پیش کیا گیا ہے۔ دہلی اجڑنے کے بعد لکھنوء بسنے اور دہلی سے لکھنوء کی طرف شعراء نے رخ کیا۔ دہلی اور لکھنوء کے شعرا میں کس طرح کشمکش رہی کا بخوبی جائزہ اس کائی میں لیا گیا ہے جس کے مطالعے کے بعد طالب علم اس قابل بن جائیگا کہ وہ دہلی اور لکھنوء کی شاعری کا فرق سمجھ سکے۔

14.3 دورِ متوسطین میں اُردو غزل

اس عہد میں لکھنویت نہ صرف موضوع اور معنی تک محدود رہی بلکہ ناسخ کی اصلاح زبان کی تحریک نے دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں میں بھی فرق و اِمتیاز قائم کر دیا۔ حالانکہ ناسخ سے قبل مصحفی اور انشا کے یہاں بھی اصلاحِ زبان کی کوششیں پائی جاتی ہیں لیکن ناسخ کے عہد میں یہ کوششیں منظّم اور باضابطہ طور پر ہوئیں۔ ناسخ نے بدزبانی کے بجائے زبان کو تہذیب یافتہ بنانے پر زور دیتے ہوئے ہندی الفاظ کو ترک کر کے فارسی الفاظ کے استعمال پر زور دیا اور تذکیر و تانیث کے قاعدے متعین کیے۔ ساتھ ہی بندشِ مضمون کو فارسی طرز سے قریب کیا اور معنی کی سطح پر عاشقانہ مضامین کو غزل سے کم کر کے دُوسرے مضامین نظم کرنے پر توجہ دی۔ ناسخ نے قافیے اور عروض کے قاعدوں کو سختی کے ساتھ ملحوظ رکھنے پر زور دیا۔ ساتھ ہی تنافر، غرابت، تعقید، ذم کے پہلو سے اجتناب کرتے ہوئے لغت کے صحیح استعمال کو لازمی قرار دیا۔

ناسخ کی حیثیت ایک استادِ فن کی ہے۔ انھوں نے سماجی اور معاشرتی رُجحانات کے تحت زبان و شاعری میں جو اصلاحات کیں وہ کارہائے نمایاں ہیں۔ ناسخ کی غزل تمثیل نِگاری، صنعت گری اور منطقی استدلال کی خصوصیت سے متصف ہے۔ مضمون آفرینی اور خیال بندی ناسخ کا طرۂ امتیاز ہے اس لیے ان کی غزل میں جذبہ و احساس اور قلبی واردات کی کمی ہے لیکن جدت طرازی بدرجۂ اتم ہے ؎

چھوڑ کر اپنی تعلّی کر تو اضع اِختیار　　　رتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم محراب سے

....

مجھ کو جرمِ مے کشی میں جب کیا حاکم نے قتل
جسم بے سر خم، سر بے جسم ساغر ہو گیا

آتش نے اُردو غزل کو ایک نئی لے اور نئے اسلُوب سے آشنا کیا اور حسن کو پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما کیا۔ آتش کے یہاں حسن کا ایسا شوخ اور رنگین احساس ہے جو عشقیہ شاعری میں ایک اضافہ ہے۔ آتش کے یہاں عشق آزار نہیں بلکہ سرمستی و سرشاری کا ذریعہ ہے جو بانکپن، طرحداری اور زندگی کی حرارت و قوت سے لبریز ہے۔ بقول خلیل

الرحمٰن اعظمی ''اُردو غزل کی تاریخ میں آتش پہلا شاعر ہے جس کے یہاں زندگی کے بارے میں ہم اثباتی نقطۂ نظر پاتے ہیں اور بجائے یاس و نا اُمیدی......بھرپور امید اور رجائی کا انداز ملتا ہے۔''

حسن و جمال سے ہے زمانے میں روشنی　　　شبِ ماہتاب کی ہے تو دن آفتاب کا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہترے　　　ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

اس عہد میں بزمِ دھلی کے روحِ رواں شاہ نصیؔر، ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ تھے۔ یہ تمام شعراء لکھنویت خصوصاً ناسخؔ کے خیال بند اور استعارہ بند انداز سے متاثر ہوئے۔ شاہ نصیؔر اور ذوقؔ کے یہاں ناسخؔ کا رنگ زیادہ ہے البتہ مومن و غالب کے یہاں اس کی مثالیں کم ہیں۔ عبدالسلام ندوی کے بقول شاہ نصیر دھلی کے ناسخ ہیں۔ شاہ نصیؔر کی غزل میں تمثیلی اور استدلالی انداز حاوی ہے۔ ان کی اخلاقی شاعری میں بھی دعوی اور دلیل کا رنگ حاوی ہے۔ شاہ نصیؔر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہیں اور مشکل ترین ردیف وقوافی کو خوب صورتی کے ساتھ نباہنے کی کوشش کی۔ سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کو رواج دینے میں مصحفؔی اور انشاؔ زیادہ پیش پیش رہے۔ لیکن نصیؔر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ذہنی شاعری میں جذبات و روحانیت کے عناصر کی چاشنی پیدا کی اس لیے نصیؔر کے یہاں انشاؔ سے زیادہ معنویت ہے۔

کیا کوئی سر بلند کرے دعویٰ عروج　　　سایہ ہے پائمال سدا کوہسار کا

ہم پھڑک کر توڑتے سارے قفس کی تیلیاں　　　پر نہ تھیں اے ہم صغیر واپنے بس کی تیلیاں

ذوقؔ کی غزل میں بھی مضمون آفرینی کا عنصر نمایاں ہے اور ردیف وقوافی کے سہارے نئے مضامین پیدا کرنے پر زور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے یہاں روحانی اور زندگی کے محاکاتی پہلو بھی نمایاں ہیں۔ ذوقؔ کے یہاں زبان کی صفائی و سادگی اور محاورات کا برمحل استعمال ہے۔ انھوں نے سنگلاخ زمینوں میں پُر معنی اشعار کہے جن میں تصوف اور اخلاقیات کے موضوعات شامل ہیں۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے　　　اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

زندخرابِ حال کو زاہد نہ چھیڑ تو   تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

مومنؔ کی غزل بُنیادی طور پر حسن وعشق اور عشقِ مجازی کی حامل ہے جس میں اِنسانیت اور خودداری کے ساتھ پاکیزگی اور طہارت کا عنصر شامل ہے۔ مومنؔ کا کلام سستی جذباتیت اور جنس زدگی سے پاک ہے۔ وہ معشوق سے برابری کے برتاؤ کے قائل ہیں۔ مومنؔ کے یہاں نازک خیالی اور پیچیدہ بیانی ہے۔ وہ ہر بات کو گھما کر کہنے کے عادی ہیں۔ مومنؔ کی یہی طرزِ ادا اور بیان کی نُدرت اُن کے اسلُوب کی بُنیادی شناخت ہے۔

پوچھنا حال یار ہے منظور   میں نے ناصح کا مدعا جانا

آئے غزال چشم سدا میرے دام میں   صیاد ہی رہا میں گرفتار کم ہوا

غالبؔ کی غزل کلاسیکی شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔ یعنی غزل کی وہ روایت جو ولیؔ، سوداؔ، میرؔ، دردؔ کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی غالبؔ کی غزل میں اپنی مثالی ہئیت کی تکمیل کر لیتی ہے۔ غالبؔ کی غزل میں خیال اور جذبہ ایک دُوسرے سے ہم آہنگ ہیں جب کہ ان سے قبل کے شعراء کے یہاں کوئی ایک عنصر حاوی ہے۔ مثلاً سوداؔ و ناسخؔ خیال پسند ہیں جب کہ میرؔ و آتشؔ کے یہاں جذبہ پسندی زیادہ ہے۔ غالبؔ کی غزل میں جنس و جذبہ، فکر و فلسفہ سب کے ایک دُوسرے میں حل ہو کر اِنسان اور اِنسانی رِشتوں کی ان تمام پیچیدگیوں کو نمایاں کرتے ہیں جن سے زندگی عبارت ہے۔ غالبؔ کی غزل میں مثالی اور نقلی دُنیا کی تمام قدریں علویت کی اِنتہا پر ہیں۔ اس کے ساتھ غالب کے اندازِ بیان میں تہ داری، معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کی صفات بھی انتہائے کمال پر ہیں۔ غالبؔ بھی ناسخؔ کی طرح خیال بندی اور نازک خیالی کے دلدادہ ہیں۔ لیکن غالبؔ و ناسخؔ میں فرق یہ ہے کہ ناسخؔ کا خیال، خیال ہی رہتا ہے جب کہ غالبؔ کے خیال میں زندگی کی معنویت پورے طور پر نُمایاں ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے غالبؔ کی غزل کلاسیکی غزل کا نقطۂ عروج ہے جس کے بعد اس روایت میں مزید کچھ اضافہ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر   جلتا ہوں اپنی طاقتِ گفتار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

دورِ متاخرین:

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دھلی اور لکھنؤ کی باقی ماندہ محفلیں اُجڑ گئیں اور ادباء وشعراء ایک بار پھر جائے امان کی تلاش میں مختلف ریاستوں کی طرف سرگرمِ سفر ہوئے جن میں ریاست رامپور کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ریاست رامپور میں نواب یوسف علی خاں ناظم شاگرد غالبؔ اور نواب کلب علی خان نوابؔ کی قدر دانیوں کی وجہ سے دھلی اور لکھنؤ کے بہت سے استاد شعرا جمع ہو گئے جن میں داغؔ، امیر مینائیؔ، منیر شکوہ آبادی، جلالؔ لکھنوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ریاست رامپور میں دھلوی اور لکھنوی خصوصیات کے اِمتزاج اور دبنگ روہیلہ لہجے نے اُردو غزل میں ایک نئی لے اور آواز کو پیدا کیا۔ دبستانِ رامپور کی شاعری میں نہ دہلی کا سا سوز وگداز ہے اور نہ ہی لکھنو کی طرح خارجیت اور صنعت گری ہے بلکہ ان دونوں خصوصیات کا متوازن اِمتزاج ہے۔ دورِ متاخر میں میرؔ اور سوداؔ کے ساتھ میر سوزؔ کا رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اس دور میں غزل کی روایت میں اِضافہ کرنے کے بجائے روایت کے خوب صورت اِلتزام پر زور دیا گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ غالبؔ نے کلاسیکی غزل کے تمام امکانات کا احاطہ کر لیا تھا۔ اب سوائے لہجے کی تراش خراش کے کوئی دُوسرا کام باقی نہ تھا۔ داغؔ اور امیرؔ متاخر دور کے نمائندہ غزل گو ہیں۔

داغؔ کی غزل میں اِنسانی خواہشات اور جذبات کی عکاسی ہے۔ داغؔ کے یہاں عشق کا تصور ماورائی نہیں بلکہ ارضی ہے اس لیے ان کے یہاں معاملہ بندی اپنے پورے شباب پر نظر آتی ہے۔ مگر داغؔ کی معاملہ بندی میں جرأت کی طرح ابتذال نہیں بلکہ شوخی، شرارت اور شگفتگی ہے۔ بے ساختگی اور زبان کی سادگی و پُرکاری میں داغؔ اپنی مثال آپ ہیں۔ داغؔ کی غزل پر غالبؔ اور مومنؔ کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ داغؔ سیّد شاہ نظام رامپوری سے متاثر ہیں۔ نظام کی غزل معاملہ بندی اور ادا بندی کا مثالی نمونہ ہے۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ — دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

اندازا اپنے دیکھتے ہیں آئینے میں وہ — اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

(نظامؔ)

کیسا نظاره، کس کا اِشاره، کہاں کی بات　　سب کچھ ہے اور کچھ نہیں نیچی نِگاہ میں

ہاں ہاں تڑپ تڑپ کے گزاری تمھیں نے رات　　تم نے ہی اِنتظار کیا، ہم نے کیا کیا

(داغؔ)

امیؔر مینائی کی غزل میں زبان و بیان میں نکھار اور ستھرا پن ہے۔ امیؔر کے یہاں غزل کی مروجّہ علامتوں میں اخلاقی اور متصوفانہ مضامین بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ناسخؔ کی خیال بندی کا عنصر بھی ہے۔

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ　　مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

پھنسی جو دام میں بُلبُل تو کن نِگاہوں سے

کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا

بیسویں صدی میں داغؔ و امیؔر مینائی کے بعد غزل کی کلاسیکی روایت کے تسلسل کو برقرار رکھنے والے شعراء میں ریاضؔ، شادؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ، یگانہؔ اور فراقؔ کے نام اہم ہیں۔

حسرتؔ کی غزل میں عشق کی واقعیت پر بہت زور ہے۔ وہ حسن کے حقیقت پسندانہ اِظہار کے ساتھ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ حسرتؔ کی غزل کا تعلق جسم اور جنس سے ہے لیکن یہ حسرتؔ کا فن کہ اس میں ابتذال اور سطحیت کی ذرّہ برابر رمق نہیں پائی جاتی۔

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبع نازک پر

نِگاہِ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خودبخود

رنگینیوں میں ڈوب گیا پیراہن تمام

اصغرؔ کی غزل میں تصوف اور فلسفے کو دخل ہے لیکن اس سے مفکرانہ یکسوئی نہیں۔ اصغرؔ کے اندازِ بیان میں بے اِنتہا دل کشی و رعنائی ہے۔ یہی دل کشی و رعنائی ان کی غزلوں کا طرۂ اِمتیاز ہے۔

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے　　فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

فانیؔ کی غزل کا اِمتیاز الم پسندی اور یاسیت ہے۔ اس کے ساتھ ہی فانی کے یہاں تصوف اور حیات و کائنات

کے مسائل کی بھی عکاسی ہے۔ فانؔی کی غزل میں میرؔ کا سوز و گداز اور غالبؔ کی فکری اور فلسفیانہ گہرائی ہے۔ فانؔی کے لہجے میں مجبوری و بے چارگی کا عنصر حاوی ہے۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

زندگی نام ہے مرمر کے جئے جانے کا ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّت فانی

جگؔر کی غزل میں کیف و سرمستی اور رنگینی و رعنائی اور ایک والہانہ پن ہے۔ جذبات میں تیزی اور بے خودی و سرشاری ہے۔ اس لیے جگر کی شاعری میں نہ کوئی گہری سوچ ہے اور نہ ہی بے چارگی اور نا اُمیدی ہے۔ بلکہ ایک پُر کیف فضا ہے۔

دل بھی کچھ اس طرح تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا کام آخر جذبۂ بے اِختیار آ ہی گیا

14.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ دور متوسطین کے شعراء کا تعارف پیش کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ عہد لکھنوء کی اردو غزل کی اہم خصوصیات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ لکھنوء اور دہلی کی شاعری کا فرق واضح کیجئے۔

سوال نمبر 4:۔ دبستان لکھنوء کے نمائندہ شعراء کی خصویات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 5:۔ دبستان لکھنوء اور دبستان دہلی کی ادبی کشمکش پر بحث کیجئے

14.5 امدادی کتب

1 اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، از گوپی چند نارنگ، مطبع، این سی پی یو ایل، نئی دہلی۔

2 غزل اور مطالعہ غزل، از ڈاکٹر عبادت بریلوی، مطبع، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

3 آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، از بشیر بدر، مطبع، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

اکائی نمبر 15

دورِ جدید میں اُردو غزل

ساخت:

15.1 سبق کا تعارف

15.2 سبق کا ہدف

15.3 دورِ جدید میں اُردو غزل

15.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

15.5 امدادی کتب

15.1 سبق کا تعارف

ایسے تو ہر غزل اپنے سے پیشتر کے مقابلہ میں جدید ہے، مگر یہاں فکری اعتبار سے جدت مراد ہے، جسے ماہرین فن نے جدید غزل کے نام سے موسوم کیا ہے، اس کی ابتدا غالبؔ کے دور میں ہی ہو چکی تھی ؛ مگر باضابطہ اس تحریک کا آغاز حالیؔ کی کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' کے منظر عام پر آنے کے بعد ہوتا ہے، غزل کے اندر اصلاحی مضامین اور نت نئے افکار داخل کرنے کی حالیؔ کی کوشش نے کامیابی کی طرف قدم بڑھایا اور شادؔ عظیم آبادی، جلال لکھنویؔ، ثاقبؔ، عزیزؔ اور چکبستؔ وغیرہ نے اس کا نقش اول تیار کیا اور حسرتؔ موہانی، اصغرؔ، فانیؔ، جگرؔ، یگانہؔ، اور فراقؔ وغیرہ نے اپنے بلند و بالا افکار و خیالات اور نئے احساسات وجذبات سے نہ صرف یہ کہ غزل کو سرسبز و شاداب کیا بلکہ اس روایت کی تجدید و توسیع کی جس کی ابتدا حالیؔ نے کی تھی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فکری عناصر کیا تھے جن کی وجہ سے غزل کی دنیا میں اتنا

بڑاانقلاب آیااور وہ جدت وندرت سے ہمکنار ہوئی،تو اس کا آسان سا ایک جواب دیا جا سکتا ہے کہ زمانہ اور ماحول کا ادب پر ضرور اثر ہوتا ہے، وہ زمانہ ایسا تھا جب جب ملک افراتفری کا شکار تھا، سماجی، سیاسی، معاشی اور ادبی ہر سطح پر تبدیلیاں ہورہی تھیں، مغربی اثرات بہت تیزی سے ہندوستان کے تہذیب وتمدن کو اپنی آماجگاہ بنارہے تھے، اس کا اثر غزل پر پرنا لازمی تھا لہذا حالیؔ نے بھی غزل کی قدیم روایات کو توڑنے اور نیا باب قائم کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے اور غزل میں بھی عشق وعاشقی کے مضامین کے علاوہ فلسفیانہ خیالات وافکار اور حیات وکائنات کے مسائل شامل ہونے لگے، جن شعرانے غزل کو نئی جہات عطا کیں ان میں اہم نام شادؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ، یگانہؔ، مجروحؔ، فراقؔ اور فیضؔ وغیرہ کے ہیں۔

15.2 سبق کا ہدف

اس اکائی میں جدید غزل کو شامل کیا گیا ہے۔ ادب اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا جس سے کوئی دورائے نہیں ہے اور زمانے کے ساتھ ساتھ ادب نے بھی کروٹ بدلی ہے۔ ادب چونکہ محرک ہے جامد نہیں ہے اس لئے زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا اور زمانے کے اثرات کو قبول کرنا، اپنے دامن میں سمولینا ادب کی فطرت میں شامل ہے۔ اس اکائی میں جدید غزل کا دور کہاں اور کس عہد سے شروع ہوتا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلباء غزل میں تبدیلی کی پس منظر کو باآسانی سے سمجھ سکیں گے۔

15.3 دورِ جدید میں اُردو غزل

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندستان زبردست سیاسی وسماجی تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔ اس عہد میں صدیوں پرانی مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور ہندستان پر انگریز پوری طرح غلبہ حاصل کر چکے تھے جس کے نتیجے میں ہندستانی تہذیب ومعاشرہ مغربی تہذیب کی یلغار سے متاثر ہونے لگا اور صنعتی ومہاجنی تہذیب کا دور دورہ شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شامل مسلمان جاگیرداروں کو انگریزوں نے کچل کر اپنے ایک وفادار جاگیردار طبقے کو فروغ

دیا۔ان حالات میں مسلمان اور انگریز دونوں ایک دُوسرے سے چوکنے تھے۔۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام نے قومی جذبے کو سیاسی رنگ دیا جس کے ازالے کے لیے انگریزوں نے مذہبی تفریق کو ہوا دی اور مذہب کے نام پر علحیدہ علحیدہ منظّم ہونے کا موقع فراہم کر کے رجعت پسندی کو فروغ دیا۔اس عہد میں ہندستانی عوام کا ذہن کئی خانوں میں بٹا ہوا تھا۔ایک طبقہ پرانی روایات اور اقدار کا امین تھا تو دُوسرا طبقہ نئی زندگی اور نئے تجربات کو خیر مقدم کہہ رہا تھا۔یہ طبقہ ذلت وپستی سے باہر نکلنے کے لیے انگریزوں سے مصالحت اور ان کو سرپرست ماننے کو تیار تھا جس کے نتیجے میں مغربی تعلیم وتہذیب ہندستانی ثقافت پر اثر انداز ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصے میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا۔سر سیّد احمد خاں نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا اور مسلمانوں کو جدید تعلیم وتربیت پر زور دیا تا کہ مسلم قوم عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔علی گڑھ تحریک کے تحت زندگی کے دُوسرے شعبوں کی طرح شعر وادب میں بھی روایتی طرزِ فکر اور اسلوب سے گریز کرتے ہوئے نئے تجربات ومسائل اور اصلاحی مقاصد کے اظہار پر زور دیا گیا۔حاؔلی نے موجودہ غزل کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کو محسوس کیا کہ بدلتے ہوئے سیاسی وسماجی ڈھانچہ میں غزل کی اصلاح ضروری ہے۔حاؔلی نے غزل میں رسمی خیالات وتصورات کے اظہار کے بجائے ذاتی اور فطری تجربات وواقعات کو لازمی ٹھہرایا جس سے غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوگئی۔حالی نے فارسی شعراء کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سعدی، رومی کا عشق مجازی نہیں بلکہ حقیقی تھا۔لیکن تقلیدانہ غزل بھانڈے پن سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔حاؔلی نے غزل کے مخاطب کو نشانہ بناتے ہوئے یہ باور کرایا کہ مرد کا محبوب مرد کو قرار دینا نالائق دستور ہے۔اس کے ساتھ ہی غزل میں عورتوں کی خصوصیات اور ان کے لوازمات کو بیان کرنا بھی قبیح ہے۔غزل میں زہاد اور واعظیں پر غیر ضروری لعن و طعن کو بھی حاؔلی نے ہدف بنایا۔غرض یہ کہ حاؔلی نے اُردو غزل کو سیاسی اور سماجی مسائل کی عکاسی کے ساتھ بیداریٔ قوم کے لیے ایک آلہ کار قرار دیا۔حاؔلی اور سرسیّد کی اصلاحی تحریک کے نتیجے میں انیسویں صدی کے ربع آخر میں اُردو غزل میں دو رنگ صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔پہلا رنگ روایتی رنگ ہے جس میں جذباتی اور جنسی پہلو حاوی ہے۔داؔغ و امیؔر اس رنگ کے اساتذہ ہیں۔دُوسرے رنگ میں تعقل پسندی، استدلال اور افادیت ہے۔اس رنگ کے نمایاں شعراء میں حاؔلی، اقباؔل، چکبسؔت اور اکبؔر ہیں۔موخر الذکر رنگ ہی جدید غزل کا طرۂ اِمتیاز ہے جس نے بیسویں صدی میں دُوسری بڑی تحریکوں کے لیے راہیں ہموار کیں۔بیسویں صدی کی اِبتدا میں قومی آزادی کی تحریک تیز ہوئی اور پہلی جنگِ

عظیم کے بعد کے مسائل سے ہندستان دوچار رہوا۔اس لیے قومی وملکی موضوعات ادب وشعر کے لیے ناگزیر ہو گئے۔ غزل میں فطری اور سادہ جذبات واحساسات کے ساتھ حیات وکائنات کے خاص فلسفے کو موضوعِ سخن بنایا گیا۔یہاں تک کہ حسن وعشق کو بھی فلسفیانہ بُنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی۔انیسویں صدی کے مقابلے میں بیسویں صدی زیادہ پیچیدہ تھی۔ اس صدی میں زندگی کا ہر شعبہ میں تغیر وتبدل پیدا ہوا۔مغربی تعلیم،سائنسی ایجادات،صنعت وحرفت کی ترقیات سے حیات و کائنات کے روایتی فلسفے اور زندگی کی اقدار میں کافی تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور آزادئ ہند،انگریزوں کی مخالفت،رجعت پسندی،ترقی پسندی،سائنس،مذہب وغیرہ غرض کہ سینکڑوں مسائل اور کشمکشوں کے درمیان ذہنِ انسانی پھنس گیا۔جدید اُردو شاعری خصوصاً غزل میں اِن تمام امور کی بہترین عکاسی ہے۔

حالؔی کی غزل میں مروجہ عشقیہ شاعری سے انحراف کرتے ہوئے انفرادیت کے بجائے اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل کی عکاسی ہے۔حالؔی کے یہاں حسن وعشق کے نازک جذبات کے ساتھ قومی،سیاسی اور تہذیبی معاملات بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں لیکن حالؔی کی غزل حد درجہ اصلاحیت اور مقصدیت حاوی ہونے کی وجہ سے ان کے یہاں سپاٹ پن اور بے کیفی کی صورت پائی جاتی ہے۔حالؔی سرسیّد کے اتباع میں مسلمانوں کے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں اور مسلمانوں کی ترقی وعروج کے لیے مغرب کی پیروی کو ضروری سمجھتے ہیں۔اس لیے حالؔی کے نظریات اور ان کے شعری رویوں پر مغرب کے اثرات زیادہ حاوی ہیں۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا	ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے
خود بڑا بن کر دِکھاؤ آپ کو	باپ دادا کی بڑائی ہو چکی
فرشتوں سے بہتر ہے اِنسان بننا	مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اکبؔر نے بھی حالی کی طرح غزل کو اصلاح کا ذریعہ بنایا۔لیکن حالؔی اور اکبؔر میں فرق یہ ہے کہ حالؔی مغربی فکر و اسلُوب کے دلدادہ اور اس کے متبع تھے جب کہ اکبؔر مغربی فکر واسلُوب کے سخت مخالف اور اس کے نکتہ چیں ہیں۔اکبؔر، شبلؔی کی طرح مشرقیت کے دلدادہ تھے۔وہ سرسیّد کے برخلاف اپنے اسلاف کے کارناموں،قدروں اور روایتوں پر زور دیتے ہیں اور اس کے تحفظ کے لیے کوشاں ہیں جس کی وجہ یہ ہے مشرق میں مغرب کے مقابلے مذہبی اور اخلاقی اوصاف زیادہ ہیں۔اکبؔر کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ مغربی اثرات سے مشرقی روحانی مزاج تباہ نہ ہو جائے۔اس لیے علی گڑھ میں

جب مغربی علوم وفنون کی ترویج وترقی پر زور دیا گیا تو اکبؔر کے ذہن میں کئی طرح کے اندیشے اور خدشات اُبھرنے لگے۔ ان کی نظر میں رہنمایانِ قوم نا قابلِ بھروسہ اور نا قابلِ اعتماد ہیں۔ اکبؔر ایک طرف مشرقیت کے از حد دلدادہ ہیں تو دُوسری طرف کٹھ ملائیت اور روایت پرستی کے مخالف بھی ہیں۔ اکبؔر نے اپنے عہد کے سیاسی وسماجی تصورات وخیالات اور حالات کو طنز ومزاح کے ساتھ میں ادا کیا۔ یہاں تک کہ بعض بہت ہی سنجیدہ باتیں بھی طنز ومزاح کی چاشنی کے ساتھ کہیں۔ اکبؔر کی غزل میں انگلش کے بہت سے الفاظ شامل ہیں جیسے کلورو فارم، آفیشل لیکچر وغیرہ۔ بہ حیثیت مجموعی اکبؔر نے غزل کی لفظیات میں زبردست اِضافہ کیا۔

دنیا ہی اب درست ہے قائم نہ دین ہے
زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے
وہ اک نِگاہ جو رکھتی ہے مست رندوں کو
غضب ہے یہ کہ بڑی محتسب بھی ہوتی ہے

چکبستؔ کی غزل میں وطن پرستی اور جدوجہدِ آزادی کی لے صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہ مناظرِ فطرت کے ذریعے وطنیت کے جذبات بھی اُبھارتے ہیں اور وطن کے ہر ذرہ میں حسن کا بھی نظارہ کرتے ہیں۔ چکبستؔ کے عہد تک ہندستانیوں کے دلوں میں آزادی کی خواہش نمو پا چکی تھی لیکن مکمل آزادی کا مطالبہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا اس لیے چکبستؔ کے یہاں بھی مکمل آزادی سے زیادہ ہوم رول پر زور ہے۔ چکبستؔ نے اپنی غزل کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور جدوجہدِ آزادی میں دونوں قوموں کے اتحاد کو لازمی قرار دیا۔ بہ حیثیت مجموعی چکبستؔ کی غزل میں اپنے عہد کی فکر وعمل کی بھرپور ترجمانی ہے۔ انھوں نے غزل کے روایتی مضامین کو نئے معنی میں استعمال کر کے اُردو غزل کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں اہم کردار ادا کیا۔

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ مری — کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے
ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے — نکلے ہیں لوٹنے چمنِ روزگار کو
قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے — طرزِ ہندو دیکھ کر، رنگِ مسلماں دیکھ کر

اس دور کے سب سے اہم غزل گو اقبالؔ ہیں۔ اقبالؔ نے روایت سے اپنا رِشتہ برقرار رکھتے ہوئے غزل میں

نئ معنوی جہات کی تلاش کی اور غزل کو وسعت اور بُلندی کے ساتھ تازگی اور جدت سے ہمکنار کیا۔ اقبالؔ کی غزل موضوعات کے لحاظ سے بھی وسیع ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی۔ زبان و بیان کے ذیل میں اقبالؔ غالبؔ کے شاگردِ معنوی ہیں۔ اقبالؔ نے غالبؔ کی زبان کو اپنے مربوط فلسفے اور فکر کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور غزل میں نئ توانائی پیدا کی۔ اقبالؔ کی غزل میں فکر و فلسفے کی شمولیت سے وارداتِ قلبی سے زیادہ امور ذہنیہ کا عکس ہے جو دِلوں کو گرمانے اور اجتماعی زندگی میں قوت و توانائی پیدا کرنے کا کام کرتی ہے۔ اقبالؔ کے فلسفے میں حرکت و عمل، جہدِ مسلسل اور قوت و توانائی کو خاص اہمیت حاصل ہے اس لیے حالؔی نے جس غزل کی اِبتدا کی تھی اقبالؔ کی غزل اسی اصلاحی مقصد کو پوری شاعرانہ قوت کے ساتھ بروئے کار لاتی ہے جس سے حالؔی محروم تھے۔ اقبالؔ کی غزل اور اس کے نظامِ فکر میں مذہب، سیاست اور معاشرت، تینوں ایک ہی شے کے مختلف پہلو ہیں اس لیے سیاست و معاشرت کے لیے مذہبی بُنیادیں ضروری ہیں۔ لیکن اقبالؔ کھُوکھلی مذہبیت کے بھی قائل نہیں۔ اس معاملے میں وہ اہلِ تصوف کے ساتھ ہین لیکن اہلِ تصوف سے اس لیے مختلف ہیں کہ ان کے یہاں قلب اور وجدان ہی وجدان ہے، عقل کی بالکل نفی ہے جب کہ اقبالؔ کے نظامِ فکر میں عقل و وجدان ایک دُوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ وجدان کے بغیر عقل اور عقل کے بغیر وجدان صحیح علم حاصل نہیں کر سکتے۔ اقبالؔ کی غزل مشرق و مغرب کے بہت سے فلاسفر کے نظریات کی عکاسی ہے جن سے زندگی اور اس کے رموز کو سمجھنے میں بڑی مدد حاصل ہوتی ہے۔ دراصل اقبالؔ کی فکر اسلامی فکری نظام کا ایک حِصّہ ہے اس لیے اقبالؔ نے ان تمام غیر اسلامی نظریات سے استفادہ کیا ہے جن کی روح اسلامی ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو   جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید   کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

مولانا محمد علی جوہرؔ کی غزل میں وطنیت اور انگریزوں سے نفرت کا احساس نمایاں ہے۔ جوہرؔ نے واقعہِ کربلا کو استعارہ بنا کر اپنے عہد کی زندگی اور سیاسی حالات کا بہترین اظہار کیا ہے۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد   ہے اِبتدا ہماری تری اِنتہا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے   اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

برطانوی سامراج کی بربریت اور سخت گیریوں کے باعث، سیاسی، سماجی اور

اقتصادی حالات کے پیشِ نظر ہندستان میں قومی بیداری کی بہت سی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ انہی تحریکوں میں ۱۹۳۵ء میں دُوسری زبانوں کے ساتھ اُردو زبان وادب میں بھی ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ جس میں مارکسی نظریات کے تحت جاگیردارانہ نظام اور غیر مساویانہ تقسیمِ دولت کے خلاف آواز بُلند کی گئی اور اشترا کی سماج کے خواب کو مستحکم کیا گیا۔ ترقی پسند غزل میں اجتماعی زندگی پر زور دینے کے ساتھ غریبوں اور مزدوروں کے استحصال کے خلاف بغاوت کا اِظہار ہے۔ فیض احمد فیضؔ، مخدوم محی الدین، مجروحؔ سلطانپوری، حبیب جالبؔ وغیرہ اہم ترقی پسند غزل گوشعراء ہیں۔

۱۹۶۰ء کے قریب اُردو میں جدیدیت کے رُجحان کا آغاز ہوا جس کے تحت ترقی پسندوں کے اِنفرادیت اور سماجی حد بندیوں سے آزادی پر زور دیا گیا۔ فرار، یاس و نا اُمیدی، اجنبیت وغیرہ جدید غزل کی اہم خصوصیات ہیں۔ شہریارؔ، بشیر بدرؔ، ظفر اقبالؔ، منیرؔ نیازی وغیرہ اہم جدید غزل گو ہیں۔

15.4 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ دورِ جدید کے شعراء کا تعارف پیش کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ جدید اردو غزل کی اہم خصوصیات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ جدید اور قدیم غزل کا فرق واضح کیجئے۔

سوال نمبر 4:۔ جدید غزل کے نمائندہ شعراء کی خصویات بیان کیجئے۔

15.5 امدادی کتب

1 اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، از گوپی چند نارنگ، مطبع، این سی پی یو ایل، نئی دہلی۔

2 غزل اور مطالعہ غزل، از ڈاکٹر عبادت بریلوی، مطبع، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

3 آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، از بشیر بدر، مطبع، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

4 اردو غزل میں علامت نگاری، از انیس اشفاق، مطبع، اتر پردیش اردو اکادمی۔

5 غزل کا نیا علامتی نظام، از انیس اشفاق، مطبع، اتر پردیس اردو اکادمی لکھنو۔

6 غزل کا منظر نامہ، از شمیم حنفی، مطبع، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

ASSIGNMENT QUESTIONS:

M.A. Urdu	Semester-I
Course No: Urd-101	M.Marks: 20

نوٹ: مندرجہ ذیل سوالات میں سے کوئی دو سوالات کے جوابات لکھنا لازمی ہیں۔

سوال نمبر 1:۔ اردو غزل کا فن اور تاریخی ارتقاء پر سیر حاصل بحث کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ اردو غزل کا ارتقاء شمالی ہند، دکن اور لکھنوء کے حوالے سے قلم بند کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ جدید اردو غزل کا تعارف اور اہم جدید غزل گو شعرا کی خصوصیات بیان کیجئے۔

Course Contributores and Content Editing:

Prof. Sukh Chain Singh
Deptt. of Urdu, University of Jammu, Jammu

Content Editing: **Dr. Liaqat Ali**
Lecturer in Urdu. DDE, Jammu University.

© Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu 2018

* All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the DDE, University of Jammu.

* The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the DDE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed By :

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMU

SELF INSTRUCTION MATERIAL
M.A. URDU (SEMESTER FIRST)

COURSE NO: 101 (A STUDY OF URDU GHAZAL)
UNIT I-IV LESSON : 1-15

PROF. (DR.) SHOHAB INAYAT MALIK
COORDINATOR P.G. URDU

DR. LIAQAT ALI
INCHARGE TEACHER (URDU)

http:/www.distanceeducationju.in

(C) All copyright privileges of the material vest with the Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu-180006